عمر فاروق@ون اردو

خطبات حکیم الامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
کی مؤثر اور انقلاب آفریں تقریروں کا اہم مجموعہ



دعوت تبلیغ

دعوت الی اللہ
آداب تبلیغ
حق کی وصیت
صبر کی وصیت
تبلیغ کی ضرورت
اتباع علماء
آداب اصلاح
راہ حق پر گامزن رہنا

زمزم بک ڈپو دیوبند

ترتیب مواعظ

دعوت الی اللہ — وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

آداب تبلیغ — اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۝

حق کی وصیت — وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

صبر کی وصیت — وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

تبلیغ کی ضرورت — وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

اتباع علماء — وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

آداب اصلاح — قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا

راہ حق پر گامزن رہنا — اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

عمر فاروق@ون اردو

تفصیل

الدعوت الی اللہ

آداب تبلیغ

تواصی بالحق

حق کی وصیت

عمر فاروق@ون اردو

تواصی بالصبر

صبر کی وصیت

عمر فاروق@ون اردو

تبلیغ کی ضرورت

عمر فاروق@ون اردو

اتباعِ علماء

آدابِ اصلاح التبشیر

عمر فاروق@ون اردو

راہِ حق پر گامزن رہنما

الاستقامت

عمرفاروق@ون اردو

الدعوت الی اللہ

افسوس! دوسروں کو تو ہم اپنے مذہب میں کیا لاتے۔ اپنے ہی بھائیوں کو اپنے مذہب میں نہیں رکھ سکتے۔ خدانخواستہ اگر یہی نوبت رہی۔ تو آج تو نومسلموں پر مشق ہے۔ اگر مخالفین کا حوصلہ بڑھ گیا۔ تو کل وہ پرانے مسلمانوں کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کریں گے۔

از حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے الدعوت الی اللہ ۲۶ شعبان سنہ ۱۳۴۱ھ مقیم خانہ اسلامیہ کانپور میں کرسی پر بیٹھ کر ساڑھے تین گھنٹے تک ارشاد فرمایا۔

محترم احمد عبدالحلیم صاحب نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد ایک ہزار تھی



الدعوت الی اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

امابعد:۔

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ومن احسن

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ. وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

ضرورت بیان

یہ چند آیتیں ہیں سورہ حم سجدہ کی۔ ان میں حق سبحانہ و تعالیٰ نے ایک خاص عمل کی فضیلت مع ان کے تکملات و آداب کے ارشاد فرمائی ہے اور وہ خاص عمل کون سا ہے؟ وہ وہ ہے جس کا نام انہی آیات میں "دعوت الی اللہ" رکھا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ کے کیا معنی۔ یعنی حق تعالیٰ کی طرف بلانا۔ حق تعالیٰ کی طرف بلانے کا یہ مطلب کہ دین کی طرف بلانا ورنہ کوئی حق تعالیٰ کے سامنے لے جا کے تو کھڑا کرنے سے رہا تو یہ ہے وہ عمل جس کی فضیلت ان آیات میں ذکر کی گئی ہے۔

ہر چند یہ عمل ایسا نہیں ہے۔ جس کا نام آج نیا سنا ہو۔ یہ تو قرآن کا مدلول ہے اور قرآن کے مطالب و معانی آج سے نہیں۔ بلکہ تیرہ سو برس پہلے سے مشہور و معلوم ہیں۔ جو اہل علم ہیں، وہ تو خود ہی خوب جانتے ہیں اور جو غیر اہل علم ہیں۔ وہ بھی ضرورت کے درجہ تک اگرچہ خود نہ سہی تو سننے سنائے جانتے ہیں۔ بہر حال یہ ایسا عمل نہیں، جس کی فضیلت ذہنوں سے غائب ہو۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب سب اس مضمون کو جانتے ہیں۔ تو پھر تحصیل حاصل سے کیا فائدہ؟

لیکن اگر اپنا معاملہ اس کے ساتھ دیکھا جائے۔ تو یہ آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ ایسے ضروری مضمون کی طرف سے کس قدر بے توجہی اور لاپرواہی کی جا رہی ہے اور اسی لیئے ضرورت متوجہ کرنے کی ہوئی۔ اب تحصیل حاصل کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا اور بے توجہی ہمیشہ دو وجہ سے ہوتی ہے۔ یا تو اس کی ضرورت کا علم نہیں ہوتا۔ یا علم تو ہے، مگر عمل نہیں ہے۔ سو یہاں غایت سے غایت اگر کوئی کہہ سکتا ہے، تو یہ کہہ سکتا ہے کہ علم تو سب کو ہے۔ اس لیئے کہ کبھی نہ کبھی قرآن سب پڑھتے ہیں۔ اور قرآن ہی کا یہ مضمون ہے۔ تو میں کہتا ہوں، اول تو قرآن کے پڑھنے سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک درجہ کا علم ہے۔ گو اس علم میں بھی اہل علم و غیر اہل علم کے مدارج میں تفاوت ہوتا ہے۔ تو خیر یہ ضرورت نہ ہوگی۔ اس مضمون کی طرف متوجہ کرنے کی۔ مگر عمل کے متعلق جو اس مضمون کا حصہ ہے۔ وہ تو یقیناً بہت ہی قلیل اور ضعیف ہے بلکہ قریب قریب معدوم ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اپنی حالت کے دیکھنے سے معلوم ہو جاوے گا۔ تو اس لیئے تو متوجہ کرنا ضروری ہے اور متوجہ کرنے کا آسان ذریعہ بیان ہے۔ اس لیئے بیان کرنا بھی ضروری ہوا۔

دعوت میں کوتاہی

اب یہ بات رہ گئی۔ کہ حالت دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ عمل کا حصہ قلیل و معدوم ہے۔ سو ہر شخص اپنی حالت دیکھ لے کہ شب و روز میں کے منٹ اور کتنا وقت اس کام کے لیئے اس نے خاص کر رکھا ہے۔ یوں تو ہم میں عابدین بھی ہیں، زاہدین بھی ہیں۔ علماء بھی ہیں، طلباء بھی ہیں۔ غرض طرح طرح سے دین کی خدمتیں کی جا رہی ہیں اور ان کا اہتمام بھی ہے۔ مگر یہ دیکھ لیں۔ کہ جتنی دیر وظیفہ، تلاوت، ذکر و شغل اور تعلیم و تعلم، پڑھنے پڑھانے میں صرف کرتے ہیں اور کسب حلال میں جو بقصد ثواب عبادت ہے مشغول ہوتے ہیں۔ آیا اس وقت میں سے کوئی حصہ اس کام میں بھی صرف ہوتا ہے کہ دوسروں کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کریں۔ اب فرمایئے ایسے کتنے ہیں۔ جو اس کام کو کرتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مہینے کے مہینے خالی جاتے ہیں۔ جن میں ایک شخص کو بھی متوجہ الی اللہ نہیں کیا جاتا۔ یعنی اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ کہ کافر کو اسلام کی ترغیب دیں۔ ضعیف الاسلام کو تقویت اسلام کی ترغیب دیں اور جو متردد ہیں جن کے اسلام

عمر فاروق@ون اردو

سے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ ان کو اسلام پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دیں۔
یہ بے توجہی تو اصول کے اعتبار سے ہے۔

اب فروع کے اعتبار سے بھی دیکھیں۔ تو اس میں بھی وہ کوتاہی نظر آئے گی۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باب ہی مفقود ملے گا۔ امر بالمعروف۔ نیک کام کی ترغیب۔ نماز کی ترغیب۔ جن پر نماز فرض ہے۔ جن کے پاس بقدر نصاب مال ہے انہیں زکوٰۃ کی ترغیب۔ جن پر حج فرض ہے انہیں حج کی ترغیب دی ہو۔ یا جن کے اخلاق باطنی اچھے نہ ہوں۔ اسے تہذیب اخلاق کے طریقے بتاتے ہوں۔ کہ یہ سب دعوت الی اللہ ہی کے شعبے ہیں اور امر بالمعروف کے اقسام ہیں۔ یا کسی کو نہی عن المنکر کیا ہو۔ کسی مبتلائے معصیت کو معصیت سے روکا ہو۔ خواہ وہ صغیرہ ہو خواہ کبیرہ۔

طمع و خوف

روکنے کے تو کیا معنی؟ اگر کہیں طمع یا خوف ہو تو اور اس کی تقریر و تائید کرتے ہیں۔ کہیں دوستوں کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کہیں طمع و توقع کا خیال رہتا ہے۔ کہیں محسنوں کے احسان کا اثر ہوتا ہے۔ بہر حال طمع میں آدمی بہت ڈھیلا ہو جاتا ہے اور حالت بہت گر جاتی ہے۔ یہاں تک ذلت و پستی کو اختیار کر لیتا ہے کہ ایسے ایسے موقعوں تک نظر جاتی ہے۔ جہاں دوسروں کا خیال و وہم بھی نہیں پہنچ سکتا۔

چنانچہ ایک دوست ہیں کانپور کے اپنے ایک شناسا کی حکایت بیان کرتے تھے۔ کہ اتفاقاً انہوں نے اس کی ہمراہی میں سفر کیا۔ منزل پر پہنچ کر دونوں ایک سرائے میں مقیم ہوئے۔ کھانا کھانے بیٹھے، اتفاقاً ایک کتا آیا۔ انہوں نے اس کے دیکھتے ہی کہا۔ السلام علیکم۔ میں نے کہا یہ کیا؟ کہنے لگا کبھی جن شکل بدل لیتے ہیں۔ تو ممکن ہے، یہ جن ہو اور پھر یہ بھی احتمال ہے کہ جنوں کا بادشاہ ہو اور سلام سے خوش ہو کر ہم کو روپے دے جاوے۔ کیا اچھا حساب لگایا۔ بس جی اگر ایسے ہی احتمالات ہیں۔ تو

عمر فاروق@ون اردو

بلی کو بھی سلام کیا کرو، چوہے کو بھی سلام کیا کرو۔ یہاں تک کہ سُور کو بھی سلام کیا کرو۔ کیونکہ یہ احتمالات تو سب میں مشترک ہیں۔ مگر اپنی شدتِ طمع کی وجہ سے غریب کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ محققین نے لکھا ہے۔ کہ ہر جن کتے کی شکل میں نہیں ہوتا۔ ان میں بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معززین و امراء۔ یہ شیر، ہرن اور دوسرے ہیبت دار یا خوبصورت جانوروں کی شکل بدلتے ہیں۔ اور ایک ہوتے ہیں، فقیر، مفلس اور معمولی قسم کے۔ وہ کتے، بلی، چوہے وغیرہ کی شکل بدلتے ہیں۔ کیونکہ کتے کی عادت ہے۔ کہ یہاں کھڑا ہو گیا، وہاں کھڑا ہو گیا۔ تو یہ بھیک منگے اور کنگلے کے مشابہ ہے۔ اور تو اس قسم کے جن ہوتے ہیں۔ وہ اس کی شکل میں آتے ہیں۔ ورنہ جو امراء ہیں وہ کبھی ایسی رذیل اور ذلیل شکل میں دکھائی نہیں دیتے۔ بہرحال اس کا سلام تو ضائع گیا۔ کہ وہ سمجھا کہ یہ جنوں کا بادشاہ ہو گا۔ تو اسے طمع نے اتنا خراب کیا کہ اس نے کتے کو بھی اس لالچ سے سلام کیا کہ شاید روپے مل جاویں۔ تو یہ طمع ایسی بری چیز ہے۔

خیر یہ تو اس احمق نے نہایت منکر فعل کیا۔ خدانخواستہ کوئی اور ایسا تو کیوں کرنے لگا۔ مگر تاہم اس طمع کی وجہ سے ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔ جو کسی درجہ میں منکر ضرور ہوتے ہیں۔ اگر بظاہر وہ ناگوار معلوم نہ ہوں۔ چنانچہ عام طور پر یہ بلا پھیلی ہوئی ہے۔ کہ جہاں ذرا بھی توقع ہو، وہاں نہی عن المنکر سے اندیشہ ہوتا ہے اور وہم ہوتا ہے۔ کہ ایسا نہ ہو خفا ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ تم اپنی طرف سے ایسا طریقہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا نہ نکالو، جس سے کوئی خفا ہو جاوے۔ اور اگر تمہارے اچھے طریقے پر بھی کوئی خفا ہو جاوے۔ تو یہ اُس کا فعل ہے، تمہارا فعل نہیں ہے۔

طریقِ دعوت

اب وہ کون سا طریقہ ہے۔ جو اچھا طریقہ ہے۔ اس کے آداب خود حق تعالیٰ نے بیان فرما دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ

بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔

بلائیے اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ اور نرم نصیحت کے ساتھ اور مناظرہ کیجئے۔ ان لوگوں سے ایسے طریقہ پر جو اچھا ہو نرم نصیحت کے یہ معنی کہ عنوان اچھا ہو۔ اس میں دل آزاری نہ ہو، طعن و تحقیر نہ ہو۔

طریق مناظرہ

اسی طرح مناظرہ میں بھی یہ چیزیں نہایت ضروری ہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نمونہ دکھلا دیا۔ اور مناظرہ تو بڑی چیز ہے۔ کیونکہ اس میں دونوں طرف سے علمی ہی بحث ہوتی ہے اور دونوں طرف عالم ہوتے ہیں۔ اس میں جہل کی کیا گنجائش ؟ یہ امور تو ایسے واجب الرعایت ہیں۔ کہ اگر کسی جاہل سے بھی سابقہ پڑ جائے، تو اس کے جواب میں بھی جہالت کی ممانعت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

وَاِذَا خَاطَبَہُمُ الْجَاہِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔

"اور جب کہ خطاب کرتے ہیں ان سے جاہل، تو وہ کہتے ہیں سلام یعنی جاہلوں کی جہالت کا بھی جواب جہالت سے نہیں دیتے۔"

باقی یہ کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ جاہلوں کا یہ خطاب جہالت ہی کا ہو گا۔ سو یہاں کے وصف عنوانی سے یہ معلوم ہو گیا۔ کیونکہ خطاب کی صفت یا کیفیت نہیں بیان فرمائی بلکہ خطاب کرنے والوں کی صفت بتا دی۔ کہ وہ جاہل ہیں۔ یہ ظاہر ہے جب وہ جاہل ہیں تو خطاب بھی جاہلیت ہی کا ہو گا۔ تو یہاں جہالت کی بات کا جواب بھی قَالُوْا سَلَامًا ہے۔ یعنی جہالت کے طریق پر جواب نہیں دیتے۔

اسی طرح اور ایک مقام ہے۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ کفار کی گستاخیوں پر مسلمانوں کو بے حد غیظ و غضب آتا تھا۔ وہ نامعقول یہ کرتے تھے۔ کہ اپنے اشعار میں مسلمانوں کی بیویوں کا نام لے لے کر اظہار تعشق کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا گستاخی اور

موجب غیظ ہو گا؟ وہ اس حد سے بھی بڑھ کر اور بھی ایک گستاخی کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذمم کہتے تھے۔ (نعوذ باللہ) کیونکہ جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معنی بہت زیادہ محمود الاخلاق اور ستودہ صفات کے ہیں۔ اسی طرح مذمم کے معنی اس کے مقابلہ میں ہیں (نعوذ باللہ) خیال تو کیجئے کہ مسلمانوں کو کس قدر ناگوار ہوتا ہو گا۔ کہ جان لینے اور جان دینے کو تیار ہو جاتے ہوں گے۔ مگر اتنی بڑی گستاخی اور ایسے سخت موجب غیظ پر حق تعالیٰ کی تعلیم سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا. وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ. لتبلون الخ

یعنی جان اور مال میں تمہاری آزمائشیں ہوں گی۔ ولتسمعن الخ اور مشرکین اور اہل کتاب سے اذیت کی باتیں سنو گے۔

اس کی تفسیر میں مفسرین نے یہی واقعہ لکھا ہے کہ وہ اپنے اشعار میں مسلمانوں کی بیویوں کا نام لے کر اظہار تعشق کرتے تھے۔ اتنی بڑی غیظ و غضب کی بات سننے کے بعد فرماتے ہیں۔ اِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا الخ کہ اگر تم صبر کرو اور بچو (یعنی جہالت کی باتوں سے) تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:۔

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔

"میرے بندوں سے فرما دیجئے کہ وہ نرم بات کہا کریں"

إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ۔ شیطان درمیان میں جھڑپ کرانا چاہتا ہے۔ جب جھڑپ اور لڑائی ہو گی۔ تو اس کا انجام یہ ہو گا۔ کہ دونوں طرف سے عداوت بڑھ جاوے گی۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِينًا۔

عمر فاروق @ ون اردو

بے شک شیطان انسان کے لئے کھلا ہوا دشمن ہے۔ تو یہ تو قرآن مجید میں اب بتایا گیا۔

اب حدیث سنئے کہ سب سے بڑھ کر شرارت اور گستاخی کفار کی یہ تھی۔ کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مذمم سے بدل لیا تھا اور مذمم کی سخت ہجو کیا کرتے تھے۔ آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے۔ کہ ایسے سخت الفاظ سن کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ پھر مسلمان بھی ہمارے آپ کے سے نہیں، بلکہ اس وقت کے مسلمان۔ مگر قربان جایئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے ایسی سخت بات کو مسلمانوں کے دلوں سے کیسا ہلکا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

انظروا کیف صرف اللہ عنی شتم قریش۔

"یعنی دیکھو شتم قریش کو خدا نے مجھ سے کیسے ہٹا لیا"

یشتمون مذمماً ویلعنون مذمماً وانا محمدﷺ۔

کہ وہ شتم ولعنت کرتے ہیں مذمم پر اور میں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ تو خدا نے مجھے گستاخی سے کیسے بچا لیا۔ کیونکہ انہوں نے جو بُرائی کی وہ مذمم (یعنی بُرے آدمی کی بُرائی کی)، کی نام تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ آیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی حمد کئے گئے ہیں) ہیں جو مذمم ہو گا، وہ بُرا مانے گا۔ اگرچہ مذمم سے ارادہ ونیت تو اُن کمبختوں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی گستاخی کی تھی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے غیظ وغضب کو ہلکا کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ میاں یوں دل کو سمجھا لیا کرو۔ کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نام مبارک ہے ہی نہیں۔

بہر حال وہ حق تعالیٰ کی تعلیم تھی اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے جب جہل کے مقابلہ میں بھی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خشونت پسند نہیں۔ تو مناظرہ میں تو کب پسند ہوگی۔ اسی لئے ارشاد ہوا۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔ یعنی مجادلہ ایسے طریقہ پر کرو جو احسن ہو۔ اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ اُس کے

مقابلہ میں کرتی اور قوم نہ تہذیب کا دعوےٰ کر سکتی ہے اور نہ کوئی نمونہ پیش کر سکتی ہے۔ تو یہ تہذیب مانع ہے، اس سے کہ مناظرہ میں خشونت و دل آزاری کی باتیں ہوں۔ غرض نصیحت میں اپنی طرف سے سختی نہ کرے۔ باوجود اس کے اگر کوئی بُرا مانے تو مانا کرے۔ اپنے فعل کا تو انتظام ہو سکتا ہے کہ بُرا ماننے کا طرز نہ اختیار کرے مگر دوسرے کے فعل کی فکر و پروا نہ کرے۔

دعوت اور اندیشۂ اذیت

ہاں نہی عن المنکر میں اگر اندیشہ ہو۔ ایسی اذیت کا کہ جس اذیت کا یہ متحمل نہ ہو تو اس وقت نہی عن المنکر معاف ہے۔ اور جہاں ایسی اذیت نہیں۔ فقط یہ اندیشہ ہے کہ مخاطب بُرا مانے گا یا ہمارا مرتبہ اس کی نظر میں کم ہو جاوے گا یا ہمیں شاید کچھ دینے کا ارادہ رکھتا ہو تو نہ دے گا۔ یہ سب خیال فاسد ہیں۔ اس وجہ سے نہی عن المنکر معاف نہیں ہے۔ مگر اب تو یہ نوبت ہے۔ کہ محض اپنے حفظ جاہ و مال کے لیے نہی عن المنکر سے بچتے ہیں۔ اللہ کے بندے ایسے بھی تو ہوتے ہیں۔ کہ نہی عن المنکر یا امر بالمعروف میں اندیشہ تو کیا، مقاسات اذیت بھی ہو جاوے۔ تب بھی وہ باز نہیں آتے۔

چنانچہ حکایت ہے کہ ایک مقام پر جامع مسجد میں ایک تاجرِ عطر آیا جماعت کے بعد لوگ حسبِ معمول سنتیں پڑھنے لگے۔ اتفاق سے نمازیوں میں کوئی بڑے عہدہ دار بھی تھے۔ وہ سنتوں میں وہی رسمی اٹھک بیٹھک کرنے لگے۔ جس میں ارکان کی تعدیل نہ تھی۔ جب سلام پھیرا تو اس تاجر نے جو ایک غریب آدمی تھا۔ سامنے آکے سلام کیا اور عرض کیا۔ حضور آپ کی نماز ٹھیک نہیں ہوئی۔ اسے پھر دوبارہ پڑھ لیجئے۔ کیونکہ مجھے آپ کے وقت کا بڑا قلق ہے۔ کہ یونہی رائیگاں جا رہا ہے۔ اس نماز سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بس اتنا سننا تھا کہ مارے غصہ کے آگ بن گئے کہ نالائق، بیہودہ تیری یہ جرأت۔ ارے تجھے کیا چپ۔ خبردار جو پھر ایسی گستاخی کی۔ اس نے کہا تھا۔

عمر فاروق@ون اردو

یہ گستاخی نہیں خیر خواہی ہے۔ کہ نماز پھر پڑھ لیجئے۔ بہرحال دونوں میں یہاں تک گفتگو بڑھی۔ کہ عہدہ دار نے اُسے مارا۔ اس نے کہا کہ آپ اور مار لیجئے۔ مگر میں آپ کو مسجد سے نہ نکلنے دوں گا۔ جب تک آپ نماز نہ دہرائیں گے۔ جب شور و غل زیادہ ہوا تو چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور عہدہ دار صاحب سے کہا کہ اس میں اس قدر بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ یہ تو کہتا ہے کیوں نہیں پھر پڑھ لیتے۔ غرض اس نے انہیں نماز پھر پڑھوائی۔ پھر تو ایسی تعدیل سے پڑھی کہ شاید عمر بھر میں یہ اوّل نماز ہو گی۔ کیونکہ اگر یہ بھی ویسی ہی پڑھتے تو پھر جھگڑا ہوتا۔ جب وہ عہدہ دار نماز پڑھ کے چلے گئے۔ تو اس تاجر کی بستی میں خوب شہرت ہوئی۔ لوگ اسے بزرگ سمجھنے لگے اور جدھر جاتا ہے، لوگ کہتے ہیں حضرت ذرا یہاں بیٹھ جائیے اور ذرا ہمارے گھر تشریف لے چلیئے۔ اب لوگ ضرورت سے نہیں، بلکہ تبرکاً عطر خریدتے ہیں۔ داموں میں بھی کچھ تکرار نہیں کرتے۔ کہ اگر زیادہ بھی چلے جائیں گے۔ تو برکت ہی ہو گی۔ غرض اس کا سب عطر بھی خوب بکا اور دین کی ایک بات سے دُنیا کا بھی فائدہ ہو گیا۔

تائیدِ منکر

غرض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے لیئے سختیاں برداشت کرتے ہیں اور ایک ہم سوال ہیں۔ کہ نہی عن المنکر اس لیئے نہیں کرتے۔ کہ آپس میں ویسا انبساط نہیں رہے گا۔ وہ شگفتگی باقی نہیں رہے گی۔ اذیت کا اندیشہ تو کیا ہوتا۔ محض انشراح کی کمی بھی نہیں چاہتے اور اگر اس خوف کے ساتھ طمع بھی ہو۔ تو پھر کچھ نہ پوچھیئے۔ منع کرنا تو درکنار۔ بلکہ خوشامد کے مارے خود اس منکر کی اُلٹی تائید کرتے ہیں۔ اگر امراء میں سے کوئی شطرنج کھیلتا ہو اور کوئی دوسرا اٹھ کے تو چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ یہ خود منع کرتے اور اگر منع کرنے کی ہمت نہ تھی تو خاموش رہتے ایہ بھی نہیں۔ بلکہ یہ کہہ دیں گے۔ کہ ہاں امام شافعیؒ نے شطرنج کو مباح کہا ہے۔ حالانکہ اب ان کا بھی

بھی یہ قول نہیں رہا۔ انہوں نے بھی اس سے رجوع کر لیا ہے اور جب یہ قول تھا تب بھی اس شرط سے تھا کہ اس میں قمار نہ ہو اور دوسری ضرورتوں میں اس کی وجہ سے خلل واقع نہ ہو۔ آپ کسی شطرنج باز کو دیکھ لیجئے۔ کہ اُسے دنیا کی کچھ خبر نہیں رہتی۔

ضلع سہارن پور کے ایک شاطر کی حکایت ہے۔ کہ اس کا لڑکا سخت بیمار تھا۔ وہ نزع میں مبتلا ہوا اور یہ شطرنج میں مبتلا تھا۔ گھر میں سے ماما آئی۔ کہ لڑکے کی بہت بری حالت ہے، چلئے گھر میں بلایا ہے۔ کہا چلو آتے ہیں۔ پھر آئی، پھر آئی۔ ان کا وہ ایک ہی جواب۔ حتیٰ کہ اس کا انتقال بھی ہو گیا۔ تب بھی وہی سبق کہ اچھا چلو آتے ہیں۔ اب اُسے غسل دیا جا رہا ہے۔ اچھا چلو آتے ہیں۔ کفن دیا جا رہا ہے۔ اچھا چلو، آتے ہیں۔ وہاں تو یہ فکر ہے کہ کہیں ہار نہ جاویں۔ ایک ایک بازی میں ساری ساری رات گزر جاتی ہے اور ایسا انہماک ہوتا ہے کہ اپنے کھاتے پینے اور کسی کے مرنے جینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ تو نماز کی کسے پروا ہوتی ہے۔

بالکل اس کی خاصیت وہی ہے۔ جو قرآن مجید میں شراب کی بیان کی گئی ہے۔ کہ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ۔ یعنی شراب تم کو خدا کی یاد سے روکتی ہے۔ اب آپ خود ہی غور کیجئے کہ شطرنج میں خدا یاد آتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ الغرض ان حضرت ماول صاحب کو اس سے بحث نہیں۔ کہ شطرنج میں خارجی کتنے مفاسد ہیں۔ یہ تو لالچ کے مارے کہہ دیں گے۔ کہ بعض ائمہ کے نزدیک مباح ہے۔ تو یہ حالت ہے۔ طمع میں دین فروشی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ خود تو کیا منکرات سے منع کریں گے۔ اگر کوئی اور بھی منع کرے تو اس کا معارضہ کریں گے۔

علماء کی طرف سے ترک دعوت کا نتیجہ

الغرض دیکھ لیجئے کہ رات دن کے ہمارے اوقات میں دعوت الی اللہ کے جس کے شعبے ہیں دعوت الی الطاعات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حصہ میں کے منت آتے ہیں۔ غرض دوسرے کی اصلاح کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ خلاصہ

عمر فاروق@ون اردو

اس مضمون کا یہ ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ دوسرے کو بھی خطاب ہونا ضروری ہے خواہ وہ خطاب خاص ہو۔ یعنی جس شخص کا جس پر اثر خاص ہے۔ اس کو روزمرہ کی مخالطت و مکالمت میں ضروریات دین سے آگاہ کیا جاوے۔ جیسے اپنے اہل وعیال، دوست واحباب اور ملنے جُلنے والوں کو آگاہ کیا۔ خواہ خطاب عام ہو کہ مجمع عام کو وعظ کے طور پہ پندو نصائح کی جاویں۔ خواہ وہ اہل اسلام ہوں، خواہ غیر اہل اسلام۔

مگر خطاب خاص کی طرح اس خطاب عام یعنی وعظ کے باب میں کس قدر کوتاہی ہے۔ ہم لوگ جو لکھے پڑھے کہلاتے ہیں۔ بس طالب علموں کے پڑھانے کو بڑی معراج سمجھتے ہیں۔ مگر جو غایت اصلی اور غرض صحیح تعلیم و تعلم سے ہے۔ اور جو انبیاء علیہم السلام کا خاص کام ہے۔ یعنی تبلیغ و اشاعت جو بذریعہ وعظ ہوتی ہے اس کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ بلکہ جو اساتذہ علامہ کہلاتے ہیں، وہ اُسے موجب تذلیل و تحقیر و باعث استخفاف اور ننگ وعار سمجھتے ہیں اور اس زعم باطل میں مبتلا ہیں۔ کہ وعظ کہنا جاہلوں کا کام ہے۔ بس جی جب تم نے اُسے جاہلوں کا کام سمجھ کر چھوڑ دیا۔ تو پھر جاہلوں ہی نے لے لیا جنہیں معانی کی تو کیا خبر ہوتی الفاظ تک درست اور صحیح ادا نہیں کر سکتے۔ لوگوں نے وعظ کہتے دیکھ کر انہیں عالم سمجھ لیا۔ اور عالم سمجھ کر بعد وعظ کے فتوے پوچھنے شروع کر دیئے۔ یہ بیچارے عالم تو تھے نہیں۔ مگر یہ کہتے شرم آئی کہ مجھے مسائل نہیں معلوم مجبوراً جو جی میں آیا بتا دیا۔ اور غلط سلط فتوے دے دیا۔ حدیث شریف میں ہے:۔

اتخذوا رؤسا جهالاً فافتوا بغير علم فضلوا واضلوا۔

کہ آخر زمانہ میں لوگ سردار بنائیں گے جاہلوں کو۔ جو بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے، لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ تو یہ نوبت کیوں آئی۔ صرف اس لیئے کہ جن کا یہ کام تھا، انہوں نے چھوڑ دیا اور اپنے لیئے موجب استخفاف سمجھا۔ حالانکہ یہ حضرات انبیاء کا اصل کام تھا۔ ان حضرات نے سوائے وعظ و

پند اور تبلیغ و اشاعت کے کبھی مدرسہ نہیں بنایا۔

ضرورتِ مدارس

مگر اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ جب انبیاء علیہم السلام نے مدرسہ نہیں بنایا۔ تو مدرسے بے کار ہیں۔ یہ بیکار نہیں ہیں۔ یہ نماز کے لیئے بمنزلۂ وضو کے ہیں کہ جس طرح نماز کے لیئے وضو ضروری ہے۔ اسی طرح تبلیغ و اشاعت کے لیئے مدارس کا وجود ضروری ہے۔ ہاں بعد فراغ تبلیغ و اشاعت سے باز رہنا ایسا ہی ہے۔ جیسا کوئی وضو کر کے نماز نہ پڑھے۔ تو وہاں مدارس کی اس لیئے ضرورت نہ تھی۔ کہ علوم کا محفوظ رہنا عادۃً ان پر موقوف نہ تھا۔ علوم سماع سے محفوظ تھے اور وہاں رات دن ان کی تبلیغ و اشاعت ہی سے کام تھا۔ سفر میں، حضر میں چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے شغل اُن حضرات کا دعوت الی اللہ ہی تھا۔ تو جو کام انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام تھا۔ اُس کو موجب عار و استخفاف سمجھنا کتنی بڑی غلطی و گستاخی ہے۔

اب رہا یہ کہ پڑھنا پڑھانا پھر کیوں ضروری ہوا۔ اصل تو یہی تھا کہ ایک دوسرے کو یونہی کہتے رہتے۔ مگر نہ تو سلف کا سا تقوٰی رہا۔ نہ حافظہ اگر ایسے ہی رہنے دیا جاتا۔ تو یہ اطمینان نہ تھا۔ کہ سُنے ہوئے مسائل یاد رہیں گے۔ دوسرے تقوٰی کی کمی سے دیانت بھی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ تو اس حالت میں یہ بھی اعتماد نہ تھا۔ کہ جو نقل کرتا ہے۔ راوی سے یہ ٹھیک بھی ہے یا اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی کر رہا ہے۔ جب یہ آثار ظاہر ہونے لگے۔ تو سلف صالحین کو توجہ ہوئی۔ کہ دین کو ضبط کرنا چاہیئے۔

چنانچہ اسی بناء پر انہوں نے راویوں کے تذکرے (اسماء الرجال) لکھے کہ کون راوی قوی الحافظہ ہے۔ کون ضعیف الحافظہ۔ ان کی ولادت و وفات کی تاریخیں اور ان کے سفر و تحصیل علم کے واقعات جمع کیئے۔ کہ کس نے اس سے سیکھا۔ اور اس نے کس سے سیکھا۔ انہی اعتبارات سے احادیث کے بہت سے اقسام

بن گئے اور اب کسی حدیث میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خوب پرکھ لیا گیا۔ کہ کون حدیث کس درجہ کی ہے۔ پھر حدیثوں سے احکام مستنبط کر کے مدون کر دیئے کہ احکام کے سمجھنے میں گڑبڑ نہ ہو۔ تو تبلیغ و اشاعت کے لیئے علم صحیح کی ضرورت تھی اور اس کے محفوظ رکھنے کے لیئے کتابوں کے لکھے جانے کی ضرورت ہوئی۔

پھر یہ ضرورت ہوئی۔ کہ ایک باقاعدہ جماعت ہو۔ جن کا کام صرف اس طریق سے دین کی حفاظت ہو۔ اس کے لیئے پڑھانے والوں کی ضرورت ہوئی۔ اور اس کی ایک تو یہ صورت تھی۔ کہ جہاں موقع مل گیا۔ کسی سے پوچھ لیا، راستہ میں کسی سے ایک سطر کسی سے دو سطر حل کر لیں۔ تو اس طرح باقاعدہ تحصیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیئے مستقل جماعت کی ضرورت ہوئی۔ کہ وہ ہر وقت اس کے لیئے تیار رہیں۔ کہ جو ان سے پوچھنے آئے۔ اُسے قاعدہ کے ساتھ بتائیں۔ پھر اس جماعت کے لیئے سامانِ فراغ کی ضرورت ہوئی۔ کہ کھانے پینے، رہنے سہنے کا اُن کے لیئے کافی انتظام ہو۔ اس طرح مدارس کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ تو بہرحال اصل کام دعوت الی اللہ ہے۔ اور اس کے محفوظ و قائم رکھنے کے لیئے مدارس کی ضرورت ہے۔ اب یہ چاہیئے۔ کہ جب مدارس سے علمِ ضروری حاصل کر لیں۔ تو دعوت الی اللہ بھی کیا کریں جس کا آسان ذریعہ وعظ ہے اور پڑھنا پڑھانا اس کا مقدمہ ہے۔ اس لیئے یہ شغل بھی ضرور رکھیں۔ جیسے نماز کے لیئے وضو اور وضو کے لیئے پانی اور لوٹوں کا جمع کرنا ضروری ہے۔ ایسے ہی تبلیغ کے لیئے پڑھنا پڑھانا ضروری ہے۔ مگر اگر کوئی شخص وضو اور لوٹوں ہی کے اہتمام میں رہے اور پانی ہی بھرا کرے اور نماز کا وقت گزر جاوے۔ تو کیا یہ شخص قابلِ مدح ہے؟ پس اسی طرح پڑھنا پڑھانا دعوت الی الحق کے صرف مقدمات ہیں۔ مگر اب ان مقدمات میں ایسی مشغولی ہوئی۔ کہ اصل کام کو بھی بھول گئے۔ افسوس جو لوگ اس کے اہل تھے۔ وہ بھی اس کو بھولے ہوئے ہیں۔ کہ وہ مقدمات ہی میں مشغول ہیں۔ مقصود میں وقت صرف نہیں کرتے۔

فضیلتِ دعوت

حق تعالیٰ ان آیات میں جو میں نے شروع میں تلاوت کی ہیں۔ اسی عمل کی فضیلت بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

ترجمہ:۔ اور کون شخص ہے زیادہ احسن از روئے قول کے اس شخص سے جو خدا کی طرف بلاوے، استفہام انکاری ہے۔ یعنی اس سے اچھا کسی کا قول نہیں جو اللہ کی طرف بلاوے۔ احسن سے معلوم ہوا۔ کہ اچھی باتیں تو اور بھی ہیں۔ مگر جتنی اچھی باتیں ہیں۔ ان سب میں زیادہ اچھی بات دعوت الی اللہ ہے۔ استفہام بقصدِ نفی ہے۔ سبحان اللہ! کیا بلاغت ہے کہ پوچھتے ہیں کون ہے احسن از روئے قول کے۔ اس میں مبالغہ زیادہ ہے۔ کیوں کہ عادت ہے۔ کہ جس جگہ پر تردد ہوتا ہے کہ کوئی خلاف جواب دے دے گا۔ وہاں پوچھا نہیں کرتے۔

مثلاً یوں کہتے ہیں کہ میاں فلاں تجارت سے اچھی کون سی تجارت ہے۔ یہ وہاں کہتے ہیں۔ جہاں مخاطب کو متکلم کی رائے سے اختلاف نہ ہو اور جہاں یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ شاید مخاطب خلاف جواب دے دے، وہاں پوچھا نہیں کرتے۔ بلکہ یوں بتلاتے ہیں۔ کہ میاں اس سے اچھی کوئی تجارت نہیں اور جہاں یہ احتمال نہیں ہوتا۔ بلکہ اعتماد ہوتا ہے۔ کہ مخاطب بھی پوچھنے پر یہی جواب دے گا۔ وہاں پوچھا کرتے ہیں۔ کہ تمہیں بتلاؤ کہ کون سی بات زیادہ اچھی ہے۔ کیونکہ ظاہر بات ہے کہ بدیہی اور حسی بات کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ اسی طرح اس دعوت الی اللہ کی فضیلت اتنی صاف بدیہی اور محسوس تھی۔ کہ صرف پوچھنا کافی ہو گیا۔ گویا یہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس سے اچھی فلاں بات ہے۔ تو استفہام میں تو یہ بلاغت ہے

احسن قولاً کی تحقیق

اب احسن قولاً کی تحقیق رہی۔ سو یہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ یعنی کس کی گفتگو سب سے اچھی ہے۔ وجہ اس ترجمہ کی ظاہر ہے۔ کیونکہ احسن باعتبار قصد کے صفت ہے قولاً کی۔ اور اقوال ہی کے اعتبار سے اس کی تفضیل بھی ہے اور چونکہ مفضل بعض مفضل علیہ ہی سے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ سب قولوں سے اچھا اس شخص کا یہ قول ہے اور یہاں تک تو کوئی اشکال نہ تھا۔ مگر آگے ارشاد ہے۔ وعمل صالحاً اور عمل صالح بھی کرے۔ اس جملہ کو اس کے معطوف علیہ کے ساتھ ملانے سے حاصل یہ ہوا۔ کہ سب سے اچھی بات اس شخص کی ہے۔ جو دعوت الی اللہ کرے۔ اور نیک کام کرے۔

اس میں اشکال یہ ہے۔ کہ دعوت الی اللہ کو تو احسنیۃ قولاً میں دخل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ خود قول ہے اور سب سے احسن۔ مگر عمل صالح کا اس میں کیا۔ کیونکہ وہ فعل ہے قول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اگرچہ وہ قول نہیں۔ مگر آداب و مکملات قول سے ہے۔ اس لیئے یہ بھی قول کے احسن ہونے میں دخیل ہے۔ تو حاصل یہ ہوا۔ کہ صاحب قول احسن وہ ہے۔ جو دعوت الی اللہ بھی کرے اور اس کے ساتھ ہی خود عمل بھی اچھا کرے۔ یعنی جو کچھ کہے۔ اس کے موافق عمل بھی کرے۔ تب وہ صاحبِ قول احسن ہے۔

اس پر یہ سوال پیدا ہوگا۔ کہ کوئی بہت اچھی بات کرے اور عمل اچھا نہ کرے تو قول تو اچھا ہے۔ گو عمل نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی دعوت الی الاسلام کرے اور خود مسلمان نہ ہو۔ دعوت الی الصلوٰۃ کرے اور خود نمازی نہ ہو۔ اسلام کے اوصاف بیان کرے اور خود ان پر عقیدہ نہ رکھے۔ تو اس پر من احسن قولاً تو صادق آتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنی من قولہ احسن ہیں۔ یعنی جس کی بات بہت

اچھی ہو۔ وہ احسن قولا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی۔ تو اب اگر کوئی خود عمل نہ کرے۔ تو اس کے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل رہا۔ اگر اس نے خود نماز نہ پڑھی تو اس کا یہ قول تو احسن ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ عمل احسن نہیں۔ تو اس سے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل پڑا۔

اس کا جواب بنص قرآنی بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ قول کے اچھے ہونے میں عمل کے اچھے ہونے کو بھی دخل ہے۔

اقسام داعی

اور اس بناء پر اس آیت سے ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوا۔ کہ داعی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک صاحب عمل صالح، ایک غیر صاحب عمل صالح۔ اول کا قول یا دعوت احسن ہے۔ ثانی کا قول یا دعوت غیر احسن ہے۔ باقی یہ کہ اس کی لم کیا ہے۔ کہ دعوت بلا عمل صالح غیر احسن ہے۔

تو اول یہ سمجھنا چاہیے۔ کہ احسن ہونا کیوں ہے۔ سو بات یہ ہے کہ ہر شئے کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے اور اس کی غایت ہوتی ہے۔ تو قول احسن کی بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ وہ ایک طاعت ہے اور ایک اس کی غایت ہے اور وہ غایت یہ ہے۔ کہ وہ دعوت سبب ہے، دوسرے شخص کے رجوع الی الخیر کا۔ تو دعوت الی اللہ کو جو اچھا کہا گیا۔ دو وجہ سے کہا گیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ سبب ہے لوگوں کے متوجہ الی اللہ ہونے کا۔ تو یہ احسنیت تو باعتبار غایت کے ہے اور دوسری اس وجہ سے کہ وہ فی نفسہا طاعت ہے اور دونوں وجہوں میں اس کا احسن ہونا مشروط ہے عمل صالح کے ساتھ۔

دعوت میں سبب نورانیت

اس کے لئے ایک دوسرا مقدمہ سمجھئے۔ کہ طاعت کے دو درجے ہوتے

عمر فاروق @ ون اردو

ہیں۔ ایک کی نورانیت قوی اور ایک کی نورانیت ضعیف ہوتی ہے اور اس قوت نورانیت کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک طاعت کرنے سے دوسری طاعت میں نور بڑھتا ہے۔ جس سے اس کی نورانیت قوی ہو جاتی ہے جیسے ایک چراغ کی روشنی ہلکی ہوتی ہے اور دوسرا چراغ بھی جلا دیا جائے۔ تو اس پہلے چراغ کی روشنی اور نورانیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ سو طاعات میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ ایک طاعت دوسری طاعت کے نور کو بڑھاتی اور قوی کرتی ہے۔ چنانچہ عابدین و سالکین خوب جانتے ہیں۔ کہ اگر اتفاق سے ایک عمل قضا ہو جاوے۔ تو دوسرے عمل میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا۔ اگر ایک دن تہجد قضا ہو جاوے۔ تو سارے دن کی عبادت میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا۔ جو پہلے ہوتا تھا ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود   گر ز باغ دل خلالے کم بود

(اللہ والے کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔ اگرچہ دل کے باغ میں ایک تنکا بھی کم ہو جائے)۔

یعنی باغ دل میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے۔ تو ہزاروں غموں کا سامنا ہوتا ہے۔ سو یہ حالت مشاہدہ و محسوس ہے۔ اسی طرح اس طاعت یعنی دعوت الی اللہ کا نور بھی دوسری طاعت یعنی عمل صالح سے قوی ہوتا ہے۔ یہ تو احسنیت باعتبار حقیقت کے ہے۔

داعی بے عمل

اب احسنیت باعتبار غایت کو سمجھیئے۔ وہ یہ کہ دعوت الی اللہ یعنی وعظ کا مقصود فی نفسہٖ کیا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ الفاظ یعنی مخاطب کا متوجہ الی اللہ ہو جانا ہے یعنی اس کا اثر فی نفسہٖ یہی ہے۔ گو کسی عارض کے سبب اُس کا ترتب نہ ہو اور عمل صالح کو اس غایت کے اعتبار سے احسنیت میں یہ دخل ہے۔ کہ مشاہدہ ہے کہ

عمر فاروق@ون اردو

اگر ناصح خود عمل نہ کرے۔ تو اس کی نصیحت میں اثر نہیں ہوتا اور جو خود عمل کرتا ہے، اس کی نصیحت میں اثر ہوتا ہے۔

اور علاوہ تاثیر فی نفسہ کے اس کا ایک طبعی سبب بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر خود اس پر ناصح کا عمل نہ ہو۔ تو مخاطب کو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ عمل ضروری ہوتا۔ تو یہ ناصح خود کیوں نہ کرتا۔ معلوم ہوتا ہے غیر ضروری ہے۔

چنانچہ ایک طبیب کی حکایت ہے کہ وہ ہر مریض کو یہ بتایا کرتے تھے۔ کہ پانی پینا چھوڑ دو اور خود خوب کثرت سے پیتے تھے۔ اس لیے مریض کو شبہ ہو جاتا تھا۔ کہ پانی کوئی ایسی مضر چیز نہیں۔ ورنہ حکیم صاحب خود کیوں پیتے۔ چنانچہ اس کو محسوس کر کے ان طبیب نے اپنی نصیحت پر آخر عمر میں ایک نہایت مؤثر عمل کیا کہ مرتے وقت جب موت کی تشنگی ہوئی۔ تو شربت پیش کیا گیا۔ تو کہا میں نہیں پیوں گا۔ زندگی بھر تو لوگوں کو پیاسا رکھا۔ کہ ان کو پانی پینے سے منع کرتا رہا۔ ان کی پیاس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اب اخیر وقت میں تو کم از کم ان کا ساتھ دوں گا۔ چنانچہ شربت نہ پیا اور جان نکل گئی۔ حضرت اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا۔ کہ اُن کی بُرائی پر عمل ہونے لگا۔ تو عمل وہ چیز ہے۔ کہ نصیحت کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔

ایک جگہ میں گیا۔ وہاں ایک اسکول بھی تھا۔ جس میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے اور ماسٹر اس کا ہندو تھا۔ وہاں لوگوں نے مجھ سے ماسٹر کی بڑی تعریف کی۔ کہ یہ روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھوانے کے لیئے لڑکوں کو مسجد لے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کا نماز پڑھوانا کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ روزانہ پانچ وقت بچوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہو گا۔ کہ اگر نماز کوئی ضروری چیز ہے۔ تو ماسٹر صاحب خود کیوں نہیں پڑھتے۔ اس لیئے ضرورت ہے۔ کہ نماز پڑھوانے والا مسلمان ہونا چاہیئے اور حقیقت میں یہی ہوتا ہے۔ کہ علماء باعمل کا جو اثر ہوتا ہے۔ وہ علمائے بےعمل کا نہیں ہوتا۔

میں نے خود ایک مقام پہ ایک واعظ صاحب کو دیکھا۔ کہ صبح کی نماز نہیں پڑھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مقام پر میں بلایا گیا تھا۔ اور وہ واعظ صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس شان سے کہ سیکنڈ میں سفر کیا اور اپنے ساتھ دس پندرہ مصاحبوں کو بھی لائے۔ بے چارہ سیکرٹری کہتا تھا۔ کہ میرا تو انہوں نے کورٹ کروا دیا۔ میں کیا جانتا تھا۔ کہ وہ اس قدر خرچ کر دیں گے۔ خیر جب وہاں پہنچے۔ بارش کا موسم تھا۔ میں تو برآمدہ میں لیٹ رہا۔ مگر ان حضرات سے یہ گوارا نہ ہوا کہ برآمدہ میں لیٹتے۔ آپ اندر لیٹے اور وہاں گرمی تھی۔ سیکرٹری سے بلا کر کہا۔ کہ دو آدمی رات بھر پنکھا جھلنے کے لیئے متعین کرو۔ تاکہ رات بھر باری باری پنکھا جھلیں۔ چنانچہ سیکرٹری کو یہ بھی کرنا پڑا۔ صبح کو پانی زور سے برس رہا تھا۔ جس سے مسجد میں جانا مشکل تھا۔ اس لیئے میں نے تو اٹھ کر وہیں نماز پڑھ لی۔ مگر وہ حضرت اندر ہی پڑے سوتے رہے اور صبح کی نماز اڑا دی۔ اب جن کو انہوں نے وعظ سنایا ہو گا۔ بھلا ان پہ کیا اثر ہوا ہو گا۔

بے عملی سبب ترکِ دعوت نہیں

مگر اس تقریر سے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ اگر عمل نہ ہو۔ تو وعظ ہی نہ کہے۔ جیسا بہت لوگوں کو یہ بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ واقعی اس طریق میں ہر ہر قدم پہ لغزشیں ہیں۔ جن سے بچنے کے لیئے نہایت ہی صحیح علم کی ضرورت ہے ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست

ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

(راہِ عشق میں شیطانی وسوسے بہت ہیں۔ ہوشیار رہو اور اس کے احکام پر کان لگائے رہو)۔

یعنی قدم قدم پر شیاطین کے وسوسے ہیں۔ ان سے ہوشیار رہو اور اپنے کان وحی کی طرف لگائے رکھو۔ تو ایک وسوسہ تو یہ ہوا تھا۔ کہ عمل نہیں کیا اور نصیحت

شروع کی۔ دوسرا وسوسہ یہ ہوا۔ کہ جس روزہ عمل کی ضرورت سمجھ میں آئی تو نصیحت ہی چھوڑ دی۔

جیسے ایک نیم ملا نے گاؤں کے ایک چودھری کو مسئلہ بتایا۔ کہ نیت بغیر روزہ نہیں ہوتا۔ اس نے پوچھا نیت کیا ہے؟ آپ نے کہا نیت یہ ہے۔ اللّٰھم بصوم غد نویت۔ دوسرے روز جو دیکھا تو چودھری مزہ سے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ پوچھا، ارے یہ کیا۔ روزہ نہیں رکھا؟ اس نے کہا صاحب! میں کیا کروں۔ بدون نیت روزہ ہوتا نہیں اور نیت ابھی یاد نہیں ہوئی۔ اس میں اس کی بھی غلطی ہے۔ کہ یہ بھی مسئلہ پوچھ لیتا۔ کہ اگر کسی کو نیت یاد نہ ہو۔ تو کیا کرے۔ اور مولوی صاحب کی بھی غلطی ہے۔ کہ خواہ مخواہ انہوں نے گنوار کو عربی میں نیت بتلائی۔ اول تو زبان سے کہنا ہی ضروری نہیں اور اگر کسی کو کہنا ہی ہے۔ تو اردو بھی کافی ہے۔ اس چودھری کی حالت ہم جیسے طالب علموں کی ہے۔ کہ واعظ کے لیئے عمل کی ضرورت سنی۔ تو یہ تو نہ ہوا کہ عمل شروع کرتے نہیں۔ بلکہ وعظ ہی حذف ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کبھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں، کبھی دوسری غلطی میں اور ہماری حالت اکثر اُمور میں یہی ہے۔ کہ جو کام کریں گے۔ اس میں خرابی پیدا کر لیں گے۔ جیسے مولانا کا ارشاد ہے

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی
چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب تو بھوکا ہوتا ہے۔ تو کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے اور جب پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ تو اکڑتا ہے اور متکبر ہو جاتا ہے)۔

یعنی یہ حالت ہے کہ بھوکے اور بلا میں مبتلا ہیں اور پیٹ بھرے اور بلا میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ ہمارے بھوکے ہونے کے وقت کے اخلاق ماہِ رمضان میں خوب ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی کو تمباکو کی بھوک ہے، کسی کو حقہ کی، کسی کو افیون کی،

پھر دیکھئے کہ اتنے جھلے ہو جاتے ہیں کہ بات بات پہ غصہ آتا ہے۔ ذرا سے میں لڑنے کو تیار۔

اسی واسطے حق تعالیٰ نے ہمارے اخلاق کا انتظام ایسے مواقع میں خاص اہتمام سے فرمایا ہے۔ چنانچہ روزہ میں ارشاد نبوی ہے۔

واذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب الحدیث۔

(اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو۔ تو نہ تو بیہودہ اور فحش باتیں کرے اور نہ چیخے چلائے)۔

حج میں مشقتیں بہت آتی ہیں اور اس لیئے ذرا ذرا سی چیز لکڑی، پانی اور آگ پہ جھگڑا ہو جاتا ہے۔ اس لیئے اس کا انتظام اس آیت سے فرمایا۔

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ

"کہ بے حیائی اور نافرمانی کی باتیں اور جنگ و جدال یا لڑائی جھگڑا حج میں نہیں ہے"۔

دیکھیئے یہ انتظام نماز کے متعلق نہیں فرمایا۔ کیونکہ نماز میں اتنے جھگڑے نہیں پیدا ہوتے اور یوں کسی کی طبیعت ہی میں خرابی ہو۔ وہاں بھی جھگڑے نکال لیتا ہے مگر شاذ۔ جیسے ہمارے اضلاع میں ایک قصبہ کا واقعہ ہے کہ دو شخص عیدگاہ کی امامت کے مدعی تھے۔ دونوں جا کے مصلے پر کھڑے ہو گئے۔ بعض مقتدی ایک کی طرف تھے اور بعض دوسرے کی طرف۔ گویا کچھ ان کے ووٹ دینے والے تھے اور کچھ اُن کے۔ غرض تمام صفوف میں دونوں کے مقتدین کا مجمع غلط ملط تھا۔ ایک نے اللہ اکبر کہا۔ تو دوسرے کے مقتدی یہ سمجھے کہ ہمارا امام کہہ رہا ہے اور دوسرے نے کہا تو پہلے کے مقتدی سمجھے ہمارا امام کہہ رہا ہے۔ غرض بڑی پریشانی ہر جزو میں رہی۔ قومہ، رکوع، سجدہ، قعدہ سب میں یہی لطف رہا۔ ایک امام نے الحمد ختم کر لی۔ تو اب دوسرے کا انتظار ہے کہ یہ سورت چھوٹی پڑھتا ہے یا بڑی۔ اگر بڑی پڑھے گا تو میں چھوٹی شروع کر دوں گا۔ تاکہ پہلے رکوع

میں جا سکوں اور اگر جیدی سے چھوٹی شروع کرے گا۔ تو میں جلدی جلدی ختم کر کے رکوع کر دوں گا۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک رکوع میں سایہ پہنچا۔ تو دوسرے کے بعض مقتدی غلطی سے رکوع میں جھک گئے۔ تو پاس والا اس کے کہنی مارتا ہے۔ کہ یہ ہمارا امام نہیں۔ وہ بے چارہ پھر کھڑا ہو گیا۔ تو دیکھئے یہاں ان لوگوں نے نماز میں بھی جدال کھڑا کر لیا۔ مگر حج کے جھگڑوں کے مقابلہ میں یہ مثل شاذ و نادر کے ہے اور وہاں تو بات بات پر چھنتی ہے۔ حتیٰ کہ میں نے تو پیر و مرید میں بھی لڑائی ہوتے دیکھی۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی علاقہ ادب و احترام کا نہیں ہوتا۔ تھے وہ پیر خوش اخلاق کہ لوٹ کے آئے تو صلح کر لی۔ پھر پیر پیر ہو گئے اور مرید مرید ہو گئے۔ خوش اخلاق کیا تھے۔ بات یہ تھی۔ کہ انہوں نے سوچا۔ کہ کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہے۔ کیوں اسامیاں کم کرو۔ غرض ایسے واقعات کے سبب حج میں فرمایا گیا۔ کہ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ علیٰ ہذا روزہ میں بھی جیسا کہ اوپر عرض کیا ہے کہ اس میں بھی ہمارے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں۔

اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کا بھی ایسا ہی انتظام فرمایا چنانچہ اوپر کی حدیث کا یہ بھی تتمہ ہے۔ کہ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ فَلْيَقُلْ اِنِّي امْرُءٌ صَائِمٌ۔ کہ جو روزہ رکھے۔ اُسے چاہیئے۔ کہ غل شور نہ مچاوے اور نہ لڑے جھگڑے اور اگر کوئی اور لڑنے پر آمادہ ہو۔ تو کہہ دے۔ کہ بھائی میرا تو روزہ ہے۔ علماء نے اس کی دو توجیہیں کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کہہ دے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے کہہ دے جیسا کہ ظاہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے۔ کہ دل میں کہہ لے۔ کہ میرا تو روزہ ہے۔ میں لڑوں جھگڑوں گا۔ تو روزہ خراب ہو جائے گا۔ مگر میرے نزدیک فیصلہ بین القولین یہ ہے۔ کہ فرض میں تو زبان سے کہہ دے اور نفل میں دل سے کہہ لے۔

بہرحال یہ تو ہماری بھوک کی حالت تھی۔ اب پیٹ بھرے کی سنیئے۔ کہ کیسے اکڑ اکڑ کے چلتے ہیں اور کیسے کیسے ترارے آتے ہیں۔ گویا اپنے آپے ہی

میں نہیں ہیں۔ انہی حالتوں پر نظر کر کے مولانا کا ارشاد ہے۔

؎ چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی
چونکہ خوردی تند و بد رگ می شوی

(جب تو بھوکا ہوتا ہے۔ تو کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے اور جب پیٹ بھرا ہوتا ہے تو اکڑتا ہے اور متکبر ہو جاتا ہے)۔

تو ہماری دونوں حالتیں محل ملامت ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی کہ واعظ بننے تو عمل کا اہتمام نہیں تھا اور اگر عمل کے لیے کہا گیا، تو وعظ ہی چھوڑ دیا۔ کہ عمل تو ہوتا نہیں، وعظ ہی کیا کہیں اور اگر وعظ سننے والے بھی یہی کہیں۔ کہ جب عمل نہیں ہوتا۔ تو سُن کے کیا کریں۔ تو پھر کیا ہو تو گویا دین کا یہ باب ہی مسدود ہو جاوے۔ بعضے تو یہاں تک غلطی میں ہیں۔ کہ اپنے وعظ کہنے کو شرعاً منہی عنہ سمجھتے ہیں۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کا متمسک یہ ارشاد ہے۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

ایک دوسری آیت میں ہے۔ جو اس سے بھی صاف ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض و ناپسند ہے۔ کہ وہ کہو جو نہ کرو۔ ایک تو اس آیت سے تمسک ہے اور دوسری آیت میں تو ظاہراً نصیحت بلا عمل ہی پر تصریحاً انکار ہے۔ اس لیے اگر اس سے شبہ پڑ جاوے۔ تو کچھ بعید نہیں مگر پہلی آیت یعنی لم تقولون الآیۃ کی تو یہ تفسیر ہی نہیں۔ یہ محض ترجمہ دیکھنے سے بناء الفاسد علی الفاسد پیدا ہوتی ہے۔

ابھی میں اس کی تفسیر اور شان نزول بتاتا ہوں۔ مگر اول اس آیت کو سمجھیے۔ جس میں ظاہراً اس کا صریح ذکر ہے۔ مگر اس کے بھی یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ

عمر فاروق @ ون اردو

ناسی نفس یعنی بدعمل کو وعظ کہنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ بلکہ واعظ کو نسیان نفس کی ممانعت کی گئی ہے۔ کہ وعظ تو کہو۔ مگر بدعمل مت ہو۔ بلکہ جو نصیحت دوسروں کو کرتے ہو، وہ اپنے نفس کو بھی کرو اور اس سے بھی عمل کراؤ۔

اب رہا یہ شبہ کہ ہمزہ استفہام انکاری تامرون پر داخل ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ناسی نفس کو امر بالبر یعنی وعظ کی ممانعت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اہل علم جانتے ہیں۔ کہ مدخول ہمزہ کا مجموعہ دونوں جملوں کا ہے تو مراد یہ ہے۔ کہ امر بالمعروف اور بدعملی کو جمع نہ کرو۔ تو باحتمال عقلی اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ امر بالمعروف تو کرو، مگر بدعملی نہ کرو۔ ایک یہ کہ اگر بدعملی کا وقوع ہو تو پھر امر بالمعروف نہ کرو۔ تو لوگوں نے اس کا مطلب اسی دوسری صورت کو سمجھا۔ کہ عمل بد میں مبتلا ہو تو وعظ چھوڑ دو۔ مگر یہ اس لیئے غلط ہے۔ کہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ آیت میں اس کا احتمال تو ہے۔ تو ہم کہیں گے۔ کہ اول تو دوسرے دلائل سے اس کا احتمال نہیں رہا اور اگر فرضاً احتمال ہے۔ تو دونوں جانب کا احتمال ہے۔ تو تمہارا تو استدلال اس سے جاتا رہا۔ باقی ہم اس سے استدلال نہیں کرتے۔ جو ہم کو دوسرا احتمال مضر ہو۔ ہمارے پاس ہمارے مدعا کے دوسرے مستقل دلائل موجود ہیں۔

اب رہی پہلی آیت یعنی لم تقولون الآیۃ تو یہاں تقولون کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل میں قول کے دو معنی ہیں۔ یا یہ کہو کہ قول کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قول انشائی، ایک قول خبری۔ قول خبری تو یہ کہ تم بذریعۂ قول کے کسی بات کی خبر دیتے ہو۔ ماضی کی یا مستقبل کی اور قول انشائی یہ کہ خبر نہیں۔ بلکہ کسی بات کا امر و نہی کرتے ہو۔ تو یہاں یہ قول انشائی مراد نہیں۔ قول خبری یعنی ایک دعوے مراد ہے چنانچہ شان نزول اس کا یہ ہے۔ کہ لوگوں نے کہا تھا۔ کہ ہم کو اگر کوئی ایسا عمل معلوم ہو جاوے۔ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک احب و افضل ہو۔ تو ہم ایسی ایسی کوشش کریں۔ پھر قتال نازل ہونے پر بعض جان بچانے لگے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں

پس اس دعوے کے متعلق ارشاد ہے۔ کہ ایسی بات کہتے ہی کیوں ہو، جو کرتے نہیں۔ تو اس آیت میں دعوے کا قول مراد ہے۔ نصیحت کا قول مراد نہیں۔

چنانچہ ان ہی آیتوں میں اس کا قرینہ بھی۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ ہے۔ بہرحال بلا عمل کے وعظ کہنے کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ اس شخص کو عمل کی کوشش کرنی چاہیئے اور وعظ کو ترک نہ کرنا چاہیئے۔

واعظ بدعمل

البتہ ایسے شخص کا وعظ جو کہ بدعمل ہو، نور و برکت سے ضرور خالی ہو گا۔ الغرض احسنیت باعتبار غایت کے بھی اور باعتبار حقیقت کے بھی وہیں ہو گی۔ جہاں وعظ کے ساتھ عمل بھی ہو گا اور جہاں نرا وعظ ہو گا اور عمل نہ ہو گا۔ وہاں احسن نہ ہو گا۔ البتہ حسن ضرور ہو گا۔ کیونکہ افعل التفضیل کی نفی سے مجرد صفت کی نفی لازم نہیں آتی۔ پس حاصل اس مسئلہ کا گویا اصلاح ہے ایک مفسدہ کی جو واعظ کو پیش آتا ہے کہ وہ بدعملی ہے۔

متواضع داعی

اس کی اصلاح کے بعد ایک اور مفسدہ عارض ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ وعظ اور عمل کے ساتھ ہی اس میں کبر و عجب ہو جاتا ہے۔ کہ میں بڑا صاحب کمال ہوں۔ کہ اللہ میاں کے تمام حقوق ادا کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ اس کے علاج کے لیے آگے تواضع کی تعلیم فرماتے ہیں۔ وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ یعنی اس نے یوں بھی کہا۔ کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔

آپ کو غالبا حیرت ہو گی۔ کہ یہ تو دعوے ہوا نہ کہ تواضع۔ بات یہ ہے۔ کہ اس قسم کے عنوانات میں عادت تو دعوے ہی کی ہے۔ اس لیے یہاں بھی دعوے

عمر فاروق@ون اردو

ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہاں مقصود تواضع ہی ہے۔

توضیح اس کی یہ ہے۔ کہ اسلام ایک ایسی چیز ہے۔ جس میں دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت تو یہ ہے۔ کہ وہ طاعت کاملہ ہے اور ایک حیثیت یہ ہے۔ کہ وہ گردن نہادن لطاعت ہے۔ گو یہ بھی کمال ہے۔ مگر عنوان کمال کا نہیں ہے۔ یا یوں کہو کہ اسلام کی ایک ذات ہے اور ایک صفت ہے۔ جب ذات کے اعتبار سے اپنے اسلام پر نظر پڑتی ہے۔ تو اس نظر کا اور اثر ہوتا ہے اور صفت کے اعتبار سے پڑتی ہے تو اور اثر ہوتا ہے۔ ذات تو ہے گردن نہادن لطاعت۔ اور صفت ہے طاعت کاملہ۔ جیسا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ اس پر دال ہے۔ یعنی خدا کے نزدیک دین صحیح وکامل اسلام ہی ہے اور چونکہ صفت تابع ہوتی ہے ذات کے۔ اس کا مقتضا یہ تھا۔ کہ ہماری نظر اولاً اس کی ذات پر ہوتی۔ مگر اب حیرت ہو گی۔ کہ ہماری نظر اپنے اسلام پر ذات کی حیثیت سے نہیں پڑتی۔ بلکہ صفت کی حیثیت سے پڑتی ہے۔ کہ ہم میں یہ صفت کمال ہے اور اسی بنا پر دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، کمال ہونے میں تو شک نہیں۔ گفتگو تو یہ ہے کہ تابع پر نظر گئی جو اصل چیز، یعنی ذات پر کبھی نظر نہ گئی۔ اس لیے دعوے پیدا ہو گیا۔ چونکہ اس جملہ کے متکلم میں خود عادت ہے دعوے کرنے کی نہ کہ تواضع کی۔ اسی لیے قرآن میں بھی سمجھ گئے۔ کہ دعوے میں مستعمل ہے۔ حالانکہ یہاں تواضع مقصود ہے اور دونوں قصد میں لہجہ بھی جُدا جُدا ہوتا ہے۔ تو بھائی یہ غلطی تو تمہاری ہے۔ کہ لہجہ دعوے پڑھ کر دعویٰ مراد لے لیا۔ تو گویا تم نے معانی کو تابع لہجہ کا بنا دیا۔ لہجہ دعوے کا کیوں اختیار کیا لہجہ انقیاد کا کیوں نہ اختیار کیا؟

جیسے ایک شاعر تھے۔ بخورس تخلص تھا۔ تخلص ہی سے سمجھ لیجئے کہ وہ کیسے شاعر ہوں گے۔ عموماً ان کے اشعار میں یہ ہوتا تھا۔ کہ ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہو جاتا تھا۔ کرتے یہ تھے۔ کہ ایک مصرعہ کیف ما اتفق پہلے کاغذ پر لکھ لیا۔ اور اسے سینک سے ناپ لیا۔ دوسرا مصرعہ اسی سینک کے برابر لکھ لیا۔ اگر عبارت

زائد ہوتی۔ باریک قلم سے اتنی جگہ میں لکھ لی۔ کسی نے اعتراض کیا کہ تمہارے اشعار میں ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہوتا ہے۔ کہنے لگے۔ کہ مولانا جامیؒ کو تو مانتے ہو کہ وہ کیسے اساتذہ میں ہیں۔ انہوں نے بھی ایک مصرعہ چھوٹا اور بڑا کہا ہے۔ چنانچہ دیکھو ــــــــ!

ع الٰہی غنچۂ اُمید بکشا[1]

اس مصرعہ کو تو خوب ٹھہر ٹھہر کے اور ترتیل کے ساتھ پڑھا۔

ع گلے از روضۂ جاوید بنما[2]

اس مصرعہ کو خوب جلدی سے پڑھ دیا۔ بس ایک چھوٹا ایک بڑا ہو گیا۔ تو لہجہ کو چھوٹا بڑا بنا کر مصرعوں کو اس کے تابع بنا لیا۔ ورنہ واقع میں تو دونوں مصرعہ برابر ہیں۔ تو صاحب! لہجہ حقائق کے تابع ہے۔ حقائق لہجہ کے تابع نہیں ہیں۔ جہاں ایسا ہو گا، وہاں لہجہ کو غلط کہا جائے گا۔ حقائق کو نہ بدلا جاوے گا۔ اسے یوں سمجھیئے۔ کہ کوئی کہے میں طالب علم ہوں۔ اب اس کے دو محمل ہیں۔ ایک تو جاہل کے مقابلہ میں کہنا اور ایک کسی بڑے علامہ کے مقابلہ میں کہنا۔ تو جاہل کے مقابلہ میں جو کہے گا۔ تو لہجہ میں ترفع اور دعوے کی شان ہو گی۔ کہ میں طالب علم ہوں، تم جاہل ہو۔ میں تم سے بڑھ کر ہوں اور جو علامہ کے مقابلہ میں کہے گا۔ اس کے لہجہ میں خودبخود نرمی اور انکسار ہو گا۔ جس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ میں آپ کے مقابلہ میں کیا چیز ہوں۔ آپ کی بڑی شان ہے۔ آپ علامہ ہیں۔ میں محض ایک مبتدی ہوں۔ تو عقلاء جانتے ہیں۔ کہ لہجہ کے تفاوت سے ایک ہی فقرہ کے دو مدلول ہو گئے۔

اسی طرح وقال اننی من ــــــــ المسلمین۔ میں اپنے دعوے کا

---

[1] الٰہی میری آرزو پوری فرما۔

[2] ایک پھول آخرت کے باغ سے مجھے دکھلا۔

لہجہ بنالیا اور اس کی صفت پر نظر کرنے کے اعتبار سے اُس لہجہ کو صحیح بھی سمجھ لیا۔ حالانکہ یہاں ذات اسلام مراد ہے۔ ذات اسلام کے کیا معنی ہیں۔ انقیاد۔ گردن نہادن لطاعت۔ اسلام کا لفظ عربی ہے۔ آپ نے اس آیت کے ترجمہ میں یہی لفظ دیکھا۔ اس لیے مراد واضح نہیں ہوئی۔ ذرا اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کیجیے۔ پھر آپ کو معلوم ہو جاوے گا کہ کیا مراد ہے۔ وہ ترجمہ یہ ہوگا۔ کہ وہ شخص یہ بھی کہتا ہے۔ یعنی میں تو تابعداری کرنے والا ہوں، غلامی کرنے والا ہوں۔ اب بتایئے۔ یہ تواضع کی تعلیم ہوئی یا نہیں۔ تو آیت کا خلاصہ یہ ہوا۔ کہ دعوت الی اللہ میں عمل صالح سے جب ہی دعوے بھی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے اچھا کسی کا قول نہیں۔

عبدیّت

اور حقیقت میں دعوے کا بندہ کو حق ہی کیا ہے ؟ مگر ہماری حقیقت ناشناسی ہے۔ کہ ہم اپنی بے چارگی و عبدیت کی صفت بھول گئے۔ آقا نے کہا پانی پلاؤ۔ تو غلام نے یہ تو سمجھا کہ میں نے پانی پلایا۔ تو بڑا احسان کیا اور یہ نہ سمجھا کہ میں تو غلام ہی ہوں۔ اس صفت کے بھول جانے سے ہمیں ہر چیز پر فخر ہے۔ نماز پہ فخر، روزہ پہ فخر، ذکر و شغل پہ فخر، وعظ پہ فخر۔ اگر یہ سمجھتا کہ میں تو غلام ہوں۔ انہیں کے حکم سے اور انہیں کی توفیق سے کر رہا ہوں۔ اور اگر وہ ہمیں یہ کام نہ بتلاتے یا توفیق نہ دیتے۔ تو کہاں سے کچھ کرتے۔ پس اننی من المسلمین کے معنی یہ ہیں۔ کہ میں تو فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اور حقیقت میں ہم کرتے ہی کیا ہیں ؟ یہ تو ان کی عنایت ہے کہ انہوں نے سارا کام خود کرا کر ہماری طرف منسوب کر دیا۔

ؔ کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی تیری ہی زلفوں کا کام ہے۔ (لیکن) مصلحتاً عشاق نے چین کے ہرنوں پر اکثر الزام لگا دیا ہے)۔

ے کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل — نسیم صبح تیری مہربانی

ے عشق من پیدا و معشوقم نہاں — یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(یار تو جہاں سے باہر مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا)۔

اسی باب میں مولانا فرماتے ہیں۔ ے

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم — حملہ شاں از باد باشد دمبدم

(ہم ہیں تو سب شیر ہی لیکن جھنڈے کے اوپر بنے ہوئے شیر ہیں۔ جو ہوا کی وجہ سے ہر وقت حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہم ہیں جو تصرف ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے)۔

خوب مثال دی ہے۔ پہلے یہ دستور تھا۔ کہ علم پر تصویریں بنا دیا کرتے تھے اور اس میں بھی شیر کی تصویر اکثر بناتے تھے۔ تو جب ہوا سے علم لہراتا تھا۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ شیر حملہ کر رہا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ تصویر بنانے کی اجازت ہے۔ یہ تو ایک مثال کے طور پر بیان کر دیا ہے ے

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم — حملہ شاں از باد باشد دمبدم

(ہم سب شیر ہیں۔ مگر شیر علم ہیں۔ کہ اس کا حملہ ہوا کی بدولت ہے کہ اگر ہوا نہ ہو تو پڑے رہیں۔ وہ تو ہوا ہے جو حرکت دیتی ہے) لیکن ے

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد — آنکہ ناپیداست ہرگز کم مباد

یعنی حملہ تو نظر آتا ہے۔ مگر ہوا نظر نہیں آتی اور ایک جگہ فرماتے ہیں ے

انت کالریح ونحن کالغبار — یختفی الریح وغبراہ جہار

آپ مثل ہوا کے ہیں اور ہم مثل غبار کے۔ یہ سب تشبیہیں اور مثالیں ہیں مگر وہ من کل الوجوہ ایسے نہیں ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ اتصال و حرکت سے پاک

ہیں. گو محرک میں نفس تحریک یہاں اور وہاں یکساں ہے۔ اور دونوں متحرک میں نحو حرکت بھی متحد ہے۔

اور چونکہ بعض کو شبہ پیدا ہو کر الحاد کا اندیشہ تھا۔ اس لئے مولانا نے اس کو خود ہی صاف کر دیا ہے

اے بروں از وہم وقال وقیل من   خاک بر فرق من وتمثیل من

(اے وہ ذات جو میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے مجھ پر اور میری تمثیل پر خاک)۔

یعنی آپ ان سب سے منزہ اور سب سے پاک ہیں. جیسا کہ دوسرے عارف نے کہا ہے

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم
واز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اور واقعی حق تعالیٰ کی شان کا کیا احاطہ ہو سکتا ہے

اے بروں از وہم وقال وقیل من   خاک بر فرق من وتمثیل من

اے وہ ذات! جو میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے مجھ پر اور میری تمثیل پر خاک)۔

رہا یہ کہ جب وہ ہماری تمثیلات سے پاک ومنزہ ہیں۔ تو مثال کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کی وجہ فرماتے ہیں

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت   ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

(تیری عمدہ تصویر سے بھی بندہ کو صبر نہیں آیا۔ وہ ہر وقت آپ سے یہی کہتا ہے کہ آپ تشریف لائیں۔ میری جان ہر وقت آپ کے لئے حاضر ہے)

وہ ذہن میں آسکتے ہیں اور نہ ذہن میں لینی تشبیہ میں بھی ان کی شان بیان

نہیں ہو سکتی۔ اس لیئے صوفیہ کا قول ہے۔

کل ما خطر ببالک فھو ھالک واللہ اجل من ذلک۔

جو کچھ تمہارے تصور میں آتا ہے۔ وہ فنا ہو جانے والا ہے اور خدا اُس سے بہت برتر ہے۔ تو وہ ان سب مثالوں سے پاک ہیں۔ مگر بندہ کو بدون کسی خاص تصور کے صبر نہیں آتا۔ تو یہ مثالیں مولانا نے بطور تشبیہ یعنی مشارکت فی لبعض الاوصاف کے دی ہیں۔

نعمتِ توفیق

بہر حال یہ معلوم ہو گیا۔ کہ ہم کیا چیز ہیں؟ اصل تو وہی ہیں۔ جو سب کچھ کرا دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی فرماتے ہیں۔

فسنیسرہ للیسریٰ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ بندہ جس کام کے لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ وہی اس کے لیئے آسان ہو جاتا ہے۔ پھر یہ آیت تائید میں پڑھی۔ فسنیسرہ للیسریٰ۔ لیے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں ارادہ سے۔ مگر ارادہ کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہوتی ہے، وہ کیا تقاضا۔ داعیہ اسی کی بدولت ارادہ میں کامیابی ہوتی ہے اور وہ نہ ہو تو پھر دیکھ لیجئے عمل کرنے میں کتنی مشکل ہوتی ہے۔ نماز کی فرضیت سُن کر ارادہ تو کر لیا۔ کہ نماز پڑھیں گے۔ لیکن اگر تقاضا نہیں پیدا ہوا تو کبھی نہیں پابندی ہو گی اور یہ تقاضا محض حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت اور توفیق ہے۔ جب کامیابی بلا داعیہ کے کم ہوتی ہے اور داعیہ وہ پیدا کرتے ہیں۔ تو بس وہی کام لیتے ہیں۔ جب وہ کام لیتے ہیں۔ تو پھر کام پر کبر و عجب کیسا۔ اننی من المسلمین کا عربی الفاظ سے ترجمہ نہ کیجئے۔ کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔ اردو میں ترجمہ کیجئے کہ میں تو فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اصلاحِ داعی

ہے ۔ پھر انبی مسلم نہیں ۔ فرمایا کہ اس میں تفرد کا شبہ ہوتا ۔ کیوں کہ بڑے سرکار کا تو غلام بننا بھی فخر ہے ۔ تو اس صورت میں پھر شائبہ عجب کا رہ جاتا ۔ کہ یہ شخص یہ سمجھتا کہ تنہا میں ہی فرمانبردار ہوں ۔ سبحان اللہ قرآن مجید میں بھی علوم کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں ۔ تو انبی من المسلمین میں ایک وجہ دلالت علی التواضع کی تو مادہ کے اعتبار سے تھی اور ایک وجہ صیغہ کے اعتبار سے ہے کہ اس سے اشارہ اس امر کی طرف کر دیا ۔ کہ کام کرنے والے بہت ہیں ۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ایک ہی ہوں ۔ کبھی نخرہ پیدا ہوتا ۔ کہ میں نہیں کروں گا ۔ تو کام رک جائے گا ۔ یہ لفظ بھی بتلا رہا ہے ۔ کہ وہاں بہت سے غلام ہیں ۔ اگر ایک غلام نے فرمانبرداری نہ کی ۔ تو اس نے اپنا ہی کچھ کھویا پھر اس جگہ تو ہر واحد کے اعتبار سے بتایا کہ ایک شخص کے چھوڑ دینے سے ہمارا کام نہیں رک سکتا ۔

اور ایک دوسرے مقام پر بھی بتا دیا ۔ کہ ساری جماعت کی جماعت بھی ہمارا کام چھوڑ دے ۔ تب بھی ہمارا کام نہیں رک سکتا ۔ چنانچہ ارشاد فرمایا :۔

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم ۔

اگر تم اعراض کرو تو وہ ایک اور جماعت پیدا کر دیں گے ۔ جو تمہارے مثل نہ ہوں گے ۔ بلکہ وہ تم سے بہتر خدمت کرنے والے ہوں گے من المسلمین میں واحد واحد کی اصلاح تھی ۔ اور یہاں جماعت کی اصلاح ہے ۔

اب صرف ایک شبہ رہا ۔ کہ ہر حال میں ضرورت تو پڑی ۔ ملازموں اور خدمت گاروں کی ۔ جیسا کہ استبدال بتلا رہا ہے ۔ تو حدیث شریف میں جو کہ مثل کلام الٰہی کے ہے ۔ خاص کر حدیث قدسی اس شبہ کا بھی جواب ہے :۔

لو ان جنکم وانسکم واولکم واٰخرکم ورطبکم ویابسکم اجتمعوا علیٰ ــــ قلب اشقیٰ رجل منکم ما نقص من ملکی شیئا ا ف

کما قال۔

"یعنی اگر تمہارے جن و انس اگلے پچھلے خشک و تر سب سے زیادہ شقی جیسے بن جاویں۔ تو بھی ہماری سلطنت میں کچھ نقصان نہیں آسکتا۔ بلکہ قرآن مجید میں بھی ہے:۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ۔

یعنی اگر تم نمک حرامی کرو۔ تو خدا کو کچھ پرواہ نہیں۔ پس وہ تو ایسے غنی ہیں کہ نہ انہیں فرد کی پرواہ نہ افراد کی نہ کل کی نہ آحاد کی۔

اب اگر کوئی خدمت دین کی کرے تو ناز کیا؟ مگر باوجود اس کے۔ کہ اکثر کی یہ حالت ہے۔ کہ ذرا سا کام کیا اور اشتہاروں اور اخباروں میں اپنی مدح کے مضمون دوسروں کے نام سے چھپوا رہے ہیں۔ بہر حال ہم کیا اور ہماری خدمت ہی کیا۔ اول تو جو خدمت ہے۔ وہ بھی واقع میں انہیں کی توفیق سے ہے۔

ہماری خدمتِ دین کی حقیقت

اور پھر وہ اپنی ذات میں بھی کسی قابل نہیں بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے ایک حکایت مولانا نے تحریر فرمائی ہے۔ کہ ایک مرتبہ عرب میں قحط پڑا اور پانی تک بالکل خشک ہو گیا۔ ایک بدوی تھا۔ اول تو وہ یوں بھی معاش نہ رکھتا تھا۔ پھر اس پر قحط کی وجہ سے اور بھی تنگی میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی بیوی نے کہا۔ آخر گھر میں کب تک بیٹھو گے۔ کہیں نکلو اور کچھ کماؤ۔ اس نے کہا جب مجھ کو کوئی ہنر نہیں آتا تو کہاں جاؤں اور جا کر کیا کروں گا۔ بیوی نے کہا، خلیفۂ بغداد کے پاس جاؤ اور حاجت پیش کرو۔ عرضِ حاجت کے لئے کسی ہنر کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ مگر خود خلیفہ کے پاس جانے کے لئے کچھ تحفہ چاہیئے۔ سو تحفہ کیا لے جاؤں۔ کہنے لگی یہ گاؤں میں جو تالاب خشک ہو گیا ہے اور ایک

گڑھے میں کچھ پانی رہ گیا ہے۔ بس اسی کا پانی لے جاؤ۔ بھلا ایسا پانی خلیفہ کو کہاں نصیب۔ وہ یہ سمجھتی تھی۔ کہ بغداد میں بھی ہمارے گاؤں کی طرح پانی نہ رہا ہوگا۔ سچ کہا واقعی خلیفہ کو ایسا سڑا ہوا پانی کیوں ملنے لگا۔

غرض وہ پانی اس نے ایک گھڑے میں بھرا۔ یہ سر پر رکھ کر سیدھا بغداد خلیفہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہاں پہنچا۔ تو خلیفہ تک پہنچایا گیا۔ سر پر سڑے ہوئے پانی کا گھڑا جسے بیوی نے خوب اچھی طرح بند بھی کر دیا تھا رکھا ہوا خلیفہ کے سامنے پہنچا اور جاتے ہی گھڑا تخت پر خلیفہ کے رکھ دیا خلیفہ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ کہنے لگا۔ ھذا ماء الجنۃ۔ یہ جنت کا پانی ہے۔ خلیفہ نے حکم دیا، کھولو۔ کھولا گیا۔ تو سارا دربار سڑ گیا۔ مگر خلیفہ ایسا کریم النفس تھا کہ ناک بھوں بھی نہیں چڑھائی۔ خلیفہ کی تہذیب کے اثر سے سارا دربار خاموش رہا۔ خلیفہ نے خدمت گار کو حکم دیا۔ کہ لے جاؤ، اسے ہمارے خاص خزانہ میں رکھو اور ان کا گھڑا خالی کرکے اشرفیوں سے بھر دو اور اُن کی خوب خاطر مدارات کرو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

جب رخصت کا وقت قریب آیا۔ حکم ہوا کہ واپسی میں انہیں دجلہ کے راستہ سے اُن کے گھر روانہ کرو۔ اشرفیوں سے گھڑا بھرا جانا۔ أُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ۔ کا مصداق تو تھا ہی۔ مگر اس نے جو دجلہ دیکھا اور اس کے پانی کی لہریں اور ٹھنڈی ہوا کا لطف نظر آیا۔ پھر تو اس پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کہ جس کے قبضہ میں اتنا بڑا دریا ہے۔ اس کے دربار میں میں نے یہ ہدیہ پیش کیا۔ پس اسی طرح ہماری آپ کی عبادت ہے۔

عنایتِ باری تعالیٰ

آپ جس وقت آخرت میں خزائن اعمال انبیاء کے دیکھیں گے۔ تو

آپ کو اپنے اعمال پر نظر کرکے شرم آوے گی. تو ان اعمال پر ناز کاہے کا؟ بلکہ وہاں تو اعمالِ کاملہ فاضلہ کا بھی یہی فیصلہ ہے. کہ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنْکُمْ: خدا کو تمہاری کچھ حاجت نہیں. یہ تو ان کی عنایت ہے. کہ ان اعمال کی توفیق دے دی. تو ہمیں چاہیئے. کہ ان کی نعمت توفیق نظر کریں، نہ کہ اپنے عمل اور خدمت پر ے

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(احسان مت بتاؤ کہ ہم بادشاہوں کی خدمت کرتے ہیں. بلکہ احسان مانو کہ تم جیسے نا اہلوں کو اس نے اپنی خدمت میں رکھ چھوڑا ہے).

ایک اور واقعہ سے اس کی تفسیر اور بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی وہ یہ کہ ایک شخص مجھ کو پنکھا جھلتے تھے. مگر جھلنا جانتے نہ تھے. کبھی سر میں مار دیا، کبھی کان میں لگ گیا، کبھی ٹوپی اڑا دی. مگر چونکہ ان سے بے تکلفی نہ تھی. لحاظ کے مارے میں نے کچھ نہ کہا اور اتنی دیر تک صبر کیا. وہ اپنے دل میں یہ سمجھتے ہوں گے. کہ میں نے بڑا احسان کیا. جو اتنی دیر تک پنکھا جھلا اور میں یہ سمجھ رہا تھا. کہ میں نے بڑا احسان کیا، جو ان سے پنکھا جھلوایا. اب دیکھ لیجیئے کہ واقع میں احسان کس کا زیادہ ہے. سچ تو یہ ہے. کہ احسان میرا ہی ہے کہ ان کی خاطر سے میں نے تکلیف برداشت کرلی اور ناراضی ظاہر نہیں کی.

اسی طرح حق تعالیٰ کی عبادت کو آپ بڑی خدمت سمجھتے ہیں. اگر غور کیا جاوے. تو خود ہماری وہ خدمت ہی پسند کے قابل نہیں. دیکھ لیجیئے ہمارا کوئی روزہ اور کوئی نماز بھی مکروہات سے خالی ہے. پھر جو آپ کا یہ نماز روزہ انہوں نے لے لیا. تو ان کا احسان ہوا. کہ اس پر سزا نہیں دی. تو ان کی عنایت تو بھول گئے، اپنا احسان جتلانے لگے. تو اننی من المسلمین میں

متنبہ کر دیا۔ کہ خدمت پر نازمت کرنا۔ ہمارے یہاں تم جیسے بہتیرے غلام پڑے ہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ یہ

یکے روز بربندۂ دل بسوخت — کہ میگفت و فرمانداش می فروخت

(ایک دن ایک غلام کی بات سے میرا دل بھنک گیا۔ جو اپنی فروخت کے وقت یہ کہہ رہا تھا)۔

ترا بندہ چوں من بیفتد بسے — مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

(تجھے تو مجھ جیسے بہت سے غلام مل جائیں گے۔ میرے لیئے تجھ جیسا مالک کوئی نہیں ہو گا)۔

یعنی ایک شخص اپنا غلام بیچ رہا تھا اور غلام یہ کہہ رہا تھا۔ کہ تجھ کو مجھ جیسے تو بہت مل جائیں گے۔ مگر مجھ کو تجھ جیسا آقا نہیں ملے گا۔ تو واقعی ہماری نسبت خدا کے سامنے یہی ہے۔ نعوذ باللہ اگر یہ خدا کو چھوڑ دے تو خدا کہاں ملے گا۔ مگر خدا کو اس کی کیا پرواہ۔ ایسے کھٹمل، مچھر، جھنگے رہے تو کیا نہ رہے تو کیا۔ جیسے کسی مکان کے متعلق کوئی جھنگا یوں کہنے لگے۔ کہ ہمیں نے تو اس گھر کو آباد کر رکھا ہے۔

جیسے ایک قصہ ہے۔ کہ کسی عطر فروش کی لڑکی چمڑے والوں میں بیاہی گئی۔ ایک دن اتفاق سے ساس بہو میں لڑائی ہوئی۔ ساس نے کہا۔ کہ ایسی سست اور کاہل بہو سے پالا پڑا ہے۔ کہ تنکے پر سے بھی نہیں ملتی۔ بہو نے کہا واہ! مجھے کاہل نہ کہنا۔ میں نے تو اتنا بڑا کام کیا ہے۔ کہ آج تک تم میں سے کسی سے بھی نہ ہو سکا۔ ہاں صاحب وہ کیا صاحب وہ یہ کہ میرے آنے سے تمہارے گھر کی ساری بدبو جاتی رہی۔ ورنہ پہلے گھر کیسا سڑا ہوا تھا۔ یعنی اب ان کا دماغ بھی اس بدبو کا عادی ہو گیا۔ تو یہ یوں سمجھیں کہ بدبو جاتی رہی۔ تو ایسے ہی ہم ہیں کہ غیر خدمت کو خدمت سمجھ رہے ہیں۔ ورنہ کیا ہماری خدمت تو اُنہی من المسلمین کے دو معنی ہو سکتے تھے۔ ایک دعوے و فخر اور

ایک تواضع مراد ہے۔

اور اس کی تائید کہ ایک ہی لفظ دونوں معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ خود قرآن مجید کے دوسرے موقع سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ مقبولین کی مدح میں اُن کا مقولہ ارشاد ہے:۔

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا۔

یعنی اے اللہ! ہم نے ایک منادی کو سُنا کہ وہ ایمان کے لیے ندا دیتا ہے۔ کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ(فَآمَنَّا) پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے پروردگار! پس بخش دیجئے ہمارے گناہ اور دور کر دیجئے ہماری بُرائیاں۔ دیکھئے یہاں آمنا تواضع اور انکسار اور افتقار کے لیے ہے۔ جس کو ذوقِ سلیم اور سیاق و سباق صاف بتلا رہا ہے۔ اب دوسری آیت لیجئے جو اسی لفظ کو کبر و عجب کے طور پر استعمال کرنے پر دال ہے:۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا الآية۔

یہاں بھی وہی آمنا ہے۔ مگر یہاں اس کو رد کیا گیا۔ جس کا سبب وہی ہے۔ کہ دعوے اور فخر سے کہتے تھے۔ چنانچہ بعد والی آیت اس پر صریح دال ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

یعنی وہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں اپنے اسلام لانے کا۔ فرما دیجئے کہ احسان نہ رکھو مجھ پر اپنے اسلام کا۔ بلکہ خدا کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کر دی۔ بشرطیکہ تم اس قول میں سچے ہو۔

اجزائے دعوت

عمر فاروق @ اون اردو

غرض تو دیکھئے یہاں ان کا امنا کہنا دعوے اور فخر کے طور پر تھا۔ اس کے جواب سے صاف طور پر معلوم ہو گیا۔ کہ واقعی خدا کا احسان ہے۔ جو اس نے ہمیں نیک کام کی ہدایت کر دی۔ اسی طرح یہاں بھی فرما دیا۔ وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ تو ایک تکمیل دعوت الی اللہ کی یہ ہوئی۔ تو اب کل تین چیزیں ہوئیں۔ ایک مقصود یعنی دعوت الی اللہ اور دو اس کے مکمل یعنی عمل صالح اور تواضع و افتقار و اعتراف فرمانبرداری۔ یہ تین اجزاء ہیں اور کیسے مرتبط ہیں۔

اب اپنی حالت دیکھئے۔ کہ اولاً تو دعوت الی اللہ کا باب ہی گم ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں قدرت ہے وہاں بھی نہیں اور جہاں قدرت نہیں ہے وہاں کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ تو وہ تھے کہ جہاں قدرت نہ تھی وہاں بھی دعوت الی الحق سے باز نہیں رہتے تھے۔

محکوم کو دعوت

اور ہم ہیں۔ کہ قدرت کی جگہ بھی نہیں کرتے۔ بیوی، بچوں، نوکروں کو باوجود قدرت کے ہم کبھی امر بالمعروف نہیں کرتے۔ مگر یہ برتاؤ صرف خدا کے معاملات میں ہے۔ اپنے معاملات میں ہرگز نہیں۔ گھر میں آئیں گے تو پوچھیں گے کہ کھانا تیار ہوا نہیں ہوا۔ مگر یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ بیوی نے نماز بھی پڑھی کہ نہیں۔ بہتیرے کہیں گے کہ بیوی سے کہا تو تھا۔ مگر وہ نہ پڑھے تو کیا کریں بھائی کہنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک مشورہ اور ایک حکم۔ ایک تو یہ کہنا کہ نماز پڑھا کرو۔ ہمیں نماز نہ پڑھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو مشورہ کی صورت ہے کہ اس کی مخالفت سے بیوی کو ناراضی کا ڈر نہیں۔ اور ایک یہ کہنا ہے۔ کہ جیسے بیوی کھانے میں نمک تیز کر دے۔ تو ایک دن تو نرمی سے کہیں گے۔ دوسرے دن سختی سے کہیں گے اور تیسرے دن جو ذرا اکھڑ ہیں وہ ڈنڈوں

سے کہیں گے تو یہ حکم کی صورت ہے۔ جس کی مخالفت سے بیوی کو ڈر ہو جاوے کہ میاں سخت ناراض ہوں گے۔ ذرا انصاف سے کہو کیا نماز کو اسی طرح کہا تھا جس طرح نمک کو کہتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ اگر نماز نہ پڑھوں گی۔ تو پھر ہم تمہارے ہاتھ کی روٹی نہیں کھائیں گے۔ اور ایسا ہی کر دیکھو اور ڈر و مت کہ روٹی نہ ملے گی۔ بہت سے بہت ایک ہی آدھ روز ایسا کرنا پڑے گا۔ پھر تو وہ پابندی ہو جائے گی۔

اور شہروں میں تو یہ سزا کچھ بھی مشکل نہیں۔ پوری کچوری روٹی سالن سب بازار میں موجود ہے۔ البتہ قصبات میں ذرا دشواری ہے۔ مگر وہاں بھی کچھ دشواری نہیں۔ آخر جب بیوی مر جاتی ہے، تو نکاح ثانی تک برادری میں گھر گھر پکانے کے لئے آٹا گھومتا پھرتا ہے یا نہیں۔ اگر کہو کہ اگر ساری ہی عورتیں بے نمازی ہوں۔ تو کیا کریں۔ پھر کس سے پکوائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سے

دنیا بھر تو تمہاری محکوم نہیں ہے ۔۔۔ تمہیں تو اپنے گھر کے لئے کہا جارہا ہے

اور اگر ہمت ہو تو سب کے ہی ساتھ یہ معاملہ کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری ہمت کی برکت سے ساری کی ساری ہی نمازی بن جاویں گی۔

اخلاص کی برکت

اس ہمت کی برکت پر ایک حکایت یاد آئی۔ کہ ایک بزرگ تھے کہ لمبے سفر میں تو نماز و جماعت کے خیال سے ایک دو آدمی کو ہمراہ رکھتے تھے اور چھوٹے سفر میں ایسے انداز سے سفر کرتے تھے۔ کہ نماز کے وقت منزل پر پہنچ جاویں۔ اتفاق سے ایک چھوٹے سفر میں راستہ میں کچھ حرج ہو گیا اور ظہر کا وقت آگیا۔ گاڑی بان ہندو تھا۔ انہوں نے وضو کیا، سنتیں پڑھیں۔ کوئی اور نمازی نہ دکھائی دیا۔ انہوں نے دعا مانگی۔ کہ اے اللہ ہمیشہ میں جماعت سے نماز پڑھتا ہوں اور اس وقت میں مجبور ہوں۔

اگر آپ چاہیں۔ تو اس وقت بھی جماعت سے مشرف کر سکتے ہیں۔ مصلیٰ بچھا کے یہ دعا ہی کر رہے تھے۔ کہ گاڑی بان سامنے آیا۔ کہ میاں مجھے تم مسلمان کر لو۔ بڑی مسرت ہوئی۔ سمجھ گئے کہ دعا قبول ہو گئی۔ کیا پوچھنا ہے اس مسرت کا۔ وجد ہو رہا ہو گا۔ اسی وقت مسلمان کیا اور وضو کرا کر کہا۔ کہ جس طرح میں کروں۔ اُسی طرح تو بھی کر اور سب ارکان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہ۔ دیکھئے یہ برکت تھی ہمت کی۔

اور اس طرح محض سبحان اللہ سبحان اللہ سے ہماری نماز تو نہیں ہو گی۔ مگر نومسلم کی ہو جا رہے گی۔ جب تک اسے سورتیں اور دعائیں یاد نہ ہوں جتنی جتنی یاد ہوتی جائیں، اُتنی اُتنی اسے بھی پڑھنا واجب ہو گا اور بقیہ مواقع میں سے جس موقع کی دعا یا ذکر یاد نہ ہوئی ہو، وہاں سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ لینا کافی ہو گا۔

دیکھئے شریعت نہایت آسان ہے، مجبوری میں زبردستی نہیں ہے۔ آسان یہ یاد آیا۔ کہ بعض دیہات میں اس قدر دین کی کمی ہے۔ کہ کوئی جنازہ کی نماز تک نہیں جانتا۔ ایک جگہ کی متعلق مجھے یہ معلوم ہوا۔ کہ جنازہ کو بے نماز پڑھے دفن کر دیا۔ یہ سُن کے میرا بہت دل دُکھا۔ میں نے اُن کی آسانی کے لیئے شریعت کا مسئلہ عام مجمع میں ظاہر کیا۔ کہ جب تک جنازہ کی نماز کی دُعا یاد نہ ہو۔ اس ترکیب سے جنازہ کی نماز پڑھ لیا کرو۔ کہ وضو استقبال قبلہ اور حضور میت تو شرط ہے۔ اور سب سہل ہیں۔ مگر ارکان صرف تکبیرات اربعہ ہیں اور شرط کے بعد رکن کے ادا ہو جانے سے عبادت ادا ہو جاتی ہے۔ تو میت کو روبرو رکھ کر چار مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کے سلام پھیر لیا کرو۔ بس نماز ہو گئی۔

ان ظالموں نے بجائے قدر کرنے کے اعتراض شروع کر دیا۔ کہ خوب نماز بتلائی۔ یہ تو ہم نے کبھی سُنا ہی نہ تھا۔ یہ خوب جاہلوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سُنا۔ ارے کیا سب مسئلے تمہارے سُننے ہی میں آنا ضروری ہیں؟ اگر

سب مسئلے سن لیتے۔ تو تم بھی عالم ہی نہ ہو جاتے۔ جیسے کوئی مکھی کہے۔ کہ حلوائی بڑا بیوقوف ہے۔ اس نے فضول اس قدر لڈو بنا ڈالے۔ ارے میرے پیٹ بھرنے کو تو جلیبی کا شیرہ ہی کافی تھا۔ اسی طرح جو چیز ان کی سُنی ہوئی نہ ہو۔ بس وہ فضول ہے اور جو چیز ان کے علم سے خارج ہو بس وہ سب کفر ہی نہیں ہے۔

خیر یہ کلام تو استطرادی تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان بنیئے کے خلوص کی برکت ہے خدا نے ہندو کو کیا مسلمان کر دیا۔ اسی طرح آپ کو بھی خلوص کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ پھر سب کی سب نمازی ہو کر روٹیاں پکا پکا کر کھلائیں گی۔

قربانی پر ثمرہ

پہلے امتحان تو دو پھر نتیجہ نکلے گا۔ گو قدرے مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔ اس پر بطور لطیفہ کے ایک شخص کا قصہ یاد آیا۔ کہ اُس نے کسی واعظ سے سُن لیا۔ کہ سب کو خدا دیتا ہے۔ خدا ہی پر توکل اور بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ بس یہ سُن کر جنگل میں جا بیٹھے۔ کہ اب ہم بھی توکل کریں گے۔ کیا خوب سمجھے۔ توکل کو اب ایک وقت گزرا، دوسرا وقت گزرا، کہیں کھانے کا پتہ نہیں۔ وہاں ایک کنواں بھی تھا۔ اتفاقاً ایک مسافر آیا، کنویں پر بیٹھا اور سڑک کی طرف منہ کر کے بیٹھا۔ ان کی طرف منہ بھی نہیں کیا اور کھایا پیا چلتا ہوا۔ دوسرا آیا وہ بھی کھا پی، یہ جا وہ جا۔ اب جب کئی وقت گزر گئے اور انہیں بھوک کی تاب نہ رہی۔ تو سوچا کیا کروں۔ آخر ایک اور مسافر آ کے بیٹھا اور وہ بھی جب کھا پی چلنے کو ہوا۔ تو ان متوکل نے کھنکھارا۔ اس نے منہ پھیر کر دیکھا تو بجد پریشان صورت۔ اس کو ترس آیا اور روٹیاں حوالہ کیں۔

اب یہ کھا کے مولوی صاحب کے پاس پہنچے اور کہنے لگے۔ کہ آپ نے وعظ میں توکل کے متعلق جو کچھ بیان کیا۔ وہ بہت ٹھیک ہے۔ مگر اس میں ایک بات چھوڑ دی۔ وہ یہ کہ کھنکھارنا بھی پڑتا ہے۔ تو یہ کیا وعظ ہے۔ کہ ایک بات

کہی اور ایک بات چھوڑ دی۔ جس سے عمل کرنے والے کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تو حضرت پہلے امتحان تو دیجئے۔ پھر ثمرہ دیکھئے۔ یہ دشواریاں تو امتحان کی ہیں۔ جب امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ تو پھر انعام لو۔ غرض امر بالمعروف میں کچھ مشقتیں بھی پیش آتی ہیں۔ ان کو سہو انشاء اللہ تعالیٰ برکت ہوگی۔ مگر ہم نے تو اس کو متروک ہی کر دیا۔ یہ تو بی بی کو نماز کا حکم کرنے کا ذکر تھا۔

اسی طرح اولاد کو نہ نماز پر کچھ کہتے ہیں نہ اور احکام پر۔ ہاں اگر بچہ اسکول میں فیل ہو جاتے تو آپ اس کو بے حد ملامت کرتے ہیں اور اسی ملامت کے خیال سے بچے بھی خوب محنت کرتے ہیں اور ملامت بھی اس درجہ کی کرتے ہیں۔ کہ اس کا تحمل کر کے بعضے اسی ندامت میں جان تک دے دیتے ہیں چنانچہ یہاں کانپور ہی کا واقعہ ہے۔ کہ ایک لڑکا فیل ہو گیا تھا۔ جا کے ریل کی پٹری پہ لیٹ گیا۔ ریل آئی کٹ گیا۔ اسی طرح ایک لڑکے نے اٹاوہ میں افیون کھا کے جان دے دی تھی۔ یہ تو اسکول کے امتحان کی مقصودیت کی کیفیت ہے لیکن اگر صاحب زادہ نماز پر نماز قضا کرتے چلے جائیں۔ تو آبا جان مارے محبت کے کچھ نہ کہیں گے۔ الغرض دعوتِ الی اللہ کا اہتمام ہی دل سے نکل گیا۔

درجاتِ دعوت

اب سمجھئے اس دعوت کے بھی درجے مختلف ہیں۔ جو جس درجہ کا اہل ہو۔ ویسا ہی اہتمام کرے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ ہر شخص سب درجوں کا اہتمام کرے اس کا پتہ اس آیت سے چلتا ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

فرماتے ہیں تمہارے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے۔ جو دعوۃ الی الخیر کرے اور امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک خاص جماعت کا کام ہے۔ ساری امت کا کام نہیں ہے اور دعوت الی الخیر اور دعوت الی اللہ کے ایک ہی معنی ہیں۔ سو اس میں تو اس کو صرف ایک خاص جماعت کا کام فرمایا گیا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

کہ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے بُلاتا ہوں میں اللہ کی طرف بصیرت پر ہو کر میں اور جتنے میرے متبع ہیں اور حق تعالیٰ تمام بُرائیوں سے پاک ہیں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ دیکھئے یہاں پر مطلقاً ومن اتبعنی ہے۔ یعنی جتنے میرے متبع ہیں، سب حق کی طرف بُلاتے ہیں۔ اس میں عموم ہے۔

اس خصوص اور اس عموم سے معلوم ہوا کہ اس کے درجات ومراتب ہیں۔ ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک درجہ کا دوسری آیت میں اور وہ درجات دو ہیں۔ ایک دعوتِ عامہ، ایک دعوتِ خاصہ، پھر دعوتِ عامہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دعوتِ حقیقیہ اور ایک دعوتِ حکمیہ۔ دعوتِ حکمیہ وہ جو کہ معین ہو دعوتِ حقیقیہ میں۔ میں نے آسانی کے لیئے یہ لقب تجویز کیئے ہیں۔ ان میں اصل دو ہی قسمیں ہیں دعوت الی اللہ کی۔ دعوتِ عامہ، دعوتِ خاصہ۔ اور ایک قسم معین ہے دعوتِ عامہ کی۔ تو اسی طرح یہ کل تین قسمیں ہو گئیں۔ تو ہر شخص کے متعلق جدا جدا مرتبہ کے لحاظ سے ایک ایک دعوت ہوگی۔

چنانچہ دعوتِ خاصہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور وہ وہ ہے۔ جس میں خطاب خاص ہو اپنے اہل وعیال کو، دوست احباب کو اور جہاں جہاں قدرت ہو اور خود اپنے نفس کو بھی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کلکم راع و

عمر فاروق@وِن اردو

کلکم مسئول کہ تم میں کا ہر ایک راعی (نگران) ہے اور تم میں کا ہر ایک (قیامت میں) پوچھا جائے گا۔ کہ رعیت کے ساتھ کیا کیا۔ یہ دعوت خاصہ ہے اور قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے :۔

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا۔

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچاؤ۔ یہ بھی دعوت خاصہ ہے۔ کہ اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچانے کا حکم ہے۔ سو اس کا تو ہر شخص کو اپنے گھر میں اور تعلقات کے محل میں اہتمام کرنا چاہیئے۔

عمومی دعوت میں تخصیص کا راز

اور ایک دعوت عامہ ہے۔ جس میں خطاب عام ہو۔ یہ کام ہے صرف مقتداؤں کا۔ جیسا کہ ولتکن منکم امۃ الآیۃ سے معلوم ہو رہا ہے اور اس تخصیص میں ایک راز ہے۔ وہ یہ کہ دعوت عامہ (یعنی وعظ) اسی وقت مؤثر ہوتی ہے۔ کہ جب مخاطب کے قلب میں داعی کی وقعت ہو۔ بلکہ مطلق دعوت میں بھی اگر داعی کی وقعت نہ ہو تو وہ مؤثر نہیں ہوتی۔ تو عام دعوت میں عام مخاطبین کے قلب میں داعی کی وقعت ہونی چاہیئے اور ظاہر ہے۔ کہ بجز مقتداؤں کے کوئی ایسا شخص نہیں ہے۔ جو عام لوگوں کے دل پر اثر ڈال سکے اور ایسے لوگ کتنے ہوتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہوں۔ کہ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ اور یہ سمجھتے ہوں۔ کہ ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش　　ور نبشت است پند بر دیوار

(انسان کو چاہیئے۔ کہ نصیحت پر عمل کرے۔ وہ نصیحت کی بات خواہ دیوار پر لکھی ہوئی کیوں نہ ہو)

تو ایسے لوگ تو بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ورنہ عموماً یہ دیکھتے ہیں۔ کہ واعظ

یا داعی با وقعت ہے یا نہیں. اگر وقعت نہیں ہوتی تو یہ شبہ ہو جاتا ہے ۔ کہ جب ہمارے برابر کا ہو کے ہم کو نصیحت کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ترفع چاہتا ہے اور ہم سے بڑا بننا چاہتا ہے اور واقع میں اکثر ہوتا بھی یہی ہے۔

اس وجہ سے دعوت عام میں مقتدا ہونے کی ضرورت ہے۔

اور یہی وجہ ہے. کہ امامت کبریٰ میں حدیث الائمۃ من قریش میں قریش کی خصوصیت کی گئی ہے. اس میں بھی یہی حکمت ہے ۔ کہ چونکہ قریشی خاندانی ہیں اُن کی ماتحتی سے کسی کو عار نہیں ہو گی۔ اسی نص سے استناد کر کے باجماع صحابہ امامتِ کبریٰ انہیں کے لیئے مخصوص کر دی گئی ۔ اور یہی راز ہے. کہ انبیاء علیہم السلام نہایت عالی خاندان ہوئے ہیں۔ وجہ یہ کہ نبی بھی امام عام ہوتا ہے. اگر چھوٹے خاندان کا کوئی نبی ہوتا۔ تو جو مدعی شرافت کے تھے. وہ بوجہ کبر کے اُسے خاطر میں نہ لاتے۔ اسی لیئے تمام انبیاء علیہم السلام عالی خاندان ہوئے۔

عمومی دعوت کا اہل

اسی طرح دعوتِ عامہ میں داعی کو بھی مقتدا ہونا چاہیئے. جس کے لیئے عالم ہونا بھی لازم ہے۔

دوسرے اس لیئے بھی مقتدا کو عالم ہونے کی ضرورت ہے کہ خطاب عام کرتا ہوا یعنی وعظ کہتا ہوا دیکھ کر لوگ یہی سمجھیں گے۔ کہ یہ دین کے مقتدا اور عالم ہیں اور یہ سمجھ کے ان سے شرعی اور فقہی مسائل پوچھیں گے اور یہاں مسائل کے نام صفر ہو گا اور اتنی ہمت نہ ہو گی۔ کہ کہہ دیں کہ ہم کو معلوم نہیں اور ہر وقت ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ ٹال دیا کریں۔ لامحالہ اس حدیث کا مضمون واقع ہو گا۔

فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔ یعنی بغیر علم کے جو جی میں آئے گا، فتوے دے دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

عمر فاروق@ون اردو

اور ٹالنے کی ترکیب پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک طالب علم تھا۔ کتابیں پڑھ کے اپنے گھر چلا۔ تو استاد سے پوچھا کہ حضرت یہ تو آپ جانتے ہیں۔ کہ مجھے آتا جاتا خاک بھی نہیں مگر وہاں لوگ عالم سمجھ کے مسائل پوچھیں گے تو کیا کروں گا؟ استاد تھے بڑے ذہین۔ انہوں نے کہا کہ ہر سوال کے جواب میں یہ کہہ دیا کرنا۔ کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور واقع میں کوئی مسئلہ مشکل سے ایسا ہوگا۔ جس میں اختلاف نہ ہو۔ سوائے عقائد توحید و رسالت وغیرہ۔ تو ہر بات کا یہی جواب دے دینا کہ اس میں اختلاف ہے۔

جیسے تھیٹر میں ایک شخص نے اشتہار دیا تھا۔ کہ آج ایک نیا تماشا ہوگا کہ حاضرین کسی علم اور کسی فن کا ہو۔ سوال کریں، ہم اس کا جواب دیں گے۔ بس جناب لوگ بڑے بڑے مشکل سوال چھانٹ کے تھیٹر پہنچے۔ کوئی عربی میں، کوئی انگریزی میں، کوئی اردو میں، کوئی فارسی میں۔ غرض ہر زبان میں ہر فن کے سوالات ذہن میں لے کر پہنچے۔ وہ حضرت پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور سب کے سوالات باری باری سننے شروع کیے۔ ساری رات ان سوالات ہی میں ختم ہو گئی۔

اور سوالات بھی ختم ہوئے۔ تو آپ نے کہا۔ سنیئے صاحب اب سوالات کا وقت ختم ہو گیا۔ اب میرا جواب سنیے۔ لوگ نہایت اشتیاق سے متوجہ ہوئے آپ فرماتے ہیں۔ کہ وہ جواب یہ ہے۔ کہ مجھے کسی کا بھی جواب معلوم نہیں۔ کیوں صاحب! کیا ٹھیک جواب ہے۔ کہ نہ تو اس پر کوئی خدشہ وارد ہوتا ہے، نہ کسی اعتراض کی گنجائش ہے۔ اور ہر سوال پر منطبق لوگ بے چارے جھنجلا کے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ کہ مفت میں نیند بھی خراب ہوئی اور ٹکٹ کے دام بھی گئے۔

ایسے ہی انہوں نے ہر سوال کے جواب کے لیئے یہ یاد کر لیا۔ کہ اس میں اختلاف ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں میں ان کی ہیبت بیٹھ گئی۔ کہ بڑا عالم

متبحر ہے، بڑا وسیع النظر ہے۔ مگر فوق کُلِّ ذِی عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔ کوئی صاحب یہ کہہ گئے کہ اس نے سب کو بند کر رکھا ہے۔ آ کر کہا مولانا مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ انہوں نے کہا فرمایئے۔ کہا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ کہنے لگے کہ اس میں اختلاف ہے۔ بس آپ کی قلعی کھل گئی۔ تو غرض ایسی ترکیب ٹال دینے کی ہر وقت سمجھ میں نہیں آتی۔

ایسے ہی کسی نے ایک معقولی طالب علم سے مسئلہ پوچھا کہ گلہری کنویں میں گر پڑی ہے پاک کرنے کے لئے کتنے ڈول نکالے جاویں۔ یہ بے چارے نری معقول جانتے تھے، فقہ کی خبر نہ تھی۔ اب آپ نے اپنا جہل چھپانے کے لئے اس سے پوچھا کہ گلہری جو گری ہے دو حال سے خالی نہیں۔ یا خود گری یا کسی نے گرا دی۔ پھر اگر خود گری ہے تو دو حال سے خالی نہیں۔ دوڑ کے گری یا آہستہ گری۔ اور اگر کسی نے گرائی ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا آدمی نے گرائی۔ یا جانور نے۔ اور ہر ایک کا جدا حکم ہے۔ تو اب بتلاؤ کیا صورت ہوئی۔ سائل نے پریشان ہو کر کہا۔ کہ صاحب اس کی تو خبر نہیں۔ کہنے لگے پھر کیا جواب دیں اور یہ جھوٹ بولا۔ کہ ہر شق کا جدا حکم ہے۔ جدا حکم کیا ہوتا۔ سب کا حکم ایک ہی ہے۔ وہ بے چارہ گھبرا کے چل دیا۔ کہ ان کی منطق کا کیا جواب دے۔ تو یہ محض ترکیبیں ہیں اور یہ بھی بعضوں کو تو آتی ہیں اور بعضوں کو نہیں آتیں۔ جسے نہیں آتیں وہ کیا کرے گا۔ کہ غلط سلط مسئلہ بتا دے گا۔ یہ خرابی ہو گی۔ جاہل کے داعی عامہ یعنی واعظ بننے میں۔ اس لئے فرمایا۔ کہ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ الآیۃ۔ کہ تم سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے۔ یہ سب گفتگو خطاب عامہ میں ہے۔

بہرحال جن کو خطاب عام کی اہلیت حاصل ہے۔ وہ خطاب عام کریں۔ ورنہ خطاب خاص پھر خطاب عام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی، ایک حکمی حقیقی یہ کہ وہ مخاطبین کو خواہ اہل اسلام ہوں یا غیر اہل اسلام ان کو وعظ سنا دے اور حکمی یہ کہ تبلیغ و نشر کرنے والوں کی اعانت کرے۔ تاکہ وہ حوائج سے مستغنی ہو کر

عمر فاروق@ون اردو

تبلیغ کر سکیں۔ تو یہ اعانت بھی مقصود کے ساتھ ملحق ہو گی۔ اسی لیئے اس کو دعوت حکمی کہا۔

انواعِ دعوت

یہ اقسام تو باعتبار دعوت کے عموم و خصوص یا مقصودیت و الحاق تھے۔ اب باعتبار نوع دعوت کے داعی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے۔ جو جواب تحقیقی سے دعوت کر سکتا ہے اور ایک وہ ہے، جو جواب الزامی سے دعوت کر سکتا ہے۔ جواب تحقیقی کے یہ معنی ہیں۔ کہ کسی نے جو کچھ پوچھا جواب میں اس کی حقیقت کو واضح کر دیا اور جواب الزامی کے یہ معنی ہیں۔ کہ جو اعتراض ہم پر کسی نے کیا۔ ہم نے ویسا ہی اعتراض اس کے مذہب پر کر دیا۔ کہ جو جواب تم ہمیں دو گے۔ بعینہ وہی جواب ہماری طرف سے تمہارے اعتراض کا ہو گا۔

اب ان دونوں میں سے ہر ایک کے لوازم و شرائط کو سمجھنا چاہیئے۔ جواب تحقیقی کے لیئے اپنے مذہب پر پورا عبور ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسرے کے مذہب پر پوری نظر ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور جواب الزامی کے لیئے اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دوسرے کے مذہب پر بھی پوری نظر ضروری ہے اب اس اعتبار سے داعی دو قسم کے ہوئے۔ ایک وہ جو اپنے مذہب پر پوری نظر رکھتے ہیں اور دوسرے وہ کہ دوسرے کے مذہب پر پوری نظر رکھتے ہیں۔ چونکہ اس وقت مناظرہ میں مخالفین کے مقابلہ میں الزامی جواب زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اس لیئے داعین میں جو جماعت دوسرے مذہب پر پوری نظر رکھتی ہو۔ وہ مخالفین سے مناظرہ کرے۔ ان کی یہی دعوت ہے اور جو اپنے مذہب پر پوری نظر رکھتی ہو اسے چاہیئے کہ وعظ و تلقین اپنے مذہب والوں کو کرے۔ تو اس بناء پر داعین کی دو جماعتیں ہو گئیں۔ ایک واعظین کہ جو اپنے مذہب والوں کو تحقیق سے متنبہ کیا کریں اور ایک مناظرین کہ جو الزامی جواب سے مخالفین کو ساکت کیا کریں۔

عمر فاروق @ وَن اردو

کیونکہ جواب تحقیقی مسلمانوں کو زیادہ نافع ہوں گے اور الزامی غیر مذہب والوں کو زیادہ مفید ہوں گے اور ان لوگوں کو بھی مفید ہوں گے۔ جو مائل ہیں، غیر مذہب کی طرف۔ خلاصہ یہ کہ خطاب خاص تو سب کو یکساں اپنے اپنے گھروں میں کرنا چاہیئے اور خطاب عام میں ایک تو ایسے لوگ ہوں۔ کہ وعظ کہا کریں۔ جو اہل اسلام کے مناسب ہو۔ تاکہ مسلمانوں کی اصلاح ہو اور ایک وہ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں۔ جن کو اسلام پر شبہ ہو گیا ہو یا اسلام سے تعلق کم ہو گیا ہو یا وہ غیر مسلم ہوں۔ تاکہ اسلام کی طرف آجاویں۔

اب اس جماعت داعین عامہ کی کچھ ضروریات بشریہ بھی ہوں گے۔ اس لئے ان کے علاوہ ایک اور جماعت مسلمانوں کی ایسی ہونی چاہیئے۔ جو اس جماعت کی ضروریات مہیا کریں اور مبلغین کے لئے سامان جمع کریں۔ تاکہ وہ اپنے فرض منصبی میں بے فکری سے مشغول ہو سکیں۔ اب چونکہ سرے سے دعوت الی اللہ ہی کا اہتمام نہیں ہے۔ اس لئے کوئی جماعت بھی نہیں ہے نہ دعوت خاصہ والے لوگ اپنے گھروں میں اصلاح کریں نہ دعوت عامہ کی۔ کہ اپنے بھائیوں کی فکر کریں یا جو مذہب میں پختہ ہیں ان کی خبر لیں۔ جو کہ ایک اعتبار سے اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ قابل توجہ ہیں۔ کیونکہ جو اپنے بھائی ہیں۔ وہ تو آپ آکر اپنی ضروریات پوچھ لیں گے۔ مگر جو مذبذبین ہیں۔ اُن کے گھر پر ہمیں جانا ہو گا۔ اور خاص کر اس وقت جب کہ دوسرے لوگ انہیں اسلام سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چنانچہ اس وقت بھی آپ نے سُنا ہو گا۔ کہ آگرہ وکانپور وغیرہ کے اطراف میں ایک جماعت نو مسلموں کی ہے۔ وہ مخالفین کے اغواء سے اسلام سے نکل رہے ہیں۔

افسوس! دوسروں کو تو ہم اپنے مذہب میں کیا لاتے۔ اپنے ہی بھائیوں کو اپنے مذہب میں نہیں رکھ سکتے۔ خدانخواستہ اگر یہی نوبت رہی تو آج تو نو مسلموں پر مشق ہے۔ اگر مخالفین کا حوصلہ بڑھ گیا۔ تو کل وہ پرانے

مسلمانوں کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کریں گے۔ (عیاذاً باللہ) چنانچہ آپ نے قصے سنے ہوں گے۔ کہ بعض پرانے مسلمان عیسائی ہو گئے۔ آریہ ہو گئے اگرچہ وہ چند ہی سہی اور طمع زر یا طمع زن ہی سے سہی۔ مگر ہمارے رونے کے لئے تو ایک بھائی کا کم ہو جانا بھی کافی ہے۔ تو اگر ان مغویٰن کو ان نو مسلموں کے بارے میں خدانخواستہ کامیابی ہو گئی۔ تو اندیشہ ہے۔ کہ وہ ہماری طرف بھی متوجہ ہوں گے۔

جوڑ کی ضرورت

مگر ان سب تدابیر میں سخت ضرورت باہمی اتفاق کی ہے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ مسلمانوں میں جہل کے ساتھ نا اتفاقی بھی حد درجہ کی ہے۔ اس حسد اور نا اتفاقی کی بدولت اپنا آپ نقصان کئے لیتے ہیں۔ غضب تو یہ ہو رہا ہے۔ کہ بعضے مبلغین دوسری جماعت مبلغین کی مذمت کر کے ان ناواقف بے خبر نو مسلموں کو ان کی اتباع کرنے سے روک رہے ہیں۔ بھائی اس وقت تو مشترک تعلیم اسلام کی ضروری ہے۔ عقائد و فروع کا اختلاف پھر دیکھا جاوے گا یا تعلیم اسلام میں بھی دو حیثیت ہیں میرا سکھلایا ہوا اسلام حق اور دوسرے کا سکھلایا ہوا باطل۔ جیسے کہ دو طالب علم تھے اور دونوں سگے بھائی تھے۔ آپس میں لڑے اور ایک نے دوسرے کو ماں کی گالی دی۔ کسی نے کہا۔ کہ ارے کمبخت وہ تیری بھی تو ماں ہے۔ تو کہنے لگا۔ کہ اس میں دو حیثیت ہیں۔ ایک یہ کہ میری ماں ہے اس حیثیت سے تو معظمہ مکرمہ۔ اور ایک یہ کہ وہ اس کی ماں ہے۔ اس حیثیت سے وہ ایسی اور ویسی گیا۔ اسلام میں بھی دو حیثیتیں بنا لیں۔ ایک یہ کہ میں سکھاؤں اس حیثیت سے اسلام برحق ہے۔ ایک یہ کہ تو سکھا دے اس حیثیت سے برحق نہیں۔ اگر یہ ہے تو خیر تم ہی اسلام سکھاؤ۔ لیکن اگر خود ہمت نہ ہو تو دوسروں کو سکھلانے دو۔ یہ کیا خرافات ہے۔ کہ نہ خود سکھاؤ اور نہ کسی اور

کو سکھانے دو۔

اس پر عذر کی ایک حکایت یاد آ گئی۔ کہ کسی میدان میں بہت سے مقتول پڑے تھے۔ ان میں ایک زخمی بھی تھا۔ رات آتی ہوئی دیکھ کر اکیلے مُردوں میں پڑے پڑے اس کا جی گھبرایا۔ کہ اندھیری رات مُردوں کے ڈھیر۔ نہ کسی سے بات کے نہ چیت کے۔ اُدھر سے جو آدمی نکلتا ہے۔ یہ اس کو بلاتا ہے۔ مگر کوئی نہیں آتا اور واقعی اس بھیانک منظر میں کون ٹھہرے۔ اتفاق سے ایک بنیا آتا ہوا معلوم ہوا۔ اس نے دُور سے پکارا۔ اے لالہ جی اے لالہ جی! آواز سُن کر لگا بھاگنے۔ سمجھا کہ کوئی بھوت ہے۔ مگر کئی بار کے پکارنے میں دُور ہی سے بولا کیا ہے۔ اس نے کہا ڈرو مت، اِدھر آؤ۔ میری کمر میں ایک ہمیانی روپوں کی بندھی ہے۔ اُسے کھول کے تم لے جاؤ۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا اور معلوم نہیں کس کے ہاتھ آوے گی۔

یہ لوگ ہوتے ہیں لالچی۔ ٹھہر گیا اور ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ جب نزدیک پہنچا۔ تو اس نے کمر سے تلوار نکال کے پیروں پر اس زور سے ہاتھ دیا۔ کہ ٹانگیں کٹ گئیں۔ مگر لالچ میں پھر بھی ہمیانی ٹٹولی۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ کہنے لگا ارے یہ کیا کیا؟ اس نے کہا کہ کیا کیا، جی گھبراتا تھا جس کو بلاتے تھے کوئی ٹھہرتا نہ تھا۔ اس ترکیب سے تم کو اپنے پاس رات کو رکھا ہے۔ اب ہم تم مل کے باتیں کریں گے۔ تو لالہ جی کیا کہتے ہیں۔ واہ رے اُوت کے اُوت نکما نکما نہ آپ چلے نہ اور کو چلنے دے۔

تو یہی حالت ہماری ہے۔ کہ نہ آپ کام کریں اور نہ کسی کام کرنے والے کو کرنے دیں۔ عیب نکالتے ہیں کہ یہ تو بد مذہب ہے، بدعقیدہ ہے۔ اگر اس نے کسی کو مسلمان بنا لیا۔ تو وہ ایسا ہی ہو گا جیسا یہ۔ پھر ایسا مسلمان بنانے سے کیا فائدہ؟ ارے بھائی! مسلمان تو بنا لینے دو۔ پھر تم جا کے اپنے عقائد سکھا دینا۔ بہرحال اتفاق کے ساتھ دعوت الی الاسلام کا کام کرنا نہایت اہم اور ضروری ہے۔

اور نہایت اہم ہونے کا یہ مطلب نہیں۔ کہ اور سب شعبے دعوت کے چھوڑ دو سب کرو۔

اور اس کام کے لیئے جنہیں مناظرہ میں مہارت ہو۔ وہ زیادہ موزوں ہوں گے۔ انہیں منتخب کر لو اور جو لوگ غیر مذہب کا علم نہیں رکھتے۔ انہیں مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح کے لیئے رہنے دو اور جو بے علم ہیں۔ کہ نہ اپنے مذہب پر نظر ہے نہ دوسرے کے مذہب پر۔ وہ دعوت حکمیہ کریں۔ یعنی مبلغین کے لیئے وہ سرمایہ جمع کریں۔ تاکہ اس سرمایہ سے یہ کام کیئے جائیں۔ یعنی ضروری چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپ کے ان لوگوں میں بانٹی جائیں اور قرآن اور روزمرہ کی ضروریات دین کے مدرسے قائم کیئے جائیں۔ مبلغین کی تنخواہیں دی جاویں۔ اگر اس ترکیب سے انتظام کیا جاوے گا۔ تو نئی نسل تو یقیناً اچھی ہو گی۔ کہ انہیں شروع ہی سے دین سے مناسبت ہو گی۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ پرانی نسل پر بھی معتدبہ درجہ میں اس کا اچھا اثر پڑے گا۔

چنانچہ یہاں بھی یتیم خانہ میں دعوت حکمیہ کا انتظام کیا گیا ہے اور جب تک کوئی مستقل تحصیلدار مشورہ سے معین ہو۔ اس کے متعلق تمام چندہ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو دینا چاہیئے اور چونکہ وہ ہر وقت نہیں ملتے۔ اس لیئے انہوں نے یتیم خانہ میں اپنے معتبر نائب مقرر کر دیئے ہیں۔ وہ روپیہ لے کے رسید دیں گے۔ اور دینے میں قلیل و کثیر کا خیال نہیں ہونا چاہیئے۔ جو ہو سکے وہ دو۔ خواہ روپیہ ہو خواہ پیسہ۔ بہر حال کچھ بھی ہو عند اللہ اس کی بھی بڑی وقعت ہے۔

دعوت کا آخری درجہ

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک جماعت ایسی بھی تو ہے۔ جس کے پاس نہ علم ہے نہ مال۔ پھر وہ کیسے اس دعوت میں حصہ لے۔ اس کا جواب یہ ہے۔

؎ لا خیل عندک تہدیہا و لا مال

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

یعنی اگر علم اور مال نہیں ہے تو خالی زبان تو ہے۔ اس سے کام کرو۔ باقی یہ کہ زبان سے کیا کام کریں۔ تو زبان سے دعا کیا کرو۔ کہ اے اللہ! اسلام کو عزت دیجئے۔ اے اللہ اسلام کی نصرت کیجئے۔ اور اے اللہ مسلمانوں کے دین کی حفاظت کیجئے۔ اے اللہ حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیجئے اور دین کے برکات کو عام اور تام کر دیجئے۔ تو بھائی یہ تو ایسی دعوت ہے۔ کہ اس سے تو کوئی بھی نہیں گیا گزرا۔ مگر افسوس بہتوں سے یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بات کیا ہے کہ دل کو نہیں لگی۔

خلاصہ یہ کہ جب سب مل کے اپنی اپنی خدمت میں لگیں گے۔ تب کہیں ثمرہ مرتب ہوگا۔ اور بفرض محال ثمرہ نہ بھی مرتب ہو تو تم تو اپنے کام میں لگو۔ جو تمہارا کام ہے۔ باقی دینا نہ دینا اُن کا کام ہے۔ وہ یہ کہ ان آیات سے یہ تو سب کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ داعی میں دعوت کے ساتھ عمل صالح اور عمل صالح کے ساتھ تواضع و انتقار بھی ہونا ضروری ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں اور دیکھ کر سخت شرم اور افسوس ہوتا ہے۔ کہ اسلامی کام اکثر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ جن پر عمل صالح تو کیا صادق آتا، آمن بھی مشکل سے صادق آتا ہے۔ یعنی مدعی تو ہیں خدمتِ اسلام کے اور کفر کے کلمے بکتے ہیں۔ علماء کی تضحیک و توہین کرتے ہیں۔ دین کا استخفاف کرتے ہیں اور پھر اسلام کی خدمت کے مدعی بنتے ہیں۔ دین کے حامی بنتے ہیں۔ گھر میں تو یزید ہیں اور پلیٹ فارم پر بایزید۔

داعی کو متقی ہونا چاہیے

یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے کاموں میں فلاح نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ کہ قیامت کب آوے گی۔ آپ نے فرمایا۔ جب کام غیر اہل کے سپرد ہوگا۔ ہیں خادمانِ اسلام کو خدمت چھوڑنے کے لیے نہیں کہتا

بلکہ یہ کہتا ہوں۔ کہ وہ خود بھی عمل صالح کے پابند ہو جاویں۔ مگر سارے نہیں کہ مجمع کو دکھانے کو نماز پڑھ لی یا گھر میں بھی پڑھی۔ مگر اس خیال سے کہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ پھر جب اس خدمت کے عہدہ سے استعفیٰ دیا۔ اللہ میاں کو بھی نماز سے استعفیٰ دیا۔

جیسے ایک گنوار کی بھینس مر گئی۔ تو جھٹ سے روزہ توڑ دیا۔ کہ لے اور روزہ رکھوا لے۔ نعوذ باللہ۔ ایک مقام پر ایک مدعی حمایت دین شطرنج کھیل رہے تھے۔ کسی نے دیکھ کے کہا۔ میاں تم تو صدر ہو خلافت کمیٹی کے۔ تمہیں کیا ہوا۔ جو شطرنج کھیل رہے ہو۔ کہنے لگے میاں اس خلافت کمیٹی ہی کی وجہ سے ڈاڑھی رکھ لی۔ نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اب کہتے ہو شطرنج بھی نہ کھیلو۔ تو گویا بالکل ہی بندھ جاؤ۔ سلام ہے ایسی خلافت کمیٹی کو۔ تو جیسی ہماری دیانت ویسی ہی ہمارے کام میں برکت۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اگر ہمارا اسلام واقعی اسلام ہوتا تو کفار ہماری صورت دیکھ دیکھ کے مسلمان ہوا کرتے۔ جیسے ہمارے بزرگوں کے وقت میں ہوا کرتا تھا۔ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھی۔ فرمایا۔ کہ یہ میری زرہ ہے۔ اس نے کہا میری ہے۔ دونوں میں حجت بڑھی۔ اس وقت حضرت شریح قاضی تھے۔ جو حضرت علیؓ کے بالکل محکوم و ماتحت تھے اور پھر یوں بھی تابعی تھے صحابی کے رتبہ کے نہ تھے۔ حضرت علیؓ ان کے اجلاس میں مستغیث ہو کر پہنچے۔ تو اب فرمائیے کہ حضرت علیؓ دعوے کریں۔ تو کون کہہ سکتا ہے۔ کہ دلیل و حجت لاؤ۔ مگر شریح پوچھتے ہیں اس یہودی سے کہ کیا حضرت علیؓ کا دعوے ٹھیک ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ حضرت علیؓ سے کہتے ہیں کہ آپ کا کوئی گواہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ ایک صاحبزادہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور ایک غلام قنبر جنہیں آپ آزاد کر چکے تھے۔ حضرت علیؓ کا یہ مذہب تھا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر ہے۔ اس لیئے حسنؓ کو پیش کیا۔ مگر شریح کا یہ مذہب نہ تھا اور ان کے نزدیک نصاب شہادت پورا نہ

تھا۔ اس وجہ سے مقدمہ خارج کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہایت بشاشش اجلاس سے باہر چلے آئے۔

اُس یہودی نے جو یہ رنگ دیکھا۔ تو اُس پر بڑا اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ اول تو یہ بادشاہ صاحب اختیار اگر چاہتے۔ تو مجھ سے چھین لیتے اور جوتیاں بھی لگاتے۔ مگر نہیں۔ ضابطہ کے موافق قاضی کے یہاں جاتے ہیں۔ جو اُن کا محکوم ہے اور پھر وہ آپ کی شہادت کو رد کر کے مقدمہ خارج کر دیتا ہے اور یہ ذرا بھی چین بجبیں نہیں ہوتے۔ ضرور یہ مذہب حق ہے۔ فوراً زرہ کا اقرار کر لیا۔ اور فوراً ہی تشہد پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر آپ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوا اور وہیں شہید ہوا۔ تو اتنا بڑا دشمن اسلام ذرا سی بات میں مسلمان ہو گیا۔ تو بات کیا تھی۔ فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اخلاق کو دیکھ کر اس پر اثر ہوا۔ اسی طرح اگر ہم بھی پکے مسلمان ہو جائیں۔ تو بہت سے سلیم الطبع کافر ہم کو دیکھ دیکھ کے مسلمان ہو جائیں۔ تو عمل صالح کی اس لیے ضرورت ہے۔ پس جن کے ہاتھ میں دین کی خدمتیں ہیں۔ انہیں ضرور متقی بننا چاہیئے۔ شاید متقی کی حقیقت کوئی نہ سمجھے۔ تو میں مختصر کیوں نہ کہہ دوں۔ کہ عمل کے اعتبار سے مُلّا بننا چاہیئے۔

اکابر کا مذاق

پھر مُلّا بن کر بھی جو ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے۔ کہ اپنی خدمت پر فخر کرتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ انّنی من المسلمین سے معلوم ہو گیا۔ کہ سب کام خدا ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اپنے اوپر نظر نہ کرنی چاہیئے۔ خدا ہی پہ نظر رکھنی چاہیئے۔

تو گویا مُلّا کے ساتھ صوفی بھی بننا چاہیئے۔ دیکھیئے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت خالد کو اس حالت میں سرداری سے معزول کیا

کیا ہے۔ جب کہ وہ کفار کے مقابلہ میں ملک شام میں دمشق کا محاصرہ کیئے ہوتے ہیں جس کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو حضرت خالدؓ کی بعض سخاوتوں کو وہ بے موقع سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ یہ فرماتے تھے۔ کہ لوگوں کو حضرت خالدؓ پر زیادہ نظر ہو گئی ہے، خدا پر کم نظر ہو گئی یہ ٹھیک نہیں۔ غرض شام میں ابو عبیدہؓ کے پاس پروانہ بھیجا۔ کہ میں نے خالدؓ کو معزول کیا اور ان کی جگہ تم کو مقرر کیا۔ یہ نیرے عابد زاہد بزرگ تھے۔ نہ آدابِ جنگ کا خالد کے برابر تجربہ رکھتے تھے اور نہ آن کے برابر قواعدِ جنگ سے واقف تھے اور خالدؓ سیف اللہ اور بڑے مشہور شجاع اور ماہر جنگ تھے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا بھی کہ حضرت یہ کیا کیا۔ آپ نے یہی فرمایا۔ کہ لوگوں کی نظر خالدؓ پر پڑنے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ تھے۔ مجھے ڈر ہوا۔ کہ خالدؓ پر نظر کرنے سے کہیں نصرت میں کمی نہ ہو جائے۔ یہ تھا ہمارے اکابر کا مذاق۔

اب تو اس قدر دہریت بڑھتی جاتی ہے۔ کہ خدا پر نظر ہی نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ تدبیر نہ کرو۔ ہاں یہ کہتا ہوں۔ کہ تدبیر کو قبلہ و کعبہ نہ بناؤ ؎

عقل در اسباب میدارد نظر   عشق می گوید مسبب را نگر

(عقل ظاہری اسباب پر نظر رکھتی ہے۔ عشق کہتا ہے اسباب پیدا کرنے والے پر نظر رکھ)

تدابیر میں اعتدال ہو، افراط نہ ہو۔ القصہ اب حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس پروانہ پہنچا۔ اب ابو عبیدہؓ مارے شرم کے اُن کے سامنے جا کر نہیں کہتے۔ کیونکہ اب تک تو ان کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ اب ان کو ماتحت ہونے کے لیئے کیسے کہیں۔ اس لیئے وہ خط ہی حضرت خالدؓ کے پاس بھیج دیا حضرت خالدؓ خط پڑھ کر خود ابو عبیدہؓ کے پاس آئے اور عرض کیا۔ کہ میں انشاء اللہ آج سے آپ کی اطاعت کروں گا۔ کیونکہ اب آپ ہمارے سردار ہیں اور میں اس عزل کو اپنے لیئے حق تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے قبل مجھے

عمر فاروق @ وِن اردو
اپنی جان پیاری تھی۔ کہ اگر میں نہ ہوں گا۔ تو یہ خدمت کون کرے گا۔ اس لئے بعض خطرات میں پڑنے سے احتیاط کرتا تھا۔ اور اب تو بے فکری ہو گئی۔ اب آپ میرے قتال کی خدمتیں انشاء اللہ تعالیٰ دیکھئے گا۔

اصلاحِ نیت

اور صاحب اب تو یہ حالت ہے کہ جب تک صدر یا سیکرٹری رہے نماز روزہ سب کچھ کرتے رہے اور جب دوسرا صدر ہو گیا۔ تو یہ اپنے شہر کو بھاگ گئے تو خود خدمت سے مقصود منصب ہو گیا۔ جو سرتاسر دین کے لئے اس قدر مضر ہے۔ کہ ایک بزرگ کے ایک مرید تھے۔ ایک عرصہ تک ذکر و شغل کرتے رہے۔ مگر کچھ نفع نہ ہوا۔ ایک دن شیخ سے اپنی حالت عرض کی۔ شیخ نے پوچھا، تمہاری نیت اس ذکر و شغل سے کیا ہے؟ کہا نیت یہ ہے کہ کچھ حاصل ہو جاوے گا۔ تو لوگوں کو نفع پہنچاؤں گا۔ فرمایا توبہ کرو۔ یہ تو شرک ہے۔ جب ہی تو تم کو نفع نہیں ہوتا۔ پہلے ہی سے بڑے بننے کی نیت ہے۔ بس نیت یہ رکھو کہ مرتا ہوں، مٹتا ہوں۔ اپنی درستی چاہتا ہوں۔ پھر چاہے وہ تمہیں مرشد بنا دیں، چاہے نہ بنا دیں۔ تو محققین کے نزدیک یہ نیت بھی مضر ہے کہ لوگوں کی اصلاح کروں گا۔ جب دین کی نیت سے بھی بڑائی ناپسند ہے۔ تو دنیا کے کاموں میں تو بڑائی کا ارادہ کب پسندیدہ ہو گا۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے ساتھ عمل صالح بھی اور تواضع و انکسار بھی ہو۔ چونکہ فتنہ ارتداد کے سبب اس وقت بھی اس مضمون کی خاص ضرورت تھی اور آئندہ بھی عام ضرورت ہے۔ اس لئے تفصیل سے اس کو بیان کر دیا۔

تکملاتِ دعوت

اب آگے بقیہ آیات کا ترجمہ بھی بیان کئے دیتا ہوں۔ ولا تستوی

عمر فاروق @ ون اردو

الحسنۃ ولا السیئۃ۔ یعنی اچھائی اور برائی برابر نہیں ہے۔ یہاں سوال ہوتا ہے۔ کہ اوپر تو دعوت الی اللہ کا ذکر تھا۔ یہاں یہ بیان ہے۔ کہ نیکی بدی برابر نہیں ہے۔ آخر اس جملہ کو سیاق و سباق سے کیا مناسبت۔ آگے ارشاد ہے ادفع بالتی ھی احسن یعنی مدافعت کیجئے۔ اس طریقے سے جو اچھا ہو۔ یہ بھی بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں اخلاق کی تعلیم ہو رہی ہے۔

جواب یہ ہے۔ کہ اصل تعلق تو دعوت الی اللہ کے معمول سے ادفع بالتی ھی احسن کا ہے۔ اس طرح سے کہ جو شخص دعوت کے لیئے کھڑا ہوتا ہے۔ عموماً اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ لوگ برا بھلا کہتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ اس وقت اس میں بھی ہیجان پیدا ہوتا ہو اور یہ بھی بدی کے بدلے بدی کر بیٹھے۔ اس لیئے ایسے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی تعلیم فرماتے ہیں۔ کہ اخلاق درست کرو۔ اپنے میں ضبط اور صبر پیدا کرو۔ یہ معنی ہوئے ادفع بالتی ھی احسن کے۔ یعنی ادفع السیئۃ بالحسنۃ۔ کہ کوئی برائی کرے۔ تو اسے نیکی کرکے دفع کردو۔ پس اصل تعلق تو جملہ ادفع کا ہے۔ باقی لا تستوی الحسنۃ الخ یہ اس کی تمہید ہے یعنی بتلانا تو مقصود ہے ادفع بالتی الخ کا۔ مگر تمہید میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں۔ کہ دیکھو نیکی اور بدی اثر میں برابر نہیں ہوتی۔ یعنی اگر برائی کا انتقام برائی سے لے لیا۔ تو اس کا اثر اور ہوگا۔ اور اگر ٹال دیا۔ تو اس کا اثر اور ہوگا۔ اور وہ اثر یہ ہوگا۔ کہ :۔

فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

جس شخص کے اور تمہارے درمیان میں عداوت تھی۔ وہ ایسا ہو جائے گا جیسے گاڑھا دوست۔ مطلب یہ کہ دعوت الی الاسلام کے لیئے اس کی بھی ضرورت ہے۔ کہ مخالفین بھڑکیں نہیں۔ کیونکہ اگر بھڑکے گا۔ تو اس کا شر اور بڑھے گا۔ پہلے چھپی ہوئی عداوت کرتا تھا۔ تو اب کھلی ہوئی کرے گا۔ تو اس عداوت سے اور شر سے بچنے کی تدبیر یہ ہے۔ کہ ٹال دو اور انتقام لینے کی فکر نہ کرو۔ تو دشمن دوست

بن جاوے گا اور پھر وہ اگر تمہیں مدد بھی نہ دے گا۔ تو تمہاری کوششوں کو روکے گا بھی نہیں۔ اور دعوت الی اللہ کا کام مکمل ہو گا۔

یہاں اس کے متعلق ایک شبہ ہے۔ کہ ہم بعض جگہ دیکھتے ہیں۔ کہ باوجود اس رعایت کے بھی وہ دوست نہیں بنتا۔ بلکہ اپنے شر اور فساد میں اسی طرح سرگرم رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہاں بنا عدہ عقیلہ ایک شرط ملحوظ ہے۔ وہ یہ کہ بشرط سلامۃ الطبع کہ وہ شر سے اس وقت باز رہے گا۔ جبکہ سلیم الطبع ہو۔ اور اگر سلامت طبع کی قید نہ ہو۔ تو اس وقت یہ جواب ہے۔ کہ ولی حمیم نہیں۔ بلکہ کانہ ولی حمیم فرمایا ہے۔ تشبیہ کا حاصل یہ ہو گا۔ کہ کچھ نہ کچھ شر ہی میں کمی نہ رہے گی۔ اور اگر تم انتقام لوگے۔ تو گو اس وقت وہ عدم قدرت کی وجہ سے خاموش ہو جاوے۔ مگر در پردہ کینہ مضمر رکھے گا اور حتی الامکان لوگوں سے تمہارے خلاف سازش کرے گا۔ جس کو غلطی سے آدمی کبھی یوں سمجھ جاتا ہے۔ کہ انتقام اصلح ہوا تو ایک ادب یہ بتایا تبلیغ کا کہ صبر و ضبط سے کام لیا جائے اور جو ناگوار امور مخالفین کی طرف سے پیش آویں، انہیں برداشت کیا جاوے۔ اور یہ مدافعت سیئہ بالحسنۃ چونکہ کام تھا نہایت مشکل اس لیئے اس کی ترغیب کے لیئے فرماتے ہیں:۔

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۔

اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے۔ تو اس مدافعت کی ترغیب دو وجہ سے دلائی گئی ہے۔ ایک باعتبار اخلاق کے کہ ایسا کرنے میں صابرین میں شمار ہو گا۔ اور ایک باعتبار اجر و ثواب کے ایسا کرو گے۔ تو اجر عظیم کے مستحق ہو جاوگے۔

اب اس میں ایک مانع بھی تھا۔ یعنی دشمن شیطان جو ہر وقت لگا ہوا ہے اس کا بھی علاج بتلاتے ہیں:۔

عمر فاروق @ ون اردو

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ۔

اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آوے۔ تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ یعنی بعض اوقات مخالفین کی باتوں پر شیاطین غصہ دلاتے ہیں اور اس وقت صبر کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ تو ایسے وقت کے لیئے فرماتے ہیں۔ کہ فاستعذ باللہ خدا کی پناہ میں چلے جاؤ۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ خدا سے دل سے دعا کرو۔ کہ وہ شیطان کے وسوسہ کو دور کر دے اور صبر پر استقامت دے۔ انہ ھو السمیع العلیم۔ بلاشبہ وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ یعنی وہ تمہاری زبان سے پناہ مانگنے کو بھی سنیں گے۔ اور دل سے پناہ مانگنے کو بھی جانیں گے اور پھر تم کو پناہ دیں گے اور مدد کریں گے اور شیطان کو دفع کر دیں گے۔ ان آیات میں حق تعالیٰ نے پورے پورے آداب اور تکملات دعوت الی اللہ کے اور اس کے طریقے سب بتا دیئے۔ یہ ہے حاصل اس بیان کا۔ یہ چونکہ ضروری مضمون تھا۔ اس لئے میں نے بقدر ضرورت تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے۔ کہ وہ ہم کو اس کے سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرماتے آمین فقط۔

مفتی اور قیمتی

ایک مرتبہ منصب افتاء کے ذمہ داریوں کا ذکر ہو رہا تھا فرمانے لگے کہ مفتی ہونا بھی قیمتی کا کام ہے مفتی کا نہیں۔

(از حکیم الامت حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ)

عمرفاروق@ون اردو

آدابُ التبلیغ

تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے۔ خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسائل سُن کر عالم ہو گیا ہو۔ اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لیے معین کیا ہو ——

چنانچہ صحابہؓ نے کہاں پڑھا تھا؟ وہ بھی تو سُن سُن کر تبلیغ کرتے تھے۔ مگر ہر شخص خود نہ سمجھے کہ میں اس کے قابل ہو گیا ہوں۔ جب تک کوئی کامل نہ کہہ دے کہ تم قابل ہو ——

بقول ایک حکیم کے ؎

ہمائے بصاحب نظرے گوہر خود را

از حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ

عمر فاروق@ون اردو

آداب التبلیغ سے موسوم یہ وعظ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی درخواست پر دارالعلوم دیوبند میں بروز جمعرات ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۱ھ کو ہوا۔ جو ۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ تک جاری رہا۔ کرسی پر بیٹھ کر حضرت والاؒ نے بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ جو زیادہ تر علماء اور طلباء تھے۔ مولانا اظہر علی صاحب سلہٹیؒ نے اسے قلمبند فرمایا۔

عمرفاروق@ون اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُعا و خطبہ کے بعد۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝

عمر فاروق@ورن اردو

نوعیتِ مضمون

جس مضمون کو اس وقت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کوئی نیا مضمون نہیں، مگر ایک اعتبار سے نیا بھی ہے۔ یعنی اصل وحقیقت کے اعتبار سے تو جدید نہیں ہاں عارض کے اعتبار سے جدید ہے۔ یعنی واقع میں تو یہ پرانا ہے۔ مگر اس کا جو مقتضا تھا اس میں آج کل کمی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے اور اس کے حقوق کا مبلغین پر آگاہ کرنے کے لیئے یعنی جس درجہ اس کا اہتمام ہونا چاہیئے تھا اور آج کل وہ نہیں ہے۔ اس اعتبار خاص سے جدید بھی کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اس کے تعین سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ اس میں آج کل کس قدر کمی ہے اور حقیقت میں اس میں کیسا اہتمام ہونا چاہیئے تھا اور ہر چند کہ بیان میں کوئی نیا مضمون ہونا ضروری نہیں، بلکہ ایک اعتبار سے جدید ہونا مضر بھی ہے کیونکہ جدید وہ ہوگا، جو بدعت ہو اور دین سے خارج اور زائد ہو اور جو پہلے سے دین کا جزو ہو، وہ تو قدیم ہی ہوگا۔ لہٰذا انتظار مضمون جدید کا علی الاطلاق تو غلطی ہے۔ مگر عام لوگوں کا طبعاً یہ تقاضا ہوتا ہے۔ کہ وعظ میں کوئی نیا مضمون ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں جی لگتا ہے۔ اس مصلحت کا لحاظ فی الجملہ کر کے جی چاہا کرتا ہے۔ کہ بیان میں گونہ جدت ہو تو اچھا ہے۔ خواہ جدید اس اعتبار سے ہو کہ اب تک سامعین کو بالکل معلوم ہی نہیں ہوا۔ یا توجہ کے درجہ میں جدید ہو۔ یعنی معلوم تو ہے مگر ادھر توجہ نہیں رہی۔ اس لیئے بیان میں اس جدت خاص کے اعتبار سے اس کی رعایت کی جاتی ہے۔ کہ کوئی نیا مضمون ہو۔ ورنہ جدید ہونے کی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی قسم کی جدت بھی نہ ہو، خواہ بالذات یا بالعرض۔ بیان پھر بھی مفید ہوتا ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ جب کسی قسم کی بھی جدت نہیں۔ تو اس بیان سے کیا فائدہ، یہ تو تحصیل حاصل ہے۔ سو یہ کہنا غلط ہے۔ کیونکہ اگر اور کچھ فائدہ نہ ہو تو مکرر

کرنے سے تاکید ہی ہو جائے گی اور تاکید کا مفید و مؤثر ہونا علم بلاغت میں ثابت ہے۔ تو یقیناً تکرار سے ایک نیا نفع ہو گا۔ یعنی تاکید کا اثر، جو کہ تنہا اد بیان نہیں تھا، تو یہ کیا تھوڑا فائدہ ہے۔ تو تحصیل حاصل کہاں ہوئی۔ بلکہ یہ تو تحصیل غیر حاصل ہے مگر تاہم عموماً طبعی اقتضاء یہ ہے۔ کہ ایسی بات بیان ہو۔ جو پہلے سے بالکل ذہن میں نہ تھی۔ خواہ حصول کے اعتبار سے کہ وہ چیز ذہن میں حاصل ہی نہ تھی یا ذہول کے اعتبار سے کہ حاصل تو تھی۔ مگر اس سے ذہول ہو گیا تھا۔ اس کی طرف توجہ نہ تھی۔ تو اس طبعی اقتضاء کو دیکھ کر بعض دفعہ جی چاہا کرتا ہے کہ اگر اس کی رعایت کی جائے۔ کہ مضمون میں گو نہ جدت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

تعیین مضمون

چنانچہ اس وقت بھی اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا۔ کہ یہ مضمون خاص اعتبار سے نیا ہے۔ اب اس کو متعین کرتا ہوں اہل علم کو تو آیت کی تلاوت ہی سے اس مضمون کی تعیین ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ مجمع اہل علم کا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ بعض لوگ جو اہل علم نہیں نہ سمجھے ہوں۔ ان کو ترجمہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔ اس لیے ترجمہ کرتا ہوں۔ تاکہ ان کے نزدیک بھی متعین ہو جائے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین ○

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور مواعظ حسنہ کے ساتھ بلائیں اور (اگر مجادلہ کی ضرورت ہو تو) ان سے مجادلہ (بھی) کیجئے (مگر) احسن طریقہ سے (ہو)۔ ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ کیا مضمون بیان کرنا ہے۔ وہ مضمون خدا کے سبیل کی طرف بلانے کا ہے۔ خدا کا سبیل کیا ہے

عمرفاروق@ون اردو

سبیل رب وہ ہے، جس سے اُن تک رسائی ہو جائے۔

اور ظاہر ہے۔ کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ وہ سبیل صرف اسلام ہے۔ اگر انسان اسلام کے احکام بجالاتا ہے۔ تو اُس کو ان تک رسائی ہو سکتی ہے اور یہی سبیل رب ہے۔ اسی طرف لوگوں کو بلانے کا حضور کو امر ہوا ہے۔ اور اسلام کے اندر احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک اصُولی، ایک فروعی۔ لفظ سبیل دونوں کو عام ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو اصُول کی بھی دعوت دیجئے۔ اور فروع کی بھی۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ اصول اور فروع پر بُلا کر ان کو اسلام کی طرف بلایئے۔ باقی دعوت کا ایک طریقہ ہے۔ وہ اس کے متعلقات سے ہے۔ یعنی اس کے آداب و لوازم جن کا ذکر اپنے موقعہ پر آجائے گا۔ مگر تعیین مضمون کے واسطے اتنا ہی کافی ہو گیا۔ کہ وہ مضمون اسلام کی طرف بُلانا ہے اور اسلام ہی دین حق ہے، وہی سبیل رب ہے، وہی صراط مستقیم ہے۔ یہ اسی کے القاب ہیں۔

دعوت میں کوتاہی

اور ظاہر ہے۔ کہ گو یہاں ادع کا خطاب حضور کو ہے۔ مگر حکم حضور کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ رسول اور اتباع رسول سب اس کے مخاطب ہیں۔ ہاں حضور کو خطاب اولاً ہے اور دوسروں کو ثانیاً۔

اب دیکھنا چاہیئے۔ کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس حکم کی طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔ اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اگر اس میں بھی غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا۔ کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے، اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے، کوئی مستحسن اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن

عمر فاروق@ون اردو

بھی جب ہے کہ کسی مصلحتِ سیاسیہ[1] کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ بھی نہ دارد۔ اول تو یہی غضب تھا۔ کہ بعض نے واجب کو مستحب کہا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے۔ کہ اس میں یہ قید لگا دی۔ کہ اس مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں محض اپنے اغراض کے سبب کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں۔ کہ یہ اس کے بھی موافق ہیں یا نہیں۔ اگر ہوا فبہا ورنہ کھینچ تان کر اس کو اغراض کے تابع بناتے ہیں اور اغراض کو متبوع یعنی پہلے اغراض تجویز کر لیئے۔ پھر دیکھتے ہیں۔ کہ یہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف۔ پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی۔ کہہ دیا کہ یہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے۔ لہذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ بھی نہیں سمجھتے۔ بلکہ عجیب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ تبلانے لگیں۔ افسوس، مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا۔ کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں۔ کہ اصل تو یہی ہے دوسرا انجام پا جائے۔ پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں۔ مگر افسوس یہ نہیں کرتے۔ بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لیئے دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے توجہی کی۔ کہ اس میں اپنی اغراض کی وجہ سے بہیت تساہل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی اور ایسے بہت نکلیں گے۔ تو ہماری یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہہ دیں۔ کہ صل فانک لم تصل۔

اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوٰی ہے۔ اس لیئے باوجود علم کے محض رکیک تاویلیں گھڑ لیتے ہیں۔ مگر خدا کے ساتھ حیلہ و تزویر چل نہیں سکتا۔

بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ ۵

اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا۔ کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا

---

[1] اشارہ ہے بدشاران تحریکات جدیدہ کی معاملات کی طرف ۱۲ منہ

ہے امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے۔ کہ اس سے دنیوی اغراض فوت ہوتے ہیں۔ دوستی نہیں رہے گی، میل ملاپ نہ رہے گا، ہنسی خوشی جاتی رہے گی اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا۔ پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جاوے گا۔ پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہمی محض ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کر لو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی باتیں پیش آویں۔ تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں یا نہیں۔ ان سے پوچھو تو کہ کون کون سی چیزیں مسقط وجوب امر ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس کے لئے کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں ہے اور ضرور ہے۔ مگر شرائط و ضوابط و آداب و اعذار علمائے سے دریافت کرو۔ خود مفتی بن کر کیوں فتوے لگا لیا۔ کہ ہم تو معذور ہیں۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط و آداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا۔ جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو۔ اس کو البتہ حق ہے۔ شرائط و ضوابط پوچھنے کا وہ اگر آداب و اعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلایا جاوے گا۔ باقی حالت موجودہ میں جب کہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں۔ اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے اور سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں۔ جو شخص کام کا ارادہ ہی نہ کرے۔ اس کو نہ شرائط و ضوابط بتلائے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا کوئی حق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لیے تلاش کرے گا۔ تاکہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے۔ بلکہ کسی طرح اس سے خلاصی اور رہائی مل جاوے۔ جب اعذار معلوم ہو جائیں گے۔ تو کوئی نہ کوئی بات تراش لے گا۔ کہ مجھ میں یہ عذر موجود ہیں۔ یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں۔ ہم کیسے امر بالمعروف کریں۔

اس لیے علماء کو چاہیئے۔ کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط بتلایا ہی نہ کریں۔ جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا

ہے۔ کہ نماز کے شرائط کیا ہیں۔ اس کے اعذار و موانع کیا کیا ہیں۔ ایسے شخص کو شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیئے ورنہ وہ تو سقوط صلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہے گا۔ کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جائے۔ البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا، وہ پوچھے تو اس کو بے شک بتلایا جاوے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیئے ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے۔ بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار و موانع کی اطلاع کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ یاد رکھو! ہر سائل کو یکساں جواب دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کا حال برابر نہیں۔

مجھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جواب بہت پسند آیا۔ ایک دن درس میں یہ حدیث آئی کہ:۔

من صلی رکعتین مقبلا علیھما بقلبہ الخ

کہ جو شخص ایسی دو رکعت نماز پڑھے۔ جن کی طرف دل سے متوجہ ہو کر حدیث نفس اور وسوسہ خطرہ عمداً بالکل نہ لاوے۔ تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جاویں گے۔ ایک طالب علم نے کہا، حضرت اس طرح نماز پڑھنا ممکن بھی ہے؟ نماز میں تو خیالات بہت ہی آتے ہیں۔

فرمایا، تجھ کو شرم نہ آئی یہ سوال کرتے ہوئے۔ ارے کبھی اس کا قصد بھی کیا تھا۔ جو محال نظر آیا ہو بس پہلے ہی پوچھنے بیٹھ گئے۔ میاں کبھی ارادہ بھی تو کیا ہوتا۔ خدا کے بندے پہلے کرتے۔ پھر پوچھتے۔ کہ ہم نے کیا تھا مگر نہ ہوا۔ تو واقعی یہ جواب نہایت حکیمانہ و بزرگانہ ہے۔ واقعی جواب محض منطقیانہ نہ ہونا چاہیئے، بلکہ حکیمانہ جواب بھی دینا چاہیئے۔ اس سے اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا کے ارشاد سے نفع یہ ہوا کہ سائل کو تنبہ ہوا۔ اپنی غلطی پر اُسے ندامت و خجلت ہوئی۔ اس لئے میں کہتا ہوں۔ کہ شرائط علماء سے پوچھنا جائز بھی ہے اور ان کو بتلانے سے بھی انکار نہیں مگر یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ مستفتی کون ہے۔ آیا وہ شخص ہے جو ارادہ رکھتا ہے امر

بالمعروف کا جس کو اس کا اہتمام ہے عزم ہے۔ جس کو واقعی یہ حالات و اعذار پیش آویں گے۔ اس کو بے شک ہر حالت کے آداب و اعذار معلوم کرنے چاہییں۔ کیوں کہ اس کو یہ امور پیش آویں گے۔ یا مستفتی وہ ہے جس کا نہ کبھی ارادہ ہوا امر بالمعروف کا اور نہ آئندہ ہوگا۔ بلکہ ظالم کا قصد یہ ہے۔ کہ عمر بھر کبھی کسی کو کچھ نہ کہوں گا۔ کیونکہ دوسرے کی دل شکنی کروں۔ محض اپنے بچاؤ کے واسطے شرائط معلوم کرتا ہے۔ تاکہ ان کو آڑ بنا دے۔ اس لیئے صرف مستطات کی فہرست جاننا چاہتا ہے۔ تاکہ ہر حالت میں جی کو سمجھا لے، ایک تاویل کرے اور ہر حال کے لیئے ایک منگھڑت عذر تراش لے۔

آدابِ دعوت

صاحبو! امر بالمعروف بھی ایک فرض ہے۔ جیسے اور فرائض ہیں اور کوئی ایسی حالت نہیں۔ جس میں فرائض ساقط ہو سکیں بجز جنون و اکراہ و غلبۂ عقل اور خاص خاص اعذار کے باقی کسی حال میں فرائض ساقط نہیں ہوتے اور مغلوب العقل بھی وہی معتبر ہے۔ جس کو شریعت مغلوب العقل تسلیم کرے تمہاری منگھڑت تفسیر کا اعتبار نہیں۔ حیرت کی بات ہے۔ کہ ایک قصبہ میں ایک شخص نے اپنی عورت کو طلاق مغلظہ دی تھی۔ عدت بھی گزر چکی تھی۔ اس کے بعد ایک منتی آئے۔ انہوں نے اس کو سمجھایا اور کہا کہ طلاق واقع ہونے کے لیئے عقل شرط ہے اور تم تو اس وقت مغلوب العقل تھے۔ بس اس تاویل سے حرام عورت حلال کر لی اور ان کے نزدیک حلال بھی ہوگئی۔ تو اس طرح تو جس کا جی چاہے دعوے کر دے۔ مغلوب العقل ہونے کا پھر تو سارا جہان مغلوب العقل ہو جائے گا۔ مثلاً امر بالمعروف کرنے میں اصل تو تعلقات شگفتہ نہ رہنے کا خوف تھا۔ مگر تاویل کر لی کہ میں بغض فی اللہ کے سبب ہوش باختہ ہوگیا تھا۔ اس لیئے امر بالمعروف نہ کر سکا۔ یا طمع تھی کسی چیز کے ملنے کی مگر وہاں بھی وہی تاویل گھڑلی۔ صاحبو! اس سے کچھ نہیں

ہوتا۔ ان تاویلات کا جو تمہاری تراشی ہوتی ہیں، کچھ اعتبار نہیں۔ تمہارے فتویٰ سے امر بالمعروف ساقط نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں کہ جو تمہارا دل چاہے وہی ہوجاتے تمہاری رائے معتبر نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

کسی صاحب کمال سے پوچھنا چاہیئے۔ اگر وہ کہہ دے کہ تم معذور ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ تمہارے خیالات کا یا جہلاء کے کہنے کا کچھ اعتبار نہیں۔ کسی صاحب بصیرت کی شہادت ہونی چاہیئے۔ ورنہ اس طرح تو ہر شخص کوئی نہ کوئی عذر تراش لے گا۔ غرض پہلے ہر شخص قلب کو ٹٹول کر دیکھ لے۔ کہ امر بالمعروف کا قصد ہے۔ یا کہ قصد نہیں بحض اس سے رہائی اور خلاصی ہی چاہتا ہے۔ اگر قصد ہو تو وہ بیشک اس کے آداب و اعذار و شرائط سیکھے۔ علماء سے پوچھ کر یا کتاب سے دیکھ کر اس لیئے کہ امر بالمعروف کا حکم علی الاطلاق نہیں ہے۔ کہ جس طرح ہو اندھا دھند دعوت و تبلیغ کرو۔ کہ نہ شرائط کی پرواہ، نہ آداب کی رعایت۔ بلکہ اس کے لیئے ضوابط اور طرق مقرر ہیں۔ کیونکہ امر بالمعروف فرضیت میں نماز سے تو بڑھ کر نہیں، بلکہ برابر بھی نہیں۔ اور اسی لیئے قرآن میں اقامت صلوٰۃ کے بعد امر بالمعروف کا حکم ہے ارشاد

اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر۔

مگر پھر بھی نماز کے لیئے کچھ آداب و اعذار و ضوابط ہیں۔ یہ نہیں کہ جو نماز پڑھنا چاہے۔ اس کے لیئے کوئی ضابطہ ہی نہیں۔ نہ وضو کی ضرورت، نہ ستر عورت کی، نہ قرأت کی، نہ پاکی کا خیال، نہ استقبال قبلہ کی ضرورت یہ نہیں۔ بلکہ اگر نماز پڑھنا ہے تو اول قرأت سیکھو، ناپاک ہو تو نہاؤ، قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر کھڑے ہو۔ یہ فرائض ہیں نماز کے۔ کہ بغیر ان کے نماز ہوتی نہیں۔ تو جیسے نماز فرض ہے اور پھر بھی اس کے لیئے شرائط و ارکان وغیرہ ہیں۔ ایسے ہی امر بالمعروف کے لیئے بھی کچھ

عمر فاروق @ ویب اردو

قواعد و آداب ہیں۔ علماء سے ان آداب و ضوابط کو پوچھنا چاہیے۔ علماء محققین اس کو بتلادیں گے۔ کہ اس کے لیے کیا شرط ہے اور کیا ضابطہ ہے۔

طرزِ دعوت

چنانچہ امر بالمعروف کی ایک قسم اصول کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس کے الگ آداب ہیں۔ ایک فروع کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس کے الگ آداب ہیں۔ علماء سب پہلوؤں کو جانتے ہیں۔ ان کا علم تم سے زیادہ محیط ہے۔ پس اس کا طریق ان سے سیکھو یہ تھوڑا ہی ہے۔ کہ بس جیسے ہو کر لو۔ نہ کوئی ضابطہ نہ قاعدہ۔ جو ملا اُسی کو امر بالمعروف اندھا دُھند کر دیا۔ گویا ایک لٹھ سا مار دیا۔ مثلاً کوئی کافر ملا، اس سے کہا ابے! تو مسلمان ہو جا۔ اس نے جواب میں کہا ابے! تو کافر ہو جا۔ بس اب کیا تھا لٹھ چل پڑا۔ صاحبو! یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ بہت نازک کام ہے۔ اس کے واسطے بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں اس کے آداب مذکور ہیں۔ یہ بھی ایک مستقل فن ہے۔ اس کو سیکھ کر پھر عمل شروع کرو۔ محقق علماء سے کام کرنے کا طریقہ سیکھو اپنی رائے سے کچھ نہ کرو۔ اپنی رائے کا شریعت میں کچھ اعتبار نہیں۔ بلکہ اہل علم کو بھی چاہیے۔ کہ جو کام کریں۔ اپنے سے زیادہ عالم سے پوچھ کر کریں۔ بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بڑوں کو بھی چاہیے کہ چھوٹوں سے مشورہ کر لیا کریں۔ (مشورہ کا لفظ میں نے ادب کے لیے استعمال کیا ہے) اگرچہ بڑوں کو اکثر چھوٹوں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر کبھی چھوٹے کو کوئی بات ایسی معلوم ہوتی ہے۔ جو بڑے کو نہیں ہوتی۔ گو غالب ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر تو بڑوں ہی کو زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔ اگرچہ ان کا علم زیادہ نہیں لیکن ممکن ہے کہ ان کو کوئی خاص مصلحت معلوم ہو۔ کوئی واقعہ معلوم ہو۔ بلکہ بکثرت واقع ہے۔ کہ واقعات چھوٹوں کو زیادہ معلوم ہوتے ہیں، بڑوں کو معلوم نہیں ہوتے اور واقعات کی لاعلمی سے ان کے کمال میں کوئی نقصان نہیں آتا۔ دیکھئے ہدہد جیسا کوئی جانور چھوٹا نہیں اور سلیمان علیہ السلام

جیسا کوئی بڑا آدمی نہیں۔ مگر پھر ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہتے ہیں:۔

اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ۔

کہ میں سبا سے ایک خبر لایا ہوں۔ جس کو آپ نہیں جانتے ہیں۔ اس پر سلیمان علیہ السلام نے نکیر نہیں کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو اہتمام کے ساتھ اس قصہ کو بیان فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بڑوں کو کسی واقعہ سے لاعلمی ہونا یہ نقصان فی الکمال نہیں۔ کیونکہ واقعات اُمور غیر مقصود ہوتے ہیں۔ ہاں امور مقصودہ یعنی احکام کا علم بڑوں کو زیادہ ہوتا ہے اور اس میں ایک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ چاہے چھوٹے کے پاس کچھ علم نہ ہو۔ مگر مشورہ سے کم از کم اتنا فائدہ ہو گا۔ کہ اس سے مزید اطمینان ہو جاوے گا۔ صاحبو! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ لینے کے مامور بہ ہیں۔ وشاورھم فی الامر۔ تو ہم کو تو ضرور مشورہ لینا چاہیئے۔ یہ سنت نبوی ہے اور ہمارے اکابر کا بھی یہی طرز تھا۔ وجہ یہ کہ مشورہ کرنے سے خواہ وہ چھوٹوں ہی سے ہو۔ بعض دفعہ کوئی کام کی بات نکل آتی ہے اور جب بڑے کو چھوٹے سے مشورہ کرنے کا حکم ہے تو چھوٹے کو تو بطریق اولیٰ بڑوں سے پوچھنا چاہیئے۔ پھر جس طرح اپنے اکابر اپنے متقدا حکم دیں اس طرح کرلے یہ طریقہ ہے کام کرنے کا۔ امر بالمعروف کے یہ معنی کہ بس جو کافر ملے، (جھٹ پٹ) کے اسے مسلمان بنانا شروع کر دے بعض دفعہ یہ طرز مضر ہوتا ہے۔ اس لیئے اس کا ڈھنگ اور طرز سیکھنا چاہیئے۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ نے یہ قید لگائی ہے:۔

ادع الیٰ سبیل ربك بالحكمة۔

یعنی حکمت سے بلایئے۔ معلوم ہوا کہ اس میں حکمت کی ضرورت ہے ورنہ مطلق فرماتے بالحکمۃ نہ فرماتے۔ بہر حال اس کے شرائط ضرور ہیں۔ مگر وہ انہی کے لیئے ہیں۔ جو کام کرنے کا قصد کرے۔ اب تو دیکھا جاتا ہے کہ لوگ قصد ہی نہیں کرتے۔ اور عوام تو عوام خواص کو بھی ادھر توجہ نہیں۔

دعوت اور منازعت

اور خواص میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو مشائخ نہیں۔ ان کی تو کیا شکایت۔ کیونکہ عوام ان کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے۔ ان میں جو مشائخ ہیں۔ وہ مقتدا سمجھے وقت مانے جاتے ہیں۔ جن کے بہت لوگ معتقد ہیں۔ سب سے زیادہ کوتاہی انہیں میں ہے۔ وہ بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔ کہ ہاتھ میں تسبیح لے کر بیٹھ جاویں، جنت میں پہنچ جاویں گے۔ ان کو کسی کی اصلاح کی کچھ پرواہ نہیں۔ بلکہ اس کو تو شانِ مشیخت سے اس قدر بعید سمجھتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شیخ اس کام کو شروع کرے۔ تو اس کو مشیخت کے دفتر سے خارج کر کے محض علماء کے دفتر میں داخل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک دفعہ الٰہ آباد گیا تھا۔ والد صاحب کی بیمار پرسی کے لیئے وہاں ایک درویش تھے، والد صاحب ان کے پاس مجھے لے گئے۔ جب درویش نے مجھے دیکھا۔ تو مجھ سے کہا کہ اس آیت کا مطلب بتلاؤ۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ

میں نے ترجمہ کر دیا۔ تو کہنے لگے، دیکھو، حق تعالیٰ منع کرتا ہے منازعت سے۔ پھر ہم کسی کو روک ٹوک کیوں کریں۔

ع موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود

جو جس کے جی میں آوے کرے۔ ہمیں کسی سے تعرض کرنے کی ضرورت کیا پڑی۔ یہ تفسیر کی انہوں نے۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی تفسیر حاضر نہیں تھی۔ میں نے لفظوں ہی سے ان کو جواب دیا۔ میں نے کہا۔ حق تعالیٰ نے لا ینازعنك فرمایا ہے۔ کہ وہ آپ سے منازعت نہ کریں لا تنازعھم نہیں فرمایا کہ آپ بھی ان کو روک ٹوک نہ کریں۔ بلکہ آپ کے لیئے تو خود اس کے متصل ہی امر فرماتے ہیں:۔

وادع الی ربك انك لعلی هدی مستقیم۔
یعنی دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو باطل پرست تھے، حق سے ہٹے ہوئے تھے اور ایک وہ جو صراط مستقیم پر تھے۔
تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کرنے کی اجازت نہیں۔ پس حاصل آیت کا یہ ہے۔ کہ آپ صراط مستقیم پر ہیں۔ آپ کو تو حق ہے۔ منازعت صوری یعنی دعوت کا۔ مگر ان کو حق نہیں کہ آپ سے منازعت کریں۔ میں نے کہا اس جگہ حضور کو تو عدم منازعت کا حکم نہیں۔ بلکہ ان کو حکم ہے کہ آپ سے منازعت نہ کریں۔ پس شاہ صاحب کا ذرا سا منہ نکل آیا۔ اور ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ والد صاحب بھی میرے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کی لطیف لطیف تقریریں بھی نظر سے گزریں۔ لیکن یہ تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ مگر یہ مطلب کسی نص کا معارض بھی نہیں۔
اور بعض نے جو اس آیت کی تفسیر میں لا ینازعنك کا مطلب لا تنازعہم لکھ دیا ہے۔ کہ آپ ان سے منازعت نہ کریں۔ یقیناً شاہ صاحب کی اس تفسیر پہ نظر نہ تھی۔ ورنہ وہ ضرور اس کو پیش کرتے۔ مگر میں اس وقت یہ جواب دیتا۔ کہ منازعت اور ہے دعوت اور ہے۔ اگر منازعت حقیقیہ سے ممانعت ہے، دعوت سے تو ممانعت نہیں۔ پس تم منازعت نہ کرو محض دعوت ہی کر دیا کرو۔

صُلحِ کُل

مگر غضب تو یہ ہے۔ کہ آج کل تو درویشی کے یہ معنی سمجھتے ہیں۔ کہ بس کچھ نہ کرے اور کسی کو کچھ نہ کہے۔ بلکہ سب کے ساتھ صلح کل ہو کر رہے۔ وہ تو درویشی ہے ورنہ نہیں اور اس کے لئے ایک شعر گھڑا ہے۔ اور اس کو حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس لئے کہ ان کے اقوال میں

عمر فاروق @ ویب اردو

حافظ آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جاتے کہ جس شعر میں حافظ آجاتے۔ بس وہ حافظ شیرازی ہی کا ہے۔ مگر یہ محض مہمل دلیل ہے۔ کیا کوئی دوسرا شخص اپنا تخلص حافظ نہیں کر سکتا۔ یا اپنا شعر رائج کرنے کو جعلی طور پر حافظ کا لفظ اپنے شعر میں نہیں بڑھا سکتا۔

پس ہم دعوے سے کہتے ہیں۔ کہ یہ شعر اول تو حافظ کا ہے نہیں اور اگر ہوتا بھی، تو چونکہ ہم کو ان سے حسن ظن ہے۔ ہم اس کی تاویل کرتے۔ ہاں جو خشک دماغ ہے وہ تو تاویل نہیں کرے گا۔ بلکہ حافظ پر طعن کرنے لگے گا۔ مگر ہم ایسے بے ادب نہیں۔ پس یہی قاعدہ غلط ہے۔ کہ جس شعر میں لفظ حافظ ہو۔ اس کو حافظ شیرازی کی طرف منسوب کر لیا جاتے۔ اسی طرح جو کلام مثنوی کے وزن پہ ہو تو اس کو مولانا روم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

اب سنیئے کہ انہوں نے کون سا شعر گھڑا ہے اور اس کو حافظ کی طرف منسوب کیا۔ حالانکہ وہ حافظ شیرازی کا شعر کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

وہ شعر یہ ہے۔ ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام!

بھلا جس کو ذرا بھی حافظ کی بلاغت و فصاحت کا ذوق ہے وہ تسلیم کر سکتا ہے۔ کہ یہ ان کا کلام ہے۔ ہرگز نہیں۔ دوسرے حافظ شیرازی رام رام جانتے بھی نہ تھے۔ انہوں نے تو عمر بھر کبھی سنا بھی نہ ہو گا اور بڑی بات یہ ہے کہ حافظ کا دیوان موجود ہے اس میں دیکھ لو اور تماشا یہ کیا، کہ باوجودیکہ دیوان کے اندر تحریفیں بہت ہوئی ہیں۔ مگر یہ شعر تحریف کے بعد بھی اس میں موجود نہیں۔ پس یہ شعر دیوان حافظ کا تو ہے نہیں، ہاں کسی دیوانہ حافظ کا ہو گا۔

عُرفی تصوّف

ایک اور شعر بھی ہے۔ جس سے آج کل کے صوفی اپنے مسلک صلح کل پر استدلال کرتے ہیں اور وہ واقعی حافظ کا ہے ؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کُن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

اس کو بھی صوفیوں نے اپنا مستدل ٹھہرایا ہے۔ کہ بس کسی کو آزار نہ دینا چاہیئے۔ دل دکھانا اچھا نہیں۔ پھر کیوں کسی کو امر بالمعروف کیا۔ میں کہتا ہوں کیا ایک متکبر کا دل دُکھانا بھی منع ہے۔ اگر اس شعر میں ہر آزار کی ممانعت ہے۔ تو پھر ہر چہ خواہی کُن کی بھی عام اجازت ہونی چاہیئے۔ پھر کیا ہے، بس زنا کی بھی اجازت ہونی چاہیئے، چوری کی بھی اور غضب لوٹ مار اور ڈاکہ کی بھی بس جو چاہو کرو۔ سب کی اجازت ہے۔

اگر کہو کہ چوری سے تو آزار ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ آزار کی ممانعت میں داخل ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ زنا میں تو آزار نہیں۔ شاید کہو کہ شوہر اور خاندان کو آزار ہے۔ تو اگر کسی کو کوئی عورت ایسی مل جاوے کہ نہ اس کے خاوند ہے، نہ باپ ہے، نہ بھائی کوئی نہیں ہے اور وہ خوشی سے یہ فعل کراتی ہے تو یہاں کسی کو آزار نہیں ہے۔ نہ اس کو نہ اور کسی کو۔ تو کیا اس کو اجازت ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو پھر اس میں تخصیص کرو گے اور تخصیص کسی دلیل سے کرو گے یا بے دلیل۔ جیسے بھی ہو اگر تم ہر چہ خواہی کُن میں تخصیص کرتے ہو تو ہم یہاں (یعنی آزار میں) بھی تخصیص کریں گے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار نہ دو اور در حقیقت درپئے آزار ہونا یہی ہے اور جو شخص آزار بغرض اصلاح دے۔ جیسے طبیب اور ڈاکٹر اپریشن کرتا ہے۔ یا باپ، استاد بچہ کو تادیباً مارتا ہے۔ اس کو ہرگز درپئے آزار شدن نہیں کہہ سکتے پھر امر بالمعروف

کرنے والے سے اگر کسی کو آزار پہنچے بھی تو اس کو در پئے آزار کہنا صحیح نہیں۔ لہٰذا وہ اس شعر کا مصداق ہی نہیں۔ پس امر بالمعروف سے رُکنے کے واسطے اس شعر کو آڑ بنانا محض باطل ہے۔ دوسرے یہ کہ مباش در پئے آزار میں اگر آزار ایسا ہی عام ہے۔ تو پھر اس میں مخاطب ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ کہ صرف مخاطب ہی کو آزار نہ پہنچایا جاوے۔ غائب کو آزار پہنچ جاوے۔ سبحان اللہ! بلکہ اس کو بھی عام کہو کہ صاحب آزار کوئی ہو، آزار میں تعمیم کر کے صاحب آزار میں کیوں تخصیص کی جاتی ہے۔ بلکہ جیسے آزار میں تعمیم کرتے ہو، صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو۔ اگر صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو گے۔ تو پھر کوئی بھی معصیت ایسی نہ ہو گی۔ جس سے کسی نہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ ایسا کوئی امر نہ نکلے گا۔ جو کسی نہ کسی کے لیے سبب آزار نہ ہو۔

شاید آپ سوچتے ہوں گے۔ کہ ہمارے گناہوں سے کس کو آزار پہنچتا ہے تو آپ ایک حکایت سے اس کا اندازہ کر لیجئے۔ مرزا بیدل شاعر کی حکایت ہے۔ کہ ان کے اشعار تصوف کا رنگ لیے ہوئے ہوتے تھے۔ کسی ایرانی نے ان کے اشعار کو دیکھ کر پسند کیا اور انکو بزرگ سمجھ کر ان کے پاس آیا جب ان کے پاس پہنچا، تو یہ حجام سے ڈاڑھی منڈا رہے تھے۔ اس کو یہ دیکھ کر غصہ آگیا اور جھلا کر اس نے پوچھا۔ آغا ریش می تراشی؟

شاعر نے جواب دیا۔

"آرے ریش می تراشم و لے دلے کسی نمی خراشم"

وہ بے چارہ مخلص تھا۔ اس نے آزادانہ جواب دیا۔ "آرے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی"، مخلص تو در پئے مصلحت کے نہیں ہوتا۔ اس کی بڑی مصلحت تو یہ ہے۔ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرہ یارے گیرند!

شاعر نے تصوف مزعوم کے اعتبار سے اور اسی عرفی تصوف کے طور پر جواب دیا تھا۔ کہ دل کسے نمی خراشم۔

" ایرانی نے جواب دیا کہ ظالم تو تو سب سے بڑے دل کو چھیل رہا ہے۔ اور دعوے کرتا ہے۔ کہ دل کسی نمی خراشم ملے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی "۔ تم یہ داڑھی پر اُسترہ نہیں پھرا رہے ہو۔ بلکہ حضور کے دل پر چھری چلا رہے ہو۔ حضور کی خدمت میں جب اعمال پیش ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ میری اُمت کا ایک شخص یہ حرکت کرتا ہے۔ کیا اس سے آپ کا دل نہیں دکھتا اور کیا آپ کا دل دکھانا چھوٹی بات ہے۔ آپ کا قلب تو سید القلوب ہے۔ جب تم سید القلوب کو تکلیف دیتے ہو، پھر یہ دعوے کیسے کرتے ہو کہ ہم کسی کا دل نہیں دکھاتے ہیں۔ ارے تم درپئے آزار تو ہو گئے۔ یہ سن کر مرزا کی آنکھ کھلی اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو توبہ کی اور بزبانِ حال یا قال یہ کہتا تھا۔ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی　　　مرا با جان جاں ہمراز کردی

یعنی میں تو اندھا تھا۔ میری کبھی ادھر نظر ہی نہیں گئی۔ کہ مجھ سے اتنے بڑے قلب کو ایذا ہو رہی ہے۔ یہاں تک میرے ذہن کی رسائی ہی نہیں ہوتی تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ خدا تجھ کو اس کی جزا دے۔

اب اس حکایت سے سمجھ لیجئے۔ کہ جب آپ سے کوئی امر غیر مشروع سرزد ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آزار ہو گا یا نہیں؟ اس لیئے ترک احکام شرعیہ کے لیئے اس کو آڑ بنانا اور یہ کہنا کہ :۔

؏ مباش درپئے آزار وہرچہ خواہی کن

بالکل واہیات ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے۔ کہ سُنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک۔ ہم تمہیں ہر ہر بات کا کہاں تک جواب دیں۔ تم نے ایک بات نکالی۔ ہم نے اس کا جواب دیا دوسری نکالی اس کا دیا آخر یہ سلسلہ کہاں تک رہے گا سیدھا جواب

یہ ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں سب اشعار صحیح ہیں۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں۔ کہ یہ خدا رسول کا حکم ہے۔ اس کے سامنے کہاں کی مصلحت کہاں کی حکمت۔ نصوص کے اندر امر بالمعروف کا حکم موجود ہے اور نہ کرنے پر نکیر ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں بس اس کو کرو۔ البتہ شرائط و احکام کے ساتھ کرو۔ اندھا دھند لٹھم لٹھا مت کرو۔ فقہاء نے اس کی ایک مستقل بحث لکھ دی ہے۔ اس کے قوانین و ضوابط کو مدون کر دیا ہے اس کو سیکھو، علماء سے پوچھو۔ وہ تم کو راستہ بتا دیں گے اور اس قسم کے اشعار سے نصوص کا مقابلہ نہ کرو۔

حاکمانہ جواب

اور جو کوئی جاہل نصوص کا مقابلہ ان اشعار سے کرے۔ اس کو ڈانٹ دینا چاہیئے۔ حدیث میں ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنین کی دیت میں غرہ عبد یا امۃ کا حکم دیا تھا۔ مدعا علیہ نے حضور کے سامنے یہ کہا:۔

کیف اغرم من لا شرب ولا اکل ولا نطق ولا استہل ومثل ذٰلک بطل۔

یعنی ایسے بچہ کی کیا دیت جس نے نہ کھایا نہ پیا اور نہ بولا نہ چلایا اور ایسا معاملہ تو یونہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اسجع کسجع الکھان۔ کیا واہیات ہے کاہنوں جیسی مسجع مقفی عبارت سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہو غرض حضور نے اس کو ڈانٹ دیا۔ تو بعض جگہ اس کی بھی ضرورت ہے کہیں حاکمانہ جواب مناسب ہوتا ہے اور کہیں حکیمانہ۔ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا۔ عوام اسی سے بگڑ گئے۔ علماء کے حکیمانہ جواب ہی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ اب ہر بات کی علل و اسرار پوچھنے کی جرأت ہو گئی۔ ایک شخص نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ حائض سے نماز تو ساقط ہو گئی اور روزہ کی قضا لازم۔ جواب دیا۔ کہ وجہ یہ ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جب نہیں سمجھ سکتے تو تم سے خطاب کرنا موت ہے۔ میری زبان ہی نہیں چلے گی۔ کیونکہ ؎

فہم سخن تا نہ کند مستمع　　　　قوت طبع از متکلم مجو

اگر جہلا کو اس طرح حاکمانہ جواب دیا جاوے تو اُن کی جرأت نہ بڑھے گی۔

میں ایک دفعہ سہارن پور گیا۔ تو ایک شخص نے وہاں بہشتی زیور کا ایک باریک مسئلہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھا تھا۔ مولانا نے اپنے حسنِ اخلاق سے اس کو سمجھا دیا تھا۔ مگر وہی مرغے کی ایک ٹانگ ان کی سمجھ میں کہاں آتا تھا۔ کیونکہ سمجھنا مطلوب ہی نہ تھا۔ جب میں گیا تو وہ سمجھے کہ یہ تو مؤلف ہی آ گیا، ان سے پوچھنا چاہیئے۔ چنانچہ میرے پاس بھی آئے۔ پہلے آن کے تو زور سے کہا السلام علیکم۔ سلام ہی سے خشونت اور اکھڑپن ٹپکتا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ یہ عبارت ہے بہشتی زیور کی۔ ذرا اس کو دیکھ لیجیئے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو سب دیکھ ہی کے لکھا ہے۔ آپ کہیئے کیا کہنا ہے۔ کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا مطلب نہیں سمجھے یا علت نہیں سمجھے۔ مطلب تو ظاہر ہے، اردو میں سہل کر کے لکھا گیا ہے۔ کہا، جی علت نہیں سمجھا۔ کہ اس کی علت کیا ہے۔ میں نے کہا، آپ کو کچھ اور بھی مسائل یاد ہیں۔ کہا جی ہاں بہت سے۔ میں نے کہا کہ کیا ان سب کی علت کو آپ نے معلوم کر لیا ہے۔ یا بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی علت اور حکمت معلوم نہیں۔ اگر سب کی علت معلوم ہو چکی۔ تو مجھے اجازت دیجیئے۔ کہ دو چار کی میں بھی علت دریافت کر لوں۔ کہا ہاں غیر معلوم العلت بھی بہت سے ہیں۔ میں نے کہا، پھر اسے بھی اسی فہرست میں داخل کر لیجیئے۔ اس جواب سے وہ ناراض تو بہت ہوئے۔ مگر بولے کچھ نہیں بس کتاب بغل میں دبا جلدی سے اُٹھ گئے۔

مولانا نے فرمایا۔ کہ تم نے تو بڑی جلدی ساکت کر دیا۔ میں نے کہا حضرت

ہیں آپ کی طرح خلیق نہیں۔ کہ ایک کوڑ مغز کے ساتھ چار گھنٹے مغز مارہ وں۔ اخیر ہیں بڑا خفش کی طرح وہ کہے۔ کہ میں نہیں سمجھا اور پھر ہیں تقریر کروں۔ قصہ بڑا خفش کا طالب علموں میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے بکرے سے سبق کا تکرار کیا کرتے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھتے۔ کہ سمجھا اور اس کو یہ تعلیم کر رکھا تھا۔ کہ وہ نفی کے طور پر سر ہلا دیتا ہے۔ یہ پھر تقریر شروع کرتے۔ ایسے ہی مکرر سہ کرر تقریر کرتے۔ تو مجھ سے اخفش نہیں بنا جاتا۔

اس کے بعد اور ایک جنٹلمین صاحب آئے۔ وہ بھی اسی علت میں مبتلا تھے۔ مہذب عنوان سے کہنے لگے۔ کہ حضرت جب لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو ہم کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ بہت رنج ہوتا ہے چنانچہ اس مسئلہ میں جہلاء اعتراض کرتے ہیں۔ جو ناگوار ہوتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں ایک چھوٹا سا جلسہ جمع کروں۔ آپ اس میں ان چند مسائل کی تقریر کر دیں۔ میں نے کہا۔ میں آپ کی محبت کا نہایت ممنون ہوں۔ مگر عقلی قاعدہ ہے۔ کہ الاہم فالاہم۔ جو کام سب سے اہم ہو۔ پہلے اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ یہ آپ کو مسلم ہے یا نہیں۔ کہا ضرور مسلم ہے۔ کیونکہ یہ مقدمہ تو عقل کے موافق تھا۔ اس کو بغیر تسلیم کیئے تو چارہ ہی نہیں تھا۔ ان لوگوں کو عقلیات سارے مسلم ہیں۔ بس نقلیات ہی میں کلام ہے۔ میں نے کہا جو لوگ علماء کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ وہ واقعی گستاخی کرتے ہیں۔ سو ایک تو یہ طبقہ ہے۔ جو علماء کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک طبقہ وہ ہے۔ جو ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ وہ ان سے بدتر ہے اور ایک وہ طبقہ ہے جو صحابہ پر طعن کرتا ہے۔ وہ ان سے بھی گستاخ تر ہے۔ اُن سے بڑھ کر ایک وہ فرقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے اور سب سے بدتر وہ گروہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو سب وشتم کرتا ہے۔ تو ترتیب سے کام کرنا چاہیئے۔ آپ اوّل ان لوگوں کی اصلاح کا انتظام کر دیجئے۔ جو اللہ تعالیٰ کی

شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ پھر ان کی جو رسول کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں
پھر اُن کی جو صحابہ کو نہیں چھوڑتے۔ پھر ان کی جو ائمہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں جب ان
سب کا انتظام ہو جاوے گا۔ آخر میں یہ جماعت علماء کی شان میں گستاخی کرنے
والی رہے گی۔ اس کا انتظام میں کر دوں گا۔ اب وہ چُپ، کیا جواب دیں جب
دیکھا کہ اس طرح کام نہ چلا۔ تو گفتگو کا طرز بدلا اور کہا یہ تو سمجھ میں آگیا۔ کہ اس
وقت اُن کی اصلاح کی ضرورت تو نہیں۔ لیکن اگر کر دی جائے تو ضرر ہی کیا
ہے۔ میں نے کہا کچھ ضرر نہیں۔ کہنے لگے، پھر ایسا کر دیجئے۔ میں نے کہا یہ مشورہ
ہے یا حکم ہے۔ اگر حکم ہے تو آپ کو حکومت کا کوئی حق نہیں۔ میں آپ کا کوئی
محکوم نہیں، نوکر نہیں، آپ کا شاگرد نہیں، مرید نہیں اور اگر مشورہ ہے۔ تو
مشورہ میں مخاطب کے ماننے کا انتظار نہیں ہوتا۔ آپ اپنے فرض منصبی سے
فارغ ہو چکے۔ آگے ہمارا کام ہے۔ ہماری جو سمجھ میں آوے گا کریں گے۔
آپ کی کچہری کا وقت آگیا ہے۔ تشریف لے جائیے۔ غرض یہ بھی چلے گئے۔
تمام دن یہی قصہ رہا۔ مگر میں نے کسی کو ایک منٹ میں ختم کیا، کسی کو دو منٹ میں
اور پہلے ایک ہی آدمی نے کئی دن سے اکابر کو تنگ کر رکھا تھا۔ غرض یہ کہ ہر
سائل کے ساتھ نہ تو مطلقاً خشکی برتے اور نہ ہر جگہ خلیق رہے۔ اصلاح اسی طرح
ہوتی ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں۔ کہ اول تو حقیقت ظاہر کرو اور اگر نہ
سمجھے تو آخر میں کہہ دو کہ بس جاؤ یہ خدا کا حکم ہے۔ خدا کے حکم کے مقابلہ میں ہم
تمہاری واہیات خرافات کو نہیں مانتے ہیں۔

اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے۔ کہ مولانا محمد یعقوب صاحب
ایک بار ایک دعوت کے جلسہ میں رڑکی تشریف رکھتے تھے۔ اس جلسہ میں
ایک عالی صوفی صاحب سماع جوازِ سماع کے دلائل بیان کر رہے تھے۔ مولانا
کی وضع سادی تھی۔ اس لئے وضع سے کسی نے یہ نہیں پہچانا۔ کہ یہ کوئی عالم یا
بزرگ ہیں۔ اس صوفی نے دلیل جواز سماع میں مولانا روی رحمہ اللہ کا یہ شعر

پیش کیا۔ ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

اور کہا کہ اس میں بشنو امر ہے اور امر وجوب کے لیئے ہے۔ اس کا حقیقی جواب تو یہ تھا۔ کہ بے شک امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ مگر کس کے امر سے۔ مولانا کے امر سے یا اللہ تعالیٰ کے امر سے۔ مگر یہ جہلاء لوگ تو اس کو کچھ نہ سمجھتے۔ بس ان کو تو اڑتی ہوئی ایک بات ہاتھ لگ گئی۔ کہ امر وجوب کے لیئے ہے۔ وہ جہلاء ان باتوں کو کیا جانیں۔ کہ امر کے اقسام کتنے ہیں۔ اس لیئے مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا۔ کہ مولانا رومی کا قول حجت ہو کہ پہلے خود ان کا حجت ہونا ثابت کیا جاوے۔ سو سب سے پہلے تو تم ان کا مسلمان ہونا ثابت کرو۔ بس اس جواب سے ان پر تو مٹی پڑ گئی اور سارے دلائل گائے خور د ہو گئے۔ غرض ہر جگہ جواب کا مختلف طریقہ ہے۔ کہیں نرمی کا جواب اچھا ہے، کہیں سختی کا اور کہیں جوتے کا جواب بہتر ہوتا ہے۔ مولانا ہی کا شعر ہے۔ ؎

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

اور فرمایا کرتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چار کتابیں نازل فرمائی ہیں وہاں ایک پانچویں کتاب حدید بھی اُتاری ہے۔ چنانچہ ارسال رسل و انزال کتب کے بعد ارشاد ہے۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَأْسٌ شَدِیْدٌ۔ فرمایا۔ کہ اس میں حدید سے مراد نعل دار جوتا ہے۔ کہ اس سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا مقولہ ہے۔ کہ یَعِظُ السِّنَانُ اَکْثَرَ مِمَّا یَعِظُ الْقُرْاٰنُ۔ یعنی بعض قرآن کی نصیحت اتنا نہیں روکتی۔ جتنا ایک نیزہ کی نوک روک دیتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اول دلائل بیان کرو۔ اگر ان دلائل کو نہ مانے تو صاف جواب دو۔ کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ احکام الٰہی کے سامنے کوئی چیز حجت نہیں۔ اس لیئے یہ اشعار

بھی کچھ حجت نہیں ہیں۔ غرض امر بالمعروف یقیناً واجب ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ اس طرف توجہ بالکل نہیں اور یہ ایک بڑی کوتاہی ہے۔ اسی کوتاہی کو رفع کرنے کے لیے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جاوے کہ نماز اور روزہ کی طرح یہ بھی فرض ہے۔

تدریس میں نیت تبلیغ

البتہ مختلف اوقات میں اس کے طُرق مختلف ہیں۔ مثلاً اس وقت آپ لوگوں کا پڑھنا بھی تبلیغ ہے۔ اگر نیت اچھی ہے۔

"انما الاعمال بالنیات"

اگر آپ کی نیت میں یہ ہو۔ کہ پڑھنے سے فارغ ہو کر امر بالمعروف کروں گا۔ تو یہ پڑھنا بھی شعبۂ تبلیغ ہی کا ہے۔ اگر یہ نیت نہ ہو تو پھر تبلیغ نہیں۔ دیکھو اگر کوئی شخص نماز کی نیت نہ کرے تو نماز نہیں ہوتی۔ ایسے ہی روزہ ہے۔ اگر نیت نہ کرے اور دن بھر فاقہ کرے، تو روزہ نہیں ہوتا۔ غضب کی بات ہے۔ کہ ہم رات دن پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ مگر اعمال و طاعات کی نیت نہ کرنے کی وجہ سے ثواب سے محروم ہیں۔

غرض اچھی نیت سے اس وقت یہی کتابیں پڑھنا بے شک اصل تبلیغ ہے اور میں نے اس وقت کی قید اس لیے لگائی۔ کہ پہلے زمانہ میں صحابہ و تابعین کو تدریس متعارف کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ ان کا تو بغیر اس کے کام چلتا تھا۔ کیونکہ حافظے اور اذہان کافی تھے اور تدین بھی تھا۔ اور اس وقت اس کی ضرورت اس لیے ہے۔ کہ اگر کتابیں مدون نہ ہوں اور آج کل لوگوں کا نہ حافظہ ویسا ہے، نہ ویسا تدین ہے، نہ ان کے قول پر ان جیسا وثوق ہے پھر زبانی کوئی مضمون حدیث و فقہ کا بیان کیا جاتا۔ تو سامعین کو ہرگز تسلی نہ ہوتی اور خیال ہوتا کہ نہیں معلوم یہ کچھ کہتے ہیں ٹھیک بھی ہے یا یوں ہی اُلٹ

پٹ (گ) رہے ہیں۔ اگر کتابیں مدون نہ ہوتیں تو بڑا خلط مبحث ہوتا۔ دین میں بڑا فساد پھیلتا۔ خدا کا بڑا احسان ہے۔ کہ اپنی عنایت و رحمت سے اس نے کتابیں مدون کرادیں۔ مدرسے قائم کرادیئے۔ اس کے سامان مہیا کر دیئے۔ منجملہ ان سامانوں کے ایک یہ ہے۔ کہ مدرسہ کے لیئے چندہ بھی کیا جا رہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ طیب خاطر سے ہو اور جب ان چیزوں کی ضرورت ثابت ہوگی۔ کہ بغیر ان کے کام نہیں چلتا۔ چنانچہ اگر کتابیں نہ ہوں تو سلف کی باتیں ہم تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں اور بغیر مدارس قائم کیئے تعلیم کتب ممکن نہیں۔ لہذا یہ بدعت نہیں ہے۔ بلکہ سنت ہے۔ کیونکہ اس درس تدریس سے بھی مقصود تبلیغ ہی ہے۔ خواہ بلاواسطہ یا بالواسطہ۔ چنانچہ بلاواسطہ تو تبلیغ مخاطب اول کو ہے۔ یعنی طلبہ کو اور بالواسطہ مخاطب ثانی کو۔ یعنی عوام کو۔ سو یہ درس وتدریس تبلیغ کا اتنا بڑا فرد ہے۔ مگر ہم نیت تبلیغ نہ کرنے سے اس کے ثواب سے محروم ہیں۔ انما الاعمال بالنیات۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نیت نہ کرنے سے اعمال کا ثواب نہیں ملتا۔ گو عمل متحقق ہو جاوے اور بعض اعمال تو بلانیت متحقق ہی نہیں ہوتے۔ کیونکہ اعمال دو قسم کے ہیں۔ بعض اعمال تو ایسے ہیں۔ کہ ان کا تحقق بھی بلانیت نہیں ہوتا اور بعض ایسے ہیں۔ کہ ان کا تحقق تو ہو جاتا ہے مگر ثواب نہیں ملتا۔ جیسے پڑھنا اور پڑھانا کہ اس کا تحقق بلانیت بھی ہو جاتا ہے۔ مگر ثواب نہیں ملتا بخلاف نماز روزہ کے۔ کہ ان کا تحقق ہی بلانیت نہیں ہوتا۔ چاہے یوں جہل سے کہہ لے کہ ہمارے یہاں تحقق نماز بدون نیت بھی ہو جاتا ہے۔

جیسے کسی نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے دو میاں بی بی کے نکاح کے متعلق مسئلہ پوچھا۔ کہ ان کا یہ رشتہ ہے۔ ان میں نکاح ہو جاوے گا۔ یا نہیں۔ مولانا نے فرمایا، نہیں ہو سکتا۔ تو وہ کیا کہتا ہے۔ کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا۔ اور جیسے ایک گنوار بے وضو نماز پڑھا کرتا تھا۔ کسی واعظ سے سنا کہ بلا وضو نماز نہیں ہوتی۔ تو وہ کہتا ہے کہ بارہا کر دیم و شد۔ اسی طرح اس گنوار نے سمجھا کہ

بس ایجاب و قبول ہو گیا۔ تو نکاح ہو گیا۔ حالانکہ رفع موانع شرائط تحقق سے ہے۔ مگر بعض اعمال بغیر نیت کے بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر اجر نہیں ہوتا، جیسے تعلیم و تعلم سو ہم لوگوں کا کتنا بڑا احسان ہے۔ کہ چوبیس گھنٹہ ہم اس میں مشغول۔ مگر نیت نہ ہونے سے ثواب سے محروم۔

رہا یہ شبہ کہ اگر نیت بھی دین کی اور تبلیغ کی ہوتی۔ تب بھی ثواب نہ ملتا۔ کیونکہ اس کے ساتھ تنخواہ کی بھی تو نیت ہے اور یہ دنیا ہے تو نیت تبلیغ کے بعد بھی ثواب کہاں ہوتا۔ کیونکہ خالص تبلیغ ہی کی تو نیت نہیں۔ بلکہ مدرسین کو تو تنخواہ بھی مطلوب ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے۔ ایک تو وہ تنخواہ لینے والا ہے جس کو مقصود اصلی صرف نوکری اور تنخواہ ہے۔ ایک اور وہ جو تنخواہ نفقہ کے طور پر لیتا ہے۔ جیسے قاضی بیت المال سے تنخواہ لیتا ہے اور اصل مقصود اس کا خدمت دین ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ جس کو مقصود بالذات دُنیا تھی۔ اس کو ثواب نہیں ملے گا اور جس کو مقصود بالذات دین ہے بلکہ روپیہ جس گزر اوقات کے لئے لیتا ہے اس کو ثواب ملے گا۔ اگر یہ شبہ ہو کہ جب دین کے ساتھ دنیا کا بھی خیال ہے تو مجموعہ تو دُنیا ہی ہوا۔ کیونکہ مرکب دین و دنیا سے دنیا ہے۔ کیونکہ نتیجہ تابع اخس کے ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ جس کو تنخواہ مدنظر نہیں، صرف گزر اوقات کے لئے لیتا ہے۔ اس کا مقصود تنخواہ کو کہا ہی نہ جاوے گا۔ خواہ بلا شرط ہو یا بالشرط۔ ورنہ قاضی، مفتی بلکہ خلفاء راشدین کسی کو بھی ثواب نہ ملتا۔

اب اس کی علامت کیا ہے کہ اس شخص کو مقصود صرف دین ہے اور تنخواہ صرف رفع حاجت کے لئے۔ سو اس کی علامت یہ ہے۔ کہ جس کو تنخواہ ملتی ہے۔ اس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے۔ کہ جتنی تنخواہ اس کو ملتی ہے وہ اس کے نان و نفقہ کو کافی نہیں۔ اس حالت میں تو دوسری کوئی بڑی نوکری

تلاش کرنا اس کے لئے یہ علامت قصدِ دنیا کی نہیں ۔لیکن اگر وہ رفع حوائج کے لیے کافی ہے ۔معاش میں کوئی تنگی نہیں ہے اور پھر بھی اس کو بڑی ملازمت کی تلاش ہے ۔کہ اگر دوسری جگہ زیادہ تنخواہ ملے تو فوراً چلا جائے اور اس وقت محض ترقی ہی کی وجہ سے جاتا ہے ۔یہ تو علامت اس کی ہے ۔کہ اس کو دین مقصود نہیں دنیا مقصود ہے اور دوسری حالت یہ ہے ۔کہ کفایت کی صورت میں دوسری جگہ کی تلاش نہ ہو اور ملے بھی تو نہ جائے ۔یہ علامت ہے کہ دین مقصود ہے۔

ہاں یہ بھی دیکھا جاوے گا ۔کہ اس شخص سے دونوں جگہ دین کا نفع برابر ہے یا دوسری جگہ زیادہ ہے ۔اگر اس سے دوسری جگہ کو ترجیح ہے ۔تو اور بات ہے ۔بشرطیکہ قصد دین کا ہو ۔ورنہ اگر دوسری جگہ کو نفع دینی زیادہ ہو ۔مگر مقصود اس کا یہ نہیں ۔بلکہ مقصود تو ہے ترقی دنیا اور نفع دینی کو آڑ بناتا ہے تو اس شخص کی نسبت کہا جاوے گا ۔کہ یہ ملازمت محض دنیا کے لیے کرتا ہے دین کے لیے نہیں کرتا ۔دین کے لیئے ملازمت وہ ہے ،جس میں عزم دین کا ہو ۔اس کو ہر شخص دل میں ٹٹول کر دیکھ لے ۔حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے ۔محض لفظی نیت سے کام نہیں چلتا۔

جیسے ایک دفعہ کانپور میں میں مسافرانہ طور سے گیا ہوا تھا اور دوسری جگہ جانے کو تیار ۔ٹکٹ لینے کے لیئے آگے آدمی کو بھیج دیا اور خود عشاء پڑھ کر جانے کو تھا ۔عشاء کی امامت کے لیئے مجھ سے کہا گیا ۔میں نے کہا ، اگر کوئی مقیم پڑھا دے تو بہتر ہے ۔شاید بعض مقتدی امامتِ مسافر کے مسائل سے ناواقف ہوں تو ایک صاحب فرماتے ہیں کہ تم اقامت کی نیت کر کے پوری نماز پڑھا دو ۔تو ظاہر ہے ۔کہ وہ نیت لفظی یا خیالی نیت ہوتی حقیقی نیت نہ ہوتی ۔غرض محض تصور سے کچھ نہیں ہوتا ۔کیونکہ تصورِ نیت نیت نہیں ۔جیسا تصورِ کفر کفر نہیں ۔بلکہ عزمِ کفر کفر ہے ۔اسی طرح تصورِ ریاء ریاء نہیں ۔بلکہ عزمِ ریاء

رہا ہے۔

بہر حال مقصود کو دیکھنا چاہیئے اور ہر شخص اپنے وجدان کو دیکھے کہ اس وقت جہاں تنخواہ پر کام کر رہا ہے۔ اگر دوسری جگہ اس سے زیادہ ملے۔ تو چلا جاوے گا یا نہیں۔ اگر زیادہ ملنے پر بھی نہ جاوے۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ شخص حسبۃ للہ کام کرتا ہے۔ ورنہ اجیر ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اُجرت لینے میں گناہ نہ ہو۔ کیونکہ امام شافعی جواز کے قائل ہیں اور ہمارے علماء نے اس پر فتوے دے دیئے ہے۔ مگر گفتگو اجر و ثواب میں ہے۔ یہ میری رائے ہے۔ اگر غلطی ہو تو مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ جو شخص نفقہ قاضی کے طور پر تنخواہ لیتا ہے اس کو اجر ملے گا، ورنہ نہیں۔

اب صرف ایک شبہ اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ جب یہ نفقہ قاضی کی مثل ہے تو پھر تنخواہ کی تعیین کریں۔ جواب یہ ہے۔ کہ تعیین تنخواہ محض رفع نزع کے لیئے ہے کیونکہ اصل معیار تو رفع حاجت ہے اور حاجت کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ۔ اور دراصل اس میں معتبر قول صاحب حاجت کا ہے۔ شاید کسی کو اس پر شبہ ہوتا۔ کہ ممکن ہے کہ حاجت پانچ روپے کی ہو اور اس نے بتلا دیئے دس روپیہ، پھر نزاع ہوتا۔ اس لیئے مصلحت یہ ہے کہ تعیین ہو جاوے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نفقہ زوجہ کہ اس میں بھی اصل عدم تعیین ہے کیونکہ وہ اُجرت نہیں، بلکہ حق واجب ہے اور اصل معیار اس کا حاجت ہے۔ چنانچہ قبل فرض قاضی بھی اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ لیکن بعض دفعہ مصلحت عدم نزاع کے لیئے قاضی نفقہ کی مقدار معین کر دیتا ہے اور ظاہر ہے فرض قاضی کے بعد بھی وہ نفقہ ہی ہوتا ہے اُجرت نہیں ہو جاتی۔ پس اگر تعیین منافی ثابت ہوتی۔ تو چاہیئے کہ نفقہ زوجہ بعد فرض کے نفقہ نہ رہے۔ بلکہ اُجرت ہو جائے اور اس کا کوئی قائل نہیں۔ یہ اجمالی جواب ہے۔ واللہ اعلم بتفاصیلہ۔ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اصلاح کر دی جائے۔ بغرض تنخواہ لینے

کے بعد بھی بعض صورتوں میں اجر ملتا ہے۔ جب اجر ملتا ہے تو پھر نیت تبلیغ کی کیوں نہ کی جائے۔ پس مدرسین و طلبہ تبلیغ کا ثواب سُن کر پڑھنا پڑھانا نہ چھوڑیں۔ بلکہ وہ اس میں نیت تبلیغ کرلیں۔

اقسامِ تبلیغ

اور اگر تبلیغ کی قسمیں کر دی جائیں۔ کہ ایک تبلیغ اصول و عقائد کی ہے۔ کفار کو۔ دوسری قسم تبلیغ فروع ہے مسلمانوں کو۔ تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا۔ پھر تو درس تدریس کا تبلیغ میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے اور جب تبلیغ کی مختلف قسمیں ہیں۔ تو اب یہ ضرور نہیں۔ کہ ہر شخص ساری قسمیں ادا کرلے۔ بلکہ اس کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے۔ پس ان سب کاموں کو خاص خاص جماعت کے سپرد کیا جائے۔ یعنی قابلیت اور مناسبت کو دیکھ کر تقسیم خدمات کی جائے۔ کیونکہ ہر ایک آدمی ہر ایک کام کے قابل نہیں ہوتا۔ خود قرآن سے بھی تقسیم خدمات کا ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ۔

اس میں حق تعالیٰ نے سب کو دفعۃً جہاد میں جانے پر عتاب فرمایا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے۔ کہ ایک جماعت جہاد میں جاتی اور ایک علم حاصل کرتی۔ اس سے اس آیت میں بحث نہیں کی۔ کہ اس تقسیم کے لیئے مرجع کیا ہے۔ کس کو علم تحصیل کرنا چاہیئے اور کس کو جہاد میں جانا چاہیئے۔ مگر اتنی بات ثابت ہو گئی۔ کہ دونوں میں مشترک خدمات کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح جب تبلیغ کے اقسام ہیں۔ تو کسی کو کوئی خدمت کرنا چاہیئے۔ کسی کو کچھ کرنا چاہیئے۔ سب ایک ہی کام نہ کریں۔ کہ اس سے دین کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔ باقی یہ پھر کہوں گا۔ کہ جو کچھ کرو اپنے بڑے سے پوچھ کر کرو۔ وہ متعین کر دیں گے۔ کہ کس کو کیا کرنا چاہیئے۔ وہ جس

کو پڑھنے کا حکم دیں وہ پڑھیں۔ جن کو تبلیغ متعارف کے واسطے مقرر کریں وہ مبلغ بنے پھر تبلیغ کے اندر جس کو جو خدمت سپرد کریں۔ وہ اسی کو انجام دے۔ مثلاً کسی کو مالی خدمت بتا دیں گے، کسی کو جانی، کسی کو تصنیف و تالیف کی۔ پس یہ مت سمجھو کہ یہ تبلیغ نہیں ہے۔ یہ بھی تبلیغ ہی ہے۔ کیونکہ مقدمات تبلیغ ملحق بالتبلیغ ہیں۔ پس مال دہندہ بھی مبلغ ہے اور احکام سنانے والا بھی مبلغ ہے اور مضامین لکھنے والا بھی مبلغ ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی سے پوچھو کہ تمہارے کھانے میں کیا صرف ہوتا ہے۔ تو وہ پانچ روپے بتا دے گا۔ مثلاً پھر اس کی تفصیل میں کوئلہ اور اُپلے کو بھی شمار کرے گا۔ مثلاً دو روپے کا اناج ہے اور ایک روپیہ کی دال اور چار آنے کے اُپلے۔ اب اگر کوئی کہے کہ میاں ہم تو تم سے کھانے کا حساب پوچھ رہے ہیں، تم اُپلے کو اس میں کیسے شمار کرتے ہو۔ تو کہا جاوے گا۔ کہ یہ شخص معترض احمق ہے۔ کیونکہ یہ بھی کھانے کے متعلقات میں سے ہے۔ کھانا بغیر لکڑی یا اُپلے کوئلہ کے کیسے پک سکتا ہے۔ یہ تو عرف کے موافق کلام ہے اور قواعد شرعیہ سے بھی ثابت ہے۔ کہ مقدمات شئے بھی اسی حکم میں ہوتے ہیں۔ جو اصل کا حکم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔

معلوم ہوا۔ کہ معاونت بر بھی بر ہے۔ کیونکہ اس میں تعاون بامور بر کے اور بامور بہ کا بر ہونا لازم ہے۔ بہر حال تبلیغ کے متعلق متعدد خدمات ہیں۔ پس ایک جماعت ایسی ہو۔ جو اشاعت اسلام کرے اور ایک جماعت ایسی ہو کہ مال سے اُن کی امداد کرے وغیرہ وغیرہ۔

طلباء اور تبلیغ

میں نے اس کو مکرر اس لیئے بیان کیا۔ کہ ہم لوگوں میں کام کے وقت غلو ہو جاتا ہے۔ کہ بس جدھر رُخ کرتے ہیں، سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑتے

عمر فاروق@ون اردو

ہیں۔ اس لیئے تبلیغ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ مدرسین وطلبہ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں۔ بلکہ اس کو اپنے بزرگوں سے پوچھو کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ آیا سبق چھوڑ کر چلے جاویں یا پڑھتے رہیں یا ایک وہاں سے چلا آوے، دوسرا جاوے۔ غرض اپنی رائے سے کچھ نہ کرو۔ ورنہ بجائے اصلاح کے فساد ہو گا۔

میں نے اس کو قصداً عرض کیا ہے۔ کیوں کہ میں یہ رنگ دیکھ رہا ہوں۔ کہ آج کل وہ طلبہ بھی جو علم سے فارغ نہیں ہوئے، تبلیغ میں مشغول ہونا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کے لیئے تکمیل علم اول ضروری ہے۔ کیونکہ اگر یہ پڑھنا پڑھانا نہ ہو تو تصنیف و تبلیغ وغیرہ بھی سب بے کار ہے۔ کیونکہ ناقص کی تبلیغ وغیرہ کچھ قابل اعتبار نہیں۔ بلکہ اس طرح تو چند روز میں علم بالکل معدوم ہی ہو جاوے گا تو تعلیم و تعلم بھی ایک فرد ہے تبلیغ کی۔

درجاتِ تبلیغ

اب دوسری بات کہتا ہوں کہ تبلیغ کی اس فرد کی طرف کچھ تو توجہ ہے۔ مگر اس کی جو دوسری فرد ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ اس کی طرف تو بالکل توجہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی ایک فرد اعظم ہے تبلیغ کی اور اس میں بھی ایک تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطاب خاص ایک خطاب عام۔ امر بالمعروف خاص تو آپ کے ذمہ ہے۔ یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتا اور امر بالمعروف عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں۔ بلکہ یہ صرف علماء پر واجب ہے اور امر بالمعروف خاص کا مدار قدرت پر ہے۔ یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے۔ اس کے ذمہ واجب ہے۔ کہ اس کو امر بالمعروف کرے مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ کی نصیحت کریں۔ خاوند پر فرض ہے۔ کہ اپنی بی بی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے۔ آقا کے لیئے لازم

ہے کہ اپنے نوکر چاکر اور جو ان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔

حدیث میں ہے:۔

مروا صبیانکم بالصلوٰۃ اذا بلغوا سبعا واضربوھم اذا بلغوا عشرا۔

غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ماتحتوں کو حکم کرے امور خیر کا اور خلاف شرع باتوں سے روکے۔ اس میں عالم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں جہاں علم درکار ہے۔ مثلاً کوئی مختلف فیہ مسئلہ ہے یا ایسا کوئی مسئلہ ہے۔ جس کے بہت شقوق ہیں اور وہ ان شقوق کا احاطہ نہیں کر سکا یا احاطہ تو کر لیا مگر وجہ معلوم نہیں کہ متفق علیہ مسئلہ ہے یا مختلف فیہ۔ مسئلہ مختلف فیہ میں گنجائش ہوتی ہے تو ایسا مسئلہ تبلانا ہر شخص کے لئے جائز نہیں۔ بلکہ جس کی نظر کافی نہ ہو اس کو ایسا مسئلہ بیان کرنا بھی جائز نہیں۔ یہ علماء کے بتلانے کا ہے۔ پس تبلیغ خاص کے لئے تو مسئلہ کی حقیقت کا پورے طور سے منکشف ہونا اور قدرت ہونا شرط ہے اور تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے۔ خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسائل سن سن کر عالم ہو گیا ہو۔ اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لئے معین کیا ہو۔ چنانچہ صحابہ نے کہاں پڑھا تھا۔ وہ بھی تو سن سن کر تبلیغ کرتے تھے۔ مگر ہر شخص خود نہ سمجھے کہ میں اس کے قابل ہوں۔ جب تک کوئی کامل نہ کہہ دے۔ کہ تم قابل ہو۔ بقول ایک حکیم کے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

جاہل مبلغ

جیسے آج کل بعض لوگ اردو کتابیں دیکھ کر وعظ کہنے لگے اور مسائل

ہیں ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ ترجمہ تک غلط کرتے ہیں۔

ایک عالم حکایت فرماتے تھے۔ کہ کسی مقام میں ایک واعظ آئے۔ وعظ میں انا اعطینٰک الکوثر کا ترجمہ کیا۔ کہ اے محمد! دیا ہم نے تم کو مثل کوثر کے۔ ان راوی عالم نے کہا کہ بھائی مثل کا ہے کے معنی ہیں۔ تو فرماتے ہیں۔ کہ یہ کاف کے معنی ہیں۔ یہ کاف تشبیہ کا کہلاتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ کہ حضرت یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے، یہ کاف خطاب کا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ کیا دلیل ہے کہ یہ تشبیہ کا نہیں۔ خطاب کا ہے۔ اب وہ چکرائے کہ اس جاہل کو کیسے سمجھائیں۔ سوچ کر کہا کہ وہ گول گول لکھا جاتا ہے۔ جب الف سے ملا ہوا ہو اور یہ ایسا نہیں۔ کہا۔ ہاں! مجھ کو معلوم نہ تھا۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ اس نے اتنا بھی مان لیا۔ ورنہ کہتا، کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ گول گول ہوتا ہے۔ اگر کہتے کہ استاد نے بتلایا ہے۔ کہتا کیا دلیل ہے کہ استاد نے بتلایا اور پھر استاد ہی کو نہ مانتے تو کوئی کیا کر لیتا۔ مگر پھر بھی اس میں دین کی اہلیت تھی۔ کہ اس نے اپنی غلطی کو مان لیا۔ ورنہ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات منہ سے نکل جاتی ہے۔ خواہ وہ بالکل ہی غلط ہو۔ مگر غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے۔ تو آج کل ایسے ایسے جاہل بھی وعظ کہنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

خود یہاں دیوبند ہی کی میرے سامنے کی حکایت ہے۔ کہ ایک جاہل اندھا واعظ آیا۔ اس زمانہ میں مولانا رفیع الدین صاحب بھی تشریف رکھتے تھے ان ہی کی مسجد کا قصہ ہے۔ بعد مغرب وعظ شروع کیا۔ وعظ میں یہ آیت پڑھی۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

آیت کے اول جز کا ترجمہ تو قریب قریب ٹھیک بیان کر گئے۔ آگے دوسرے جز میں تماشا کیا۔ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا آپ نے

یہ ترجمہ کیا۔ کہ یہ بہتر ہے تمہارے لیئے کہ دوکان کو تالا لگادو۔ آپ نے تغلون کی گت بنائی۔ اس کو تالا موند سمجھا۔ مگر قرآن میں تو مون ہے موندنا کہاں۔ مگر شاید وہ کہتا کہ یہ مون مرخم ہے موند کا۔ حالانکہ موندنا اس معنی میں مستعمل بھی نہیں ہوتا بلکہ کیواڑ بند کرنے کو موندنا کہتے ہیں نہ کہ تالا لگانے کو۔ مولانا کو غصہ آیا۔ پوچھا کہ یہ ترجمہ تو نے کہاں سیکھا۔ تو سیکری میں ایک شخص بہت ظریف تھے۔ ان کا نام مولوی صادق علی تھا۔ کہا کہ مجھ کو مولوی صادق علی نے یہ ترجمہ بتلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا ایسے اس نے تجھے پڑھانے کو ایسا ترجمہ بتلایا ہے۔ تو اگر ایسے لوگوں کو وعظ گوئی کی گنجائش دی جائے تو بڑا مفسدہ پھیلے گا۔ مگر ہاں بعض ان پڑھ بھی صاحب کمال اور دیندار فہیم ہوتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی اچھا ہوتا ہے اور باوجود اس کے اگر کوئی بات ان سے پوچھی جاوے اور ان کو معلوم نہ ہو۔ تو صاف کہہ دیتے ہیں۔ کہ ہمیں معلوم نہیں۔ ان کو وعظ کہنا کسی عالم کی اجازت کے بعد جائز ہے۔ اب تو یہ مصیبت ہے کہ جو لوگ نام کے مولوی بھی ہیں اور بدون تحقیق مسئلہ بتلانے کی وعید بھی جانتے ہیں۔ ان کو بھی یہ کہتے ہوئے عار آتی ہے کہ ہمیں معلوم نہیں۔ بس ان سے جو بات بھی پوچھی جاوے فوراً بتلانے کو تیار اور گوبڑ کر کے جواب دے دیتے ہیں۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک بالکل بددین اور ایک کچھ دیندار ہیں۔ جو بددین ہیں وہ تو غلط سلط بتلاتے ہیں۔ اور جو ذرا دیندار ہیں، وہ گول گول جواب دیتے ہیں۔ کہ مخاطب کو جواب کا کچھ پتہ ہی نہ چلے اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کو مسئلہ معلوم نہیں۔ وہ اس طرح اپنی جہالت کو چھپاتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے۔ کہ گنگوہ میں ایک جاہل مفتی تھے۔ مولانا نے امتحاناً ان سے پوچھا کہ حاملہ سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ مولانا نے مسئلہ بھی چھانٹ کر وہ پوچھا جو بہت ہی شقوق رکھتا ہے۔ مگر وہ شخص تھا متدین۔ یہ جواب دیا کہ بیوہ حاملہ سے نکاح کرنا ایسا ہے۔ جیسے گھیرا دے دینا۔ پوچھا کہ

مطلب کیا ہے۔ کہا تم خود سمجھ لو۔ غرض وہ بڑا ہوشیار تھا۔ جواب ایسا دیا۔ کہ مخاطب کو کچھ پتہ ہی نہ چلے، نہ حلت کا پتہ لگے، نہ حرمت کا اور نہ عقیدہ بگاڑا۔ مگر سائل کو کیا حاصل ہوا بجز اس کے کہ متحیر رہے۔ مگر خیر پہلے کچھ تو اہلیت تھی۔ اب تو منگھڑت سے بھی باک نہیں۔ کوئی کچھ ہی پوچھے، جواب تراش کر کہہ ڈالا۔ خواہ غلط ہی ہو۔ تو ایسوں کو تو وعظ کہنا حرام محض ہے۔ البتہ اگر کوئی جاہل اچھا حافظہ والا ہو اور اس کے اندر تدین بھی ہو اور کوئی عالم اس کو اجازت دے۔ تو اس کو وعظ کہنا جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ عالم پہلے اس کی متعدد تقریریں بھی سن لیں۔ پھر اجازت دیں۔

مولانا عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک اُمی شخص وعظ کہتا تھا۔ مگر اس کا حافظہ ایسا اچھا تھا کہ وہ شاہ صاحب کے وعظ کو ازبر یاد کر لیتا تھا۔ تو ایسے شخص کو اجازت ہے۔ جب کہ ہر پہلو سے یقین ہو جاوے۔ کہ قوی الحافظہ ہے، متدین ہے اور اس کے دین کی بھی جانچ کر لی ہو۔ جیسے ڈاک خانہ کے افسر اپنے ہاتھ سے ڈاک کے خانہ میں اپنے نام کے خطوط چھوڑ چھوڑ کر ڈاکیہ کی جانچ کے لیئے دیکھتے ہیں کہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح مختلف جلسوں میں اس شخص سے مسائل پوچھو اور پھر دیکھو جو باتیں اس کو معلوم نہیں ہیں، ان کا کیا جواب دیتا ہے۔ اگر کہہ دے کہ معلوم نہیں۔ تو سمجھ لو کہ اس میں تدین ہے۔ اسی طرح اگر کسی طالب علم کو وعظ کے لیئے متعین کیا جائے تو جائز ہے۔ مگر اس کے حدود مقرر کر دو۔ کہ اس حد تک کام کرو، آگے نہ بڑھو۔ آخر دنیا کے بھی تو ہر کام کی ایک ایک حد ہے۔ کہ اس حد سے تجاوز جائز نہیں رکھا جاتا۔

ہر فرد اُمت کے ذمہ دعوت

غرض اس طریق سے سب کو تبلیغ میں مشغول ہونا چاہیئے۔ جس سے جتنا

ہو سکے۔ اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے کسی کی تخصیص نہیں فرمائی۔ بلکہ ادع الیٰ سبیل ربک میں عام حکم دے دیا ہے اور یہاں جو بظاہر خطاب حضور کو ہے تو مقصود خاص حضورؐ ہی کو خطاب کرنا نہیں ہے، بلکہ عام ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ۔

کہ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت کرتے ہیں۔ اس تفسیر پر انا ضمیر ادعو کی تاکید ہے اور من اتبعنی اس پر معطوف اور گر علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے۔ کہ میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے متبعین بھی۔ اس صورت میں یہ مستقل جملہ ہو گا۔ یعنی علی بصیرۃ خبر مقدم اور انا مع اپنے معطوف کے مبتدا مؤخر اور ادعوا کا معمول نہ ہو گا۔ مگر چونکہ دوسری نصوص میں وعید عدم دعوت کی عام ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ایک حدیث ہے۔ کہ جو لوگ امر بالمعروف نہیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو عتاب عام کرے گا اور آپ نے استشہاد کے لیئے یہ آیت پڑھی:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً۔

تو اس کے انضمام سے معلوم ہوا۔ کہ امت کا ہر فرد بھی وجوب دعوت کے حکم میں داخل ہے۔

نیز حضورؐ نے فرمایا ہے۔ کہ پہلی امتیں امر بالمعروف کے ترک سے ہلاک ہوئی ہیں اور امم سابقہ کے حالات نقل کر کے اگر ان پر نکیر نہ کیا جائے تو وہ بھی حجت ہے۔

اور سنیئے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے صید کے قصہ میں فرمایا ہے:۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا۔

یعنی بعض صلحاء نے دوسروں سے کہا تھا کہ ان نافرمانوں کو نصیحت

کیوں کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔

قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ۔

کہ خدا کے یہاں عذر قائم کرنے کے لیے تاکہ معذور سمجھے جائیں۔ کہ ہم نے تو ان سے ترکِ معصیت کے لیے کہا تھا۔ مگر انہوں نے نہیں مانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نصیحت میں تخصیص کسی کی نہیں۔ بلکہ امتی کے ذمہ بھی امر بالمعروف ضروری ہے اور حکم سب کو عام ہے۔ ہاں اس میں وہ تفصیل کہ کس کے ذمہ کیا حکم ہے۔ یعنی تبلیغ خاص ہے یا عام ہے۔ سو اس کو میں نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ تبلیغ عام علماء کا منصب ہے۔ تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے۔ بہر حال حکم عام ہے۔ باقی خطاب کا خاص ہونا خصوصیتِ مقام سے ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر جگہ قرآن میں خطاب خاص ہی ہے۔ لیکن جب آپ کسی حکم کے مامور ہیں۔ تو اور سب تو بطریقِ اولٰی مامور ہوں گے۔ جب کہ کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو۔

چنانچہ قاعدہ ہے۔ کہ سلاطین کا خطاب اوّل بڑوں کو ہوا کرتا ہے اور چھوٹے ان کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ جب مقربین کو کسی بات کا حکم ہے۔ تو غیر مقربین پر تو فرض متحتم ہو گا۔

پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔

اس میں سبیل رب کی طرف بلانے کا حکم ہے۔

طریق دعوت

اب رہا یہ کہ طریقہ کیا ہے دعوت کا۔ سو اس کے متعلق حق تعالےٰ نے تین چیزیں بتلائی ہیں۔ دعوت بالحکمۃ۔ دعوت بالموعظۃ الحسنۃ اور ایک مجادلہ۔

یعنی ایک قسم تو دعوت کی یہ ہے کہ حکمت کے ساتھ کی جائے۔ دوسری قسم یہ ہے موعظۃ حسنہ کے ساتھ دعوت کی جاتے اور ایک یہ کہ مجادلہ حسنہ کیا جاتے۔ اس کی ترجیہ مختلف ہو سکتی ہے۔ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ جب کسی کو سبیل رب کی طرف دعوت ہوگی۔ تو اس میں ایک تو دعوئے خاص داعی کا مطلب ہوگا اور ایک اس کی نقیض ہوگی۔ جو کہ مذہب مخالف کا ہے۔ پھر گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک اپنے دعوے کا اثبات اور دوسرے کے دعوے کا ابطال۔ تو حکمت یہ ہے کہ اپنے دعوے پر علمی دلائل قائم کیے جاویں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعی کو باطل کیا جائے اصل مقصود تو یہ دونوں ہیں۔ باقی تیسری ایک چیز اور ہے وہ موعظۃ حسنہ ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے۔ اس لئے موعظۃ حسنہ بھی ایک طریق بتلا دیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پری کر دیتا ہے۔ دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے۔ مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے۔ صرف حکم کا پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے۔ اب تم مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس بات کو مقتضی ہوتی ہے۔ کہ کسی صورت سے اس کو منوا لوں۔ اس لئے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے۔ کہ بیٹا مان ہی لے۔ تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ظاہر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں۔ پھر حضور جیسا کوئی خیر خواہ نہیں۔ تو محض شفقت ہی کے مقتضا سے اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور کو اور ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے۔ کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو۔ بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو۔ جس کی حقیقت تقابل سے معلوم

ہوتی ہے. کہ حکمت سے جب علمی دلائل مراد ہیں. تو مو عظہ حسنہ سے دلائل کے علاوہ کچھ اور مراد ہو گا. سو وہ ایسے مضامین مؤثرہ ہیں، جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو، دل پگھل جاوے اور ان مضامین مرققہ کا مصداق ترغیب وترہیب ہے کہ درجات جنت کی ترغیب اور درکات جہنم سے ترہیب کرنا خود ذٰلک غرض اصل مقصود تو احکام کا سُنانا ہے. خواہ اصل ہوں یا فروع.

باقی ایک درجہ مخاطب کے متاثر کرنے کے لیئے ترغیب وترہیب کا بھی ہے. گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے. مثلاً جنت اور دوزخ کا مضمون عقیدہ کے درجہ میں تو احکام ہی میں داخل ہے اور اصُول میں ہے. مگر دوسری حیثیت سے ترغیب و ترہیب ہے. یعنی جہاں احکام سُنانا اور جنت ودوزخ کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو. صرف ترقیق قلب مقصود ہو، وہاں ترغیب وترہیب ہے. مثلاً کسی کو کہا کہ اگر نماز پڑھو گے. تو ایسی جنت ملے گی. جس کی یہ شان ہے. یہ حالات ہیں. اس کے اندر ایسی ایسی آسائشیں ہیں اور اگر نہیں پڑھو گے تو دوزخ میں جاؤ گے. جس کے یہ واقعات ہیں. تو یہ مضمون ترغیب وترہیب کی حیثیت سے محض مرقق ہے قلب کا. اس سے مخاطب کے قلب میں صلاحیت احکام قبول کی پیدا ہو گی. پھر عمل کرنے کی توفیق ہو گی. کیونکہ عمل اوّل اوّل تکلف سے ہوتا ہے. کیوں کہ طبیعت کے خلاف کام ہے. اس واسطے کوئی اُمر آمادہ کرنے والا اور اُبھارنے والا ہونا چاہیئے. طبیعت کے خلاف دُنیا کا کوئی کام بھی بلا طمع یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا. پھر عادت ہو جاتی ہے تو ترغیب وترہیب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی. اس لیئے ترغیب کی بھی ضرورت ہوتی اور ترہیب کی بھی. شفیق کی تعلیم ایسی ہی ہوتی ہے. مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی مضر سے روکتا ہے. تو اتنا کہہ دینا کہ یہ چیز مت کھانا، حاکمانہ حق ادا کرنے کے لیئے کافی ہے. آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے. مگر

باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے۔ کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے، دست آور ہے۔ اسے مت کھانا۔ یہ پیٹ میں درد پیدا کر دے گی۔ اس کے کھانے سے پھنسیاں نکل آئیں گی۔ تو اتنا لگنا لپٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے۔ ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے۔ کہ اگر یہ دوا پی لوگے۔ تو تم کو یہ دوں گا، وہ دوں گا۔

خود میرا ایک واقعہ ہے بچپن میں ایک دفعہ بیمار ہوا۔ تو حکیم صاحب نے مسہل تجویز کیا۔ مگر میں پیتا نہ تھا۔ تو والد صاحب نے کہا اگر دوا پی لوگے۔ تو تم کو ایک روپیہ دوں گا۔ بس روپے کے لالچ میں پی گیا۔ تو اس واسطے ضرورت ہے ترغیب و ترہیب کی۔ کیونکہ ایسے آدمی بہت کم نکلیں گے۔ جو بلا ترغیب و ترہیب کے امتثال امر کرلیں۔ گو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو بلا ترغیب ترہیب کے بھی کرلیتے۔ جیسے ایک صحابی کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے۔ لو لم یخف اللہ لم یعص کہ اگر اس کے دل میں خوف خدا بھی نہ ہوتا۔ تب بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتا۔ تو بعض کو تو فطری طور پر خدا سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر اکثر تو خوف ہی سے کچھ رُکتے ہیں۔ پھر وہ درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ لیکن اول ہی سے ایسے کم ہوتے ہیں۔ مثلاً بچہ پہلے پہلے مار دھاڑ سے پڑھتا ہے اور پھر تو اگر سبق کے لئے اپنے پاس سے بھی خرچ کرنا پڑے، جب بھی نہ چھوڑے۔ تو اس لئے ترغیب ترہیب کی ضرورت ہے یہ موعظۃ حسنہ ہے۔

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کی کتنی بڑی شفقت ہے۔ کہ حضورؐ کو اور امت کو یہ ترکیب بتلائی۔ کہ آپ اس طریقہ سے کام کیجئے۔ کس قدر رحمت ہے کہ دشوار عمل کو کس طرح آسان کر دیا۔

رعایتِ مخالف

اس کے بعد ارشاد ہے۔ جادلہم یعنی اُن سے مجادلہ کیجئے۔ اس میں دو احتمال تھے۔ ایک مجادلہ حسنہ کا، ایک سیئہ کا اس لیئے احسن کی قید لگا دی۔ اور مجادلہ سیئہ سے ممانعت کر دی۔ رہا یہ کہ مجادلہ میں تو احسن کی قید لگائی اور حکمت کے ساتھ حسنہ کی قید کیوں نہیں لگائی۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس میں غیر حسنہ کا احتمال ہی نہیں۔ کیوں کہ اپنے دعوے کی دلیل بیان کرنے میں کسی کو ناگواری نہیں ہوتی اور دوسرے کے دعوے کو رد کرنے میں اسے کبھی انقباض ہوتا ہے۔ اس لیئے وہاں قید نہیں لگائی اور یہاں قید لگائی کہ رد اگر ہو احسن طریقہ سے ہو۔ جس سے کسی کو رنج اور کلفت نہ ہو۔ سبحان اللہ! کس قدر شفقت ہے، عباد پہ کہ مخالف کی اتنی رعایت کہ اس کا رد اگر ہو، ایسے طریقے سے ہو کہ اس پہ حقیقت تو منکشف ہو جائے، مگر بُرا بھلا کسی کو نہ کہا جائے۔

اور میں نے جو رد میں یہ قید لگائی۔ کہ حقیقت ظاہر ہو جائے یہ اس لیئے ہے کہ بعض دفعہ جواب ایسا گول مول ہوتا ہے۔ کہ خصم پہ حقیقت بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے۔ اس لیئے چاہیئے کہ کہے، تو صاف صاف۔ مگر احسن طریقہ سے۔ چنانچہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا یہی مطلب ہے۔ کہ کھول کے صاف صاف بیان کرو۔ ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی۔ جو شخص گول مول بات کرتا ہے۔ اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے۔ مگر اس کا اثر برابر ہوتا ہے۔ کہ مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لیئے ضروری ہے کہ بات صاف ہو۔ مگر الفاظ سخت نہ ہوں۔

قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ کا یہی مطلب ہے کہ سخت الفاظ سے بچو۔

باریک ادب

اب ایک باریک ادب تبلیغ کا اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ تبلیغ کر کے ظہور نتیجہ و حصول ثمرہ کی فکر میں نہ پڑنا چاہیئے۔ بعض دفعہ اس سے بہت برا اثر ہوتا ہے اور یہ بالخصوص مبلغ شفیق کو پیش آتا ہے۔ جاد لھم سے تو یہ معلوم ہوا کہ تبلیغ شفقت کے ساتھ ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ تبلیغ کے بعد بھی شفقت کی وجہ سے اس کی فکر میں لگے رہو۔ اس میں ایک فائدہ ہے۔ جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں اور ہے واقع میں نقص اس سے تبلیغ کے اندر نقصان ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب شفقت زیادہ ہوتی ہے تو نتیجہ عاجلہ پر نظر ہوتی ہے۔ مگر اس نتیجہ کو اول سوچ لیتے ہیں۔ کہ اس کا یہ اثر ہو گا۔ حالانکہ اصل نتیجہ رضائے حق ہے اور وہ تبلیغ بطریق مذکور پر فوراً مرتب ہو جاتا ہے اور ثمرہ عاجلہ بھی اگر ہوتا ہے۔ اسی کی برکت سے مرتب ہوتا ہے۔ مگر ہم لوگوں کے اندر عجلت زیادہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ جلدی اثر ہو جائے۔ گو اس میں نیت دین ہی کی ہو۔ مثلاً کسی کو نماز سکھاتے ہیں۔ تو اس کا ثمرہ عاجلہ یہ چاہتے ہیں۔ کہ ہم اپنی آنکھ سے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیں۔ اسی طرح تبلیغ اسلام میں یہ چاہتے ہیں کہ ہماری تحریک کے ساتھ ہی بہت سے مسلمان نظر آنے لگیں اور اس میں بعض وقت یہ مصلحت بھی نیت میں ہوتی ہے۔ کہ اس سے اہل حق کا مجمع زیادہ ہو گا اور حق بڑھے گا۔ تو حق کو قوت ہو گی اور جب اہل حق کو قوت ہو گی اہل باطل مغلوب ہوں گے۔ تو وہ مضرت بھی نہ پہنچا سکیں گے۔ یہ مصلحت پیش نظر ہو تو یہ دین ہے۔ مگر اس میں غلو نہ چاہیئے۔

اور اگر ثمرہ دنیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہمارا نام ہو گا۔ کہ یہ خوب کام کرتا ہے تو وہ تو ہے ہی برا، اگرچہ بصورت نماز ہی ہو۔ غرض بعض وقت ثمرہ دینی ہوتا ہے اور کبھی دنیاوی۔ مگر یہ سب ثمرات عاجلہ ہیں۔ جن پر بعض مبلغین کی

نظر ہوتی ہے۔ پھر اگر ان ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو حزن و ملال ہوتا ہے اور
بعض وقت یاس تک نوبت آجاتی ہے اور مخاطب پر غیظ پیدا ہوتا ہے اور
حاضر یا غائب بُرا بھلا کہتے ہیں۔ کہ جا نالائق! تجھے اس قدر سمجھایا، اتنی کوشش
کی۔ مگر تُو نے سمجھا ہی نہیں۔ میری اوقات کو ضائع کیا۔ اپنی محنت ہی رائیگان
گئی اور اگر اس پر قدرت ہوتی ہے۔ تو کبھی اس کو سزا بھی دے دیتے ہیں اور
وہ بھی اعتدال سے زیادہ اور بعض وقت دل تنگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جا جاڑ
میں پڑ۔ کام چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یہ اثر ہوا ثمرات پر نظر ہونے سے۔

بظاہر تو جب مبلغ کو محزون اور غمگین دیکھا جاتا ہے۔ اس کا بڑا ہی کمال
سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا مبلغ شمار کیا جاتا ہے۔ کہ اس سے زیادہ اور کیا
کمال ہوگا۔ کہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہے اور دوسروں سے بھی کہہ رہے ہیں
کہ بھائی اس کے لئے دعا کرو۔ کہ اس کی اصلاح ہو جاتے۔ مثلاً اگر اپنا بیٹا نماز نہیں
پڑھتا تو اس کو سمجھاتے ہیں، کڑھتے ہیں، دل سے دعا کرتے ہیں، اور دوسروں سے
بھی دعا کراتے ہیں۔ کسی سے کہتے ہیں اجی! ایک تعویذ ہی کر دو۔ یہ سب افعال
گو محمود ہیں۔ مگر جب غلو ہو جاتا ہے۔ تو اس کا اثر بُرا ہوتا ہے۔ کہ اس کا انجام
یاس اور یاس کا انجام تعطل ہوتا ہے۔ تو جس کو آپ نے تبلیغ کا فرد کامل سمجھا تھا۔
اب وہ مفضی الی التعطل و ترک التبلیغ ہو گیا اور تبلیغ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ سو یاد
رکھو جو درجہ شفقت کا ایسا ہوگا۔ وہ کامل نہیں، بلکہ ناقص ہے۔ حاصل اس ادب
کا یہ ہوا۔ کہ ثمرات کے مرتب نہ ہونے سے محزون نہ ہو۔ ایک طبعی حزن ہوتا
ہے۔ اس کا تو مضائقہ نہیں، بلکہ اس میں ثواب ہوگا اور یہ کہ اس میں غلو اور
مبالغہ ہو جائے۔ کہ ثمرہ مرتب نہ ہونے سے ہمت ہی توڑ دے اور روتے
روتے آنکھیں پھوڑ دے۔ یہ بُرا ہے۔ نصوص کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے۔
کہ اتنے حزن و ملال کی اجازت بھی نہیں۔

حق تعالیٰ جا بجا فرماتے ہیں:۔

لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ. لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ اور لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ اور مَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ اور فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ.

یہ سب آیات مبالغہ فی الحزن سے منع کرتی ہیں. یعنی اتنا حزن جس سے اپنی صحت ہی برباد ہوجائے یا کام سے تعطل ہوجائے. اس کی اجازت نہیں. کوشش کی ممانعت نہیں. اس کا تو حکم ہے. مگر عدم ظہور نتائج پر اس درجہ کا حزن مضر ہے. اللہ تعالٰی اس آیت میں جادلہم کے بعد اس ضرر کا تدارک کیا عجیب فرماتے ہیں:۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ.

یعنی تبلیغ کر کے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو. یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے. یہ بھی ایک درجہ ربط ہے. ماقبل کو مابعد سے اور ممکن ہے اور کوئی درجہ ربط اس سے بھی عمدہ کسی کی سمجھ میں آجاوے. تو گویا اس مقام میں اللہ تعالٰی نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے. یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے اس کے تدارک کے لیے فرمایا. ادع الٰی سبیل ربك الآیة.

اور ایک افراط فی التبلیغ سے اس کی ممانعت اس جزو میں مذکور ہے:۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ.

غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہوجاتا ہے، کبھی تفریط. یہ دونوں مضر ہیں. اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شفقت کی کمی کا تو احتمال ہی نہ تھا. یہ تو مجموعی انتظام ہم لوگوں کے واسطے فرمایا گیا ہے. کہ تبلیغ میں نہ افراط کرنا نہ تفریط. چنانچہ اول میں تفریط کا انسداد ہے اور آخر میں افراط کا. جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک درجہ تبلیغ کا یہ بھی ہے. آخر میں ناکامیابی سے اتنا غم سوار ہوتا ہے. کہ یاس کی نوبت آجاتی ہے. اس کے بعد تعطل ہوجاتا ہے. اس کے متعلق فرماتے

ہیں۔ کہ آپ کو اس سے کیا بحث۔ ثمرہ ہو یا نہ ہو آپ اپنا کام کیے جائیے۔ ثمرات کا مرتب کرنا ہمارا کام ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت میں ہے۔

ایک اور جگہ لطیف عنوان سے اس کو بیان فرمایا ہے:۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ۔

جن کے اندر شفقت ہے وہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ مخاطب کے عدم تاثیر سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ سو نفس حزن کی ممانعت نہیں۔ وہ تو طبعی اور غیر اختیاری ہے۔ اس میں انسان مجبور ہے۔ بلکہ ممانعت اس کی ہے جو حد ضیق تک پہنچے۔ اس لیئے فرماتے ہیں:۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔

آپ کو اس سے کیا کہ کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا۔ اس کو اللہ جانتا ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ اس کو خدا کے سپرد کر دیجئے اور جہاں اتنی شفقت نہ ہو اور اس لیئے تیز لہجہ اور سختی سے تبلیغ کرنے لگیں۔ اس کی بھی ممانعت فرما دی ہے۔

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔

غرض ایک ہی مقام کی آیتیں افراط تفریط دونوں کی ممانعت کے لیئے کافی ہو گئیں۔ امید ہے کہ اب بقدر ضرورت یہاں کافی ہو گیا ہے۔

مسلمات سے جواب

ایک مضمون اور رہ گیا۔ اس کے لیئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مقدمہ مقصود کا مقصود ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ فقہی مسئلہ ہے مقدمۃ الواجب واجب تو اس وقت جن چیزوں کا تبلیغ کے لیئے موقوف علیہ ہونا ثابت ہو جاوے خواہ

ولاہ لاتمنع کے درجہ یا مصحح لدخول الفاء کے درجہ میں۔ مثلاً وہ امور جن کو اہل بصیرت بتلادیں۔ کہ تبلیغ کے لئے ان کی بھی ضرورت ہے۔ تو اُن کا اتباع کر کے ان مقدمات کو بھی جمع کریں۔ بشرطیکہ شرعی حدود سے باہر نہ ہو۔ چنانچہ اوّلاً خط کے ذریعے سے معلوم ہوا تھا اور اب یہاں آکر دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہاں مدرسہ میں سنسکرت کی تعلیم دی جارہی ہے۔ تو ہر چند کہ سنسکرت کا سیکھنا وجوب کے درجے میں نہیں۔ مگر تبلیغ میں بے حد مفید ہے۔ اس سے معاندین اسلام کے مذہب پر کماحقہٗ اطلاع ہو گی اور انہیں کی کتب سے اُن کا جواب دیا جاوے گا۔ تو بڑا کارگر ہو گا۔ خصم ہی کے مسلمات سے جواب دینا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے وہ ساکت اور دنگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت جگہ دیکھا گیا ہے۔ کہ الزامی جواب جس قدر مفید ہوتا ہے۔ تحقیقی معاند کے لئے اتنا شفا بخش نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک درجہ ہے تبلیغ کا۔ اس سے خصم بالکل ہی چُپ ہو جاتا ہے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ اس سے مجمع کے اُوپر اثر زیادہ پڑتا ہے۔ عوام اس کو نہیں دیکھتے ہیں۔ کہ کس کی تقریر کیسی ہے۔ ان کے نزدیک تو جس نے ساکت کر دیا بس وہی جیتا۔ وہ تو مسکت ہونے کے وصف کو ہی دیکھتے ہیں، دلیل کی حقیقت کو نہیں دیکھتے ہیں۔ تو بر بنائے مقدمۃ الواجب واجب یہ بھی واجب ہو سکتا ہے اور اگر واجب نہیں۔ تو آپ کے نزدیک استحباب ہی کے درجہ میں سہی۔ مگر مفید تو ہے اور یہ عذر کرنا کہ سبق کا حرج ہوتا ہے۔ اجی سبق کے وقت میں اس کا شغل نہ کیجئے۔ بلکہ فضول گوئی میں جو وقت صرف ہوتا ہے۔ اس میں اس کام کو کیجئے۔

تبلیغ میں اہل بصیرت سے رائے

اور ایک مقدمہ تبلیغ کا اور ہے۔ یعنی تقریر کی مشق وہ بھی کیجئے بحمداللہ

آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں اور سامان بھی مدرسہ میں موجود ہے۔ اس کو غنیمت سمجھیے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا۔

ایک حکایت یاد آتی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی نے ان کے کمال کی تعریف کی تھی۔ تو آپ نے تواضعاً فرمایا۔ کہ میاں ہماری مثال تو ایسی ہے جیسا رڑکی گودام کا کاریگر۔ کہ جب تک گودام میں ہے کاریگر ہے، جہاں باہر نکلا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس گودام میں مشین کے ذریعہ سے سب کام ہوتے ہیں۔ ایک چیز ایک کل میں لگا دی۔ تو اس نے اسے کاٹا، دوسری کل نے اسے ہتھوڑا مارا، تیسری نے بنا بنایا ایک جگہ رکھ دیا۔ ایسے ہی ہمارا کمال ہے کہ جب تک مدرسہ کے اندر ہیں سب کچھ ہیں اور جہاں باہر نکلے کچھ بھی نہیں خیر مولانا کی شان تو ایسی کیوں ہوتی۔ مگر ہماری حالت تو واقعی یہی ہے کہ مدرسہ ہی ہمارے کمالات کا موقع ہے۔

صاحبو! ایسا سامان آپ کو اور کہیں میسر نہیں آوے گا اور وقت بھی نہیں ملے گا۔ اس وقت کو غنیمت سمجھو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع کر دو۔ بلکہ ہر چیز کو اپنے درجے میں رکھ کر حاصل کرو۔ اصل مقصود تو دین ہے۔ مگر اس کے حاصل کرنے کے طرق ہیں۔ قرآن کا صحیح کرنا بھی دین ہے۔ حدیث تفسیر پڑھنا بھی دین ہے۔ اسی طرح فقہ بھی دین ہے۔ سب پر نظر رکھنا چاہیئے۔ مگر ترتیب سے کرنا چاہیئے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کس کو کتنی مقدار میں حاصل کرنا چاہیئے اور یہ اساتذہ کی رائے پر ہے۔ وہ جس کی استعداد جیسی دیکھیں گے، اس کی صلاحیت کو سمجھ کر خود رائے دیں گے۔ پھر وہ جو رائے دیں، ویسے ہی کرو۔ میرے پاس بعض طلبہ کے خطوط آتے ہیں کہ ہم کو منطق نہیں آتی۔ میں لکھ دیتا ہوں۔ اذا لم تستطع شیئا فدعه۔ جس کو حمد اللہ نہ آوے الحمد للہ پڑھ لے اور جس کے لیئے منطق دین میں

مفید سمجھی جاوے. اس کے لیئے وہ بھی دین ہے. حضرت مولانا گنگوہی نے فلسفہ منطق کی کتابیں درس سے خارج کر دی تھیں. تو ایک طالب علم نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے کہا لیجئے، حضرت! معقول پڑہنا بھی مولانا نے حرام کر دیا. اس نے اعتراض کے طور پر کہا تھا. مولانا نے فرمایا کہ بھائی مولانا نے حرام نہیں کیا، تمہاری طبیعتوں نے حرام کیا ہے. تمہارے فہم میں کجی آگئی ہے. اس لیئے ممانعت کی جاتی ہے اور ہم تو جیسے بخاری میں ثواب سمجھتے ہیں، ویسا ہی امور عامہ میں، اتنا بڑا دعوے اطمینان کا یہ مولانا ہی جیسے کا کام ہے. غرض ہر شخص کا الگ حال ہے. جس کو اساتذہ و کاملین سمجھتے ہیں، اس لیئے سب کے ساتھ ایک برتاؤ نہیں کرتے. میرے پاس ایک خط آیا کہ مجھ کو عربی نہیں آتی میں نے لکھا کہ چھوڑ دو، اردو میں مسائل پڑھو. پنجابی، کابلی، بنگلہ جو زبان بھی آوے اسی میں پڑھ لو. کوئی عربی پڑہنا فرض تھوڑا ہی ہے. خلاصہ یہ کہ کس کو کیا کرنا چاہیئے اور کتنی مقدار کرنا چاہیئے. یہ اساتذہ کی رائے پر ہے. کیونکہ ہر ایک کی حالت جُدا ہے، استعداد جُدا ہے. سب کو ایک لکڑی نہیں ہانکا جاتا.

تبلیغ میں خود رائی

غرض اپنی رائے سے افراط تفریط مت کرو. ہمارے اندر بڑی خرابی یہ ہے. کہ یا تو کسی کام پر بالکل توجہ ہی نہیں اور یا متوجہ ہوئے. تو سب کے سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑے. چھوٹے بڑے سب اس میں منہمک ہو گئے اور سب کاموں کو چھوڑ بیٹھے. اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی
چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

اور کسی اردو کے شاعر نے کہا ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

وہی مثال ہے ہماری کہ " کنویں سے نکلے کھائی میں گرے "، غرض ہمارے کاموں میں گڑبڑ بہت ہے۔ اعتدال اور استقامت بالکل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اب خودرائی پھیل گئی ہے۔ یہ بڑا مرض ہے۔ اس لئے میں نے کہا ہے۔ کہ جو کچھ کرے بڑے سے پوچھ کر کرے۔ بلکہ اکابر بھی چھوٹوں کو مناسب ہے۔ کہ مشورہ میں شامل کر لیا کریں اور یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اس خودرائی کو صوفیاء تو سخت ہی مضر فرماتے ہیں۔ عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

وہ تو اس کو کفر فرماتے ہیں۔ لیکن اس سے وحشت نہ ہونا چاہیئے کیونکہ کفر کے بھی مراتب ہیں۔ یہ کفر دون کفر ہے۔

اور سبب کلی اس خودرائی کا یہ ہے۔ کہ ہم لوگوں میں اصلاح اخلاق کی کمی ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں۔ ورنہ بزرگوں نے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بغیر مشورہ نہیں کیا۔

اور سبب جزئی یہ ہے کہ ہم لوگ ہوش سے کام نہیں لیتے ہیں، نرے جوش سے کام لیتے ہیں۔ پس جوش میں مشورہ کا بھی تو ہوش نہیں رہتا اور جوش بھی فی نفسہ بُری چیز نہیں۔ جوش ہو مگر ہوش کے تابع ہو۔ جب آپ ہوش سے کام لیں گے تو اس کو بھی سمجھیں گے۔ کہ آپ لوگ مقتداء بننے والے ہیں۔ اس لیئے آپ کے اندر سب شعبے دین کے ہونا چاہیئے۔ اگر کسی بات کی کمی ہو تو نقصان ہے۔ حسین وہ ہے جس کے آنکھ، کان، ناک سب اچھی ہوں سب چیزیں موزوں ہوں۔ اگر سب چیزیں تو اچھی ہوں۔ مگر آنکھوں سے اندھا ہو۔ وہ حسین نہیں۔ یا ناک کٹا ہوا ہو۔ تو وہ بھی حسین نہیں۔ اسی طرح دیندار وہ ہے جو دین

کے تمام شعبوں کا جامع ہو۔ عالم وہ ہے جو تمام شعب علوم کا جامع ہو۔ ان ہی شعبوں میں سے امر بالمعروف کے وہ آداب بھی ہیں جو بتلائے گئے ہیں۔ ان سب کو جمع کرنا چاہیئے۔ بحمد اللہ ضرورت کے موافق بیان ہو گیا ہے۔

باطل کے مقابلہ میں تبلیغ

اسی بیان کا ایک تتمہ یہ بھی ہے کہ اہل اضلال میں اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ارتداد کی صورت میں مرتد بنا رہے ہیں اور ایک وہ جو اسلام کی شکل میں خود پہلے سے مرتد ہیں اور وہ دوسروں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ یہ فرقہ زیادہ مضر ہے۔ یعنی اس وقت ایک فرقہ تو آریہ کا ہے وہ علانیہ کفر کی دعوت کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اسلام کے پردہ میں کفر کو پھیلا رہے ہیں۔ وہ مرزائیوں کا گروہ ہے۔ ان پر کفر و ارتداد کا فتویٰ ہو چکا ہے۔ مبلغین کو ان دونوں کی مدافعت کرنی چاہیئے جیسے آریہ ہیں ایسے ہی یہ نار یہ بھی ہیں۔ دونوں کافر ہیں۔

یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ پہلے شعبان میں کانپور میں میرا ایک وعظ ہوا تھا۔ اس کا نام دعوت الی اللہ ہے۔ وہ چھپ بھی گیا ہے۔ میں نے اس میں بیان کیا تھا کہ اب صرف آریہ کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور آپس میں جو فرقے ہیں۔ جیسے رضائی یا مرزائی، ان سے لڑنا نہ چاہیئے۔ یعنی جب وہ لوگ یعنی نو مسلم یا جاہل مسلمان ہمارے گھر کے اندر لڑائی دیکھیں گے تو متحیر رہ جائیں گے کہ یہ سب ہی مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کو اہل باطل سمجھتے ہیں۔ پھر ہم کدھر جائیں۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ اب مجھے تنبہ ہوا کہ یہ خیال میرا صحیح نہیں ہے۔ پہلے مجھے واقعات معلوم نہ تھے۔ میں یہ سمجھتا تھا۔ کہ وہ لوگ بھی صرف توحید و رسالت ہی کی اشاعت کرتے ہیں یعنی رسالت محمدیہ کی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ رسالت مرزائیہ کی اشاعت کرتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ یہ سُنانا تھا۔ کہ وہ ان سے اُلجھتے ہیں۔ تو اس وقت یہ رائے دی تھی۔ کہ آپس میں نہ لڑو۔ اس سے جاہل مسلمان یا مرتدین پریشان ہوں گے اسلام سے رُک جاویں گے۔ اسلام سے متوحش ہوں گے۔ پہلے ان کو کسی کے ہی ذریعہ سے مسلمان ہونے دو۔ جب وہ مسلمان ہو جاویں گے۔ پھر بتلا دینا کہ یہ مذہب باطل ہے اور یہ حق ہے اور اسی دعوت الی اللہ میں یہ بھی کہا تھا۔ کہ یہ جب تک ہے۔ کہ وہ مرزائی وغیرہ اپنے مذہب سے تعرض نہ کریں۔ نہ اپنے عقائد کی اشاعت کریں اور اگر وہ اس سے تعرض کریں۔ تو تم بھی دریغ نہ کرو۔

اب ایک دوست نے لکھا ہے۔ کہ تمہارے وعظ میں جو یہ مضمون ہے اس سے تو لازم آتا ہے۔ کہ ہم اور کفار ایک جگہ ہو کر اسلام کی اشاعت کریں۔ اور اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ وہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت سے تعرض بھی کرنے لگے ہیں۔ تو میں نے جواب لکھا کہ اس میں اس حالت میں عدم سکوت کی طرف خود اشارہ ہے اور یہ اجازت دی۔ کہ اب شائع کرو۔ کہ اگر وہ اپنے مذہب سے تعرض کریں۔ تو ہم بھی ان سے ضرور تعرض کریں گے۔

پھر ایک دوست نے مجھ کو یہ لکھا۔ کہ اب وہ تعرض نہ بھی کریں جب بھی ہم کو تعرض کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حقیقت میں گو وہ مسلمان نہیں۔ مگر ہمارے سکوت سے عام مسلمانوں کو تو یہ خیال ہو گا۔ کہ یہ مسلمان ہیں۔ تو پھر چندے وہ انہیں کو اپنے مقتدا اور سر خیال کریں گے۔ پھر اس سے لوگوں کو ہٹانا مشکل ہو گا۔ اس وقت میری آنکھیں کھل گئیں۔ کہ بے شک میرا خیال غلط تھا۔ پھر میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ہمارے مبلغین کو کیا کرنا چاہیئے۔ ان سے تعرض کرنے میں تو ضرر یہ تھا۔ کہ کہیں دعوت ہی نہ رُک جائے اور بجائے مرتدین کو مسلمان بنانے کے کہیں مرزائیوں ہی کے مناظرہ

میں سارا وقت صرف نہ ہو جائے۔

اور تعرض نہ کرنے میں یہ خیال ہوا کہ اگر لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ کہ وہ جس کے ہاتھ پر چاہیں اسلام لے آئیں، چاہیں ہمارے ہاتھ پر یا مرزائیوں کے تو بعد اسلام لانے کے بعض نومسلموں پر ان کا اثر ہو جاوے گا۔ پھر ہٹانا مشکل ہوگا۔ اس لئے مشورہ کیا گیا۔ غرض اس مصلحت کا بھی خیال تھا کہ اگر اب نہ روکا جائے تو انجام میں اثر اچھا نہ ہوگا اور اس مفسدہ کا بھی خیال تھا کہ اس سے وہ نومسلم پریشان ہوں گے۔ کہ ہم کدھر جائیں۔ تو مشورہ پر بعض نے کہا کہ مقصود تو دعوت ہے۔ تو مرزائیوں سے تعرض کرنا بھی تو دعوت ہے۔ اس کو کیوں ترک کریں۔ مسلمان بنانا تو ہمارے ذمہ فرض نہیں۔ ہمارا کام دعوت ہے۔ خواہ اس تعرض کے بعد کوئی مسلمان ہو یا نہ ہو، اس کی پرواہ نہ کرنا چاہیے۔

ثمرۂ تبلیغ

اور اب یہاں آن کر بھی معلوم ہوا۔ کہ راجح یہی ہے کہ ان کا رد ضرور کیا جائے اور نتیجہ پر نظر نہ کی جاوے اور اسی کو فرماتے ہیں:۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ.

اور وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

چنانچہ حضور کا بعض دفعہ جی چاہتا تھا کہ وہی معجزہ ظاہر ہو جائے۔ جو کفار چاہتے ہیں۔ تو اس کا کیا عجیب و غریب جواب ملا۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ۔

پوری آیت کا مطلب تو ظاہر ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ.

کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ بظاہر ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ حضور کو حق تعالیٰ نے ایسا سخت لفظ فرمایا ہے۔ یہ شبہ اصل میں غلط محاورہ سے ہوا ہے۔ ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اسی کا اگر ترجمہ کیا جاتا تو آسان لفظ ہو جاتا ہے۔ جاہل کا ترجمہ نادان ہے۔ یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے توہین لازم نہیں آتی۔ بلکہ شفقت کے موقعہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے محاورہ میں بھی کہتے ہیں۔ دیکھو میاں نادان ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ تو دیکھئے ظاہر میں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے۔ مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے۔ یہ اشکالات غلط محاورہ سے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وطن میں ایک شخص نے میرے سامنے ایک اشکال پیش کیا۔ اس طرح سے کہ پہلے مجھ سے پوچھا وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کا ترجمہ کر دو۔ پھر اشکال کروں گا میں سمجھ گیا کہ کیا اشکال ان کو پیش آیا ہے۔

منشاء اشکال کا یہ تھا کہ قرآن مجید کے بعض تراجم میں ضال کے معنی گمراہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ پس شبہ یہ تھا۔ کہ اس میں حضور کو گمراہ کہا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ پایا آپ کو ناواقف۔ پس واقف بنا دیا۔ اب وہ میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا میاں بتلاؤ کیا اشکال تھا؟ کہنے لگا اب تو کچھ بھی نہیں۔

اس جگہ راز یہ ہے۔ کہ ضلالۃ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے۔ ایک مذموم میں۔ چنانچہ ولا الضالین میں جو ضال کہا گیا ہے۔ وہاں تو مذموم میں مستعمل ہے۔ یعنی جو بعد وضوح حق بھی اتباع حق نہ کرے اور ایک غیر مذموم ہے۔ یہ کہ اب تک وضوح حق نہیں ہوا۔ اس کے معنی ناواقفی کے ہیں۔ جو نقص نہیں۔ کیوں کہ حضور پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے۔ جس میں آپ پر حقائق واضح نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

مَاكُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔

یعنی نزول وحی سے پہلے آپ ان علوم کو کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى۔

میں یہی درجہ مراد ہے۔ کہ پہلے آپ پر وضوح حقائق نہیں ہوا تھا۔ اب ہم نے وحی نازل کر کے حقائق کو واضح کر دیا اور ولا الضالین میں وہ درجہ مراد ہے۔ کہ وضوح حق ہو چکا تھا۔ مگر بعد وضوح حق بھی کجی اختیار کی۔ تو جس طرح ضلالت کے دو معنی ہیں، اسی طرح لفظ گمراہ بھی فارسی میں دونوں معنوں کو شامل ہے۔ اسی لحاظ سے بعض مترجموں نے ضال کا ترجمہ گمراہ کیا ہے۔ مگر اب ہمارے محاورہ میں گمراہ کا لفظ زیادہ تر معنی ثانی میں مستعمل ہوتا ہے اس لیئے اب ضرورت ہے ترجمہ بدلنے کی۔ کہ ایسے الفاظ سے ترجمہ نہ کیا جاوے۔ جس سے عوام دھوکہ میں پڑیں۔ اسی طرح لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ کے معنی یہ ہیں۔ کہ آپ نادانوں کی سی باتیں نہ کیجئے۔ اس سے کچھ بھی ابہام نہیں ہوتا۔ بلکہ پیار کا لفظ ہے۔ دیکھو اگر تم کسی کو کہو کہ او مرغی کے بچے اتو وہ بھڑک اٹھتا ہے، غضبناک ہوتا ہے۔ گویا آگ لگا دی اور اگر کہو او چوزے! تو ہنس دیتا ہے اور یہ لفظ کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو گمان ہوتا ہے۔ کہ کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو تو دیکھئے لغت کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے۔ اس لیئے اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ایسا کیا جاتے۔ جس سے سامعین کو وحشت نہ ہو۔

میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ حضور کا جی چاہتا تھا۔ کہ کفار کو وہی معجزہ دکھلایا جائے۔ جس کو وہ چاہتے ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا۔

فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ الاٰية۔

حاصل آیت کا یہ ہے۔ کہ ہم تو ایسا معجزہ نہیں دکھلاتے۔ اگر آپ کا جی چاہتا ہے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر لے آئیے ہم

بھی دیکھیں آپ کہاں سے لائیں گے۔ کس قدر خشک اور مایوس کن جواب ہے تو اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ کام کرنے والے کو ثمرہ عاجلہ پر نظر نہ ہونی چاہیئے اور اس کے عدم ترتب سے محزون نہ ہونا چاہیئے اور ایک تو طبعی حزن ہوتا ہے۔ اس میں تو آدمی معذور ہے۔ بلکہ ماجور ہے اور ایک مبالغہ فی الحزن ہے۔ یعنی یہ سوچ کہ محزون ہونا اس کی اجازت نہیں۔ میں ان دونوں کے جمع کا طریق بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ سعی میں نیت فقط رضائے خدا کی ہو۔ یہ نیت ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہی ہو جائے۔ ہاں دعا کرتے رہے کہ یا اللہ اس کو مسلمان بنا دیجئے اور اس کے دل کے اندر اپنا خوف پیدا کر دیجئے۔ دعا تو یہ کرے اور عمل وہ کرے کہ اپنے کام میں رضائے حق کو مدنظر رکھے۔ اپنا کام صرف تبلیغ کو سمجھے۔ خواہ ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو۔ وہ خدا کے اختیار میں ہے اور اگر کسی کے ذہن میں اور کوئی صورت جمع کی ہو۔ تو مطلع فرمادیں (اہل مجلس کی طرف سے جواب آیا کہ یہی بالکل صحیح ہے) ذوق گواہی دیتا ہے کہ یہ طرز کافی شافی ہے۔ اس سے تکلیف بھی نہیں ہو گی۔ حزن و ملال بھی نہ ہو گا اور چونکہ دعا میں عرض و معروض ثمرہ ہی کے متعلق ہو گی۔ تو اس میں یہ نیت بھی ایک درجہ میں ہو جاوے گی۔ کہ ثمرہ مرتب ہو۔ بس اتنی نیت کافی ہے۔ ثمرہ مرتب ہونے کے لیئے اس سے زیادہ مناسب نہیں اور نیت بھی ایسے طریق سے ہے کہ حق تعالیٰ سے عرض حاجت کی ہے اُمید ہے کہ وہ پوری ہو گی۔ قلوب ان کے ہاتھ میں ہیں۔ انشاء اللہ وہ قلب کو پھیر دیں گے اور اگر اس دعا کے بعد بھی کامیابی نہ ہو، بلا سے نہ ہو۔ تم اس کی پرواست کرو۔ نیز دعا میں بھی یہ قصد نہ کرو کہ یہ ثمرہ ضرور مرتب ہو ہی جاوے۔

اگر کوئی کہے۔ کہ یہ تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خیال کرنا کہ مقصود پورا ہو ہی جاوے۔ یہ دعا میں محمود ہے۔ حدیث ان اللہ یجیب

المسلحین فـــالدعاء سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے اندر یہ قصد ہونا چاہیئے نیز ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابة۔ اور تم اس سے منع کرتے ہو؟ تو یہ بات نہیں ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دعا میں عزم تو یہی ہو کہ یہ مقصود پورا ہو جائے۔ مگر اس کے ساتھ دوسری شق پر بھی رضا رہے۔ یعنی دعا تو اسی نیت سے کرے کہ مراد پوری ہی ہو جائے۔ لیکن یہ بھی دل میں رکھے۔ کہ اگر نہ ہو تو اس پر بھی راضی اور خوش رہوں گا۔ مثلاً تندرستی کے لیئے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ ہمیں تندرست کر دے۔ تو یہ نیت نہ کرے کہ اگر آپ کا جی چاہے تو کر دیجیئے اور مرضی نہ ہو تو نہ کیجیئے۔ اس لیئے کہ دعا کے اندر ان شئت کہنے کی ممانعت ہے۔

حدیث میں ہے کہ ان شئت مت کہو۔ کیونکہ ان کو مجبور کرنے والا کون ہے۔ وہ خود ہی جو مناسب ہوگا کریں گے۔ جو تمہارے لیئے بہتر ہوگا وہی تجویز کریں گے۔ تم اپنی طرف سے یہی عرض کرو کہ میری مراد پوری ہو جاوے البتہ یہ شرط ضرور ہے۔ کہ جس چیز کی دعا کرتا ہے وہ شریعت کے موافق ہو اور اس کے موافق سمجھنے میں اگر اجتہادی غلطی ہو جاوے تو معاف ہے۔ مثلاً جس چیز کی دعا کرتا ہے۔ یہ اس کو قواعد سے شریعت کے موافق سمجھا تھا اور واقع میں شریعت کے مخالف تھی۔ تو اس پر دار وگیر نہ ہو گی۔ غرض مراد تو شریعت کے موافق ہونا چاہیئے۔ خواہ واقع میں یا اس کے اجتہاد میں۔ مگر دعا تردد کے ساتھ نہ کرے جزم کے ساتھ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سمجھے۔ کہ اگر قبول نہ ہو تو بھی میں راضی رہوں گا اور میرے لیئے وہی بہتر ہو گا اور اسی میں خیریت ہو گی۔ تو اس قضیہ معلقہ ذہنیہ سے اس غیر معلقہ ملفوظ کی تبدیل ہو جائے گی۔ جب حقیقت دعا کی سمجھ میں آئے گی۔ تو اب شبہ رفع ہو گیا اور جزم بالدعا وعدم قصد ثمرہ میں تعارض نہیں رہا۔

مقصودِ تبلیغ

خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود سعی سے رضائے حق ہے نہ کہ ثمرہ اور اس کے ساتھ ہی ثمرہ کے لیئے دعا کی بھی اجازت ہے۔ مگر مبالغہ کے ساتھ اس کے پیچھے مت پڑو کہ ہو ہی جائے اور نہ ہو تو رنج کرنے بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ فانت لہ تصدیٰ اور لست علیھم بمصیطر میں اسی کی تعلیم ہے کہ آپ تبلیغ کرنے کے زیادہ پیچھے نہ پڑیئے۔ وہ قبول کریں یا نہ کریں، اس سے بحث نہ ہونا چاہیئے۔ آپ اس کے درپے نہ ہوں۔ آپ کا کام رضائے حق حاصل کرنا ہے نہ کہ ثمرات۔ کہ وہ نہ اختیاری ہیں نہ موعود۔ اسی لیئے ہم کو کسی کے مسلمان بنانے کا حکم نہیں، کیونکہ وہ دوسرے کے اختیار میں ہے۔ اور ظاہر ہے قادر بقدرتِ الغیر کیسے قادر ہو سکتا ہے۔ اختیار تو دوسروں کا اور اس سے کام لیں آپ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لیئے ایسے امور کے متقدی ہونے سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بالخصوص سالکین کو ان کی تو ثمراتِ عاجلہ پر نظر کرنے سے گویا موت آجاتی ہے۔ کیونکہ اہل علم کو ثمرہ علم مرتب نہ ہونے سے بد حالی کا شبہ نہیں ہوتا اور سالکین کو ثمرہ عمل حاصل نہ ہونے سے بد حالی کا شبہ ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذوق شوق ہو، گریہ طاری ہو، میلان الی المعاصی نہ ہو، معصیت کا وسوسہ بھی نہ ہو ہر وقت محویت رہے۔ مگر انسان اس کا مکلف کب ہے۔ وہ تو صرف اس کا مکلف ہے اور اتنا ہی اس کے اختیار میں ہے۔ کہ معاصی کا مرتکب نہ ہو جوارح اور قلب کو گناہ سے پاک رکھے، نہ ہاتھ سے گناہ کرے، نہ پیر سے نہ زبان اور دل کو معاصی میں مبتلا نہ کرے۔ خلاصہ یہ کہ تقاضائے معصیت پر عمل نہ کرے۔ اگر تقاضے پر عمل نہ ہو تو پھر خواہ کتنا ہی میلان ہو، واللہ ذرہ برابر بھی نقص نہیں بلکہ ماجور رہے۔ کیونکہ اس وقت مشقت زیادہ ہوتی ہے۔ نفس

سے جہاد کرنا پڑتا ہے، بار بار تقاضا ہوتا ہے اور وہ اس کو روکتا ہے۔ اور جو شخص یُوں چاہتا ہے کہ میلان ہی نہ ہو۔ اول تو یہ اختیار میں نہیں۔ اس کا قصد بے معنی۔ پھر اگر ایسا کیا تو حقیقت میں وہ طالب حق نہیں۔ طالب راحت ہے۔ پس اس میں تاکید نفس ہے۔ کہ مشقت سے بھاگنا چاہتا ہے، مجاہدہ سے رکتا ہے۔ پس میلان الی المعاصی کوئی نقصان کی بات نہیں۔ یہ تھوڑا بہت سب کو ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کاملین کو بھی ہوتا ہے۔ ہاں کسی کا نفس ایسا مطمئنہ ہو جائے کہ گناہ کا خطرہ ہی نہ گزرے۔ یہ اور بات ہے مگر یہ نادر ہے۔ غرض خطرات کا آنا کوئی مضر چیز نہیں۔ پس اس غم میں نہ پڑنا چاہیئے۔ گو غم میں پڑ جانا بھی فی نفسہٖ مضر دین نہیں، لیکن اس سے کلفت تو ہوتی ہے اور اس کلفت کا انجام یہ ہوتا ہے۔ کہ بعض دفعہ کوئی بیماری لگ جاتی ہے۔ پھر دین کے کاموں میں خلل پڑنے لگتا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ایک شخص حاضر تھے۔ جو مجاہدہ بہت کرتے تھے۔ کھانا بہت کم کھاتے تھے اور اس سے ضعیف ہو گئے تھے۔ تو مولانا نے فرمایا۔ کہ حدیث میں ہے:۔

المؤمن القوی خیر من الضعیف وفی کل خیر

یعنی اگر مومن تندرست طاقت ور ہے تو کسی کی کچھ خدمت کرے گا۔ کسی کے لیئے پانی لاوے گا اور اگر ضعف آگیا۔ تو بجائے خادم ہونے کے مخدوم بن جائے گا۔ دوسروں کا محتاج ہو گا کہ بھائی مجھے پانی پلادو، لاؤ وہ لادو۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ نماز روزہ ادا کرنا بھی مشکل ہو جاوے گا۔ ہاں ضعف اضطراری الگ بات ہے۔ یہاں تو اختیاری کا ذکر ہے۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اس کے بعد ان کے معدہ میں خشکی پیدا ہوئی۔ اس سے کچھ الوان اور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جن کو انہوں نے مولانا کی خدمت میں ظاہر کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ مقدمہ جنون ہے علاج کرو۔ مگر وہ اس کو بزرگی سمجھے ہوتے تھے علاج نہ کیا۔ آخر

مجنون ہو گئے۔ ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ برہنہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے۔ وظائف اور مجاہدہ تو الگ رہا، فرائض بھی چھوٹ گئے۔ اس سے کیا نفع ہوا۔ غرض امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونے سے بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے بیمار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات مر جاتا ہے۔ بعض لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں ایک طالب علم نے ایک حکایت بیان کی تھی۔ کہ رام پور میں ایک شخص تھے۔ اُن کو ایسا ہی قبض طاری ہوا۔ ساری کیفیات جاتی رہیں۔ وہ سمجھے میں مردود ہو گیا اور کوئی دستگیر ہادی ملا نہیں آخر خودکشی کر لی۔ باقی یہ کہ اس سے مواخذہ ہو گا یا نہیں۔ اس میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مقدمہ ہمارے پاس نہیں آوے گا۔ خدا جانتا ہے۔ کہ وہ مغلوب الحال تھے یا نہیں۔ مگر نقصان تو ہوا۔

عبدیت کا تقاضا

اور اس میں ایک باریک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہو، ایسی ہو۔ یہ شخص اپنے لیئے خود تجویز کرتا ہے۔ جو کہ خلافِ عبدیت اور بے ادبی اور گستاخی ہے۔ تمہیں کیا حق ہے تجویز کرنے کا تمہاری تو یہ حالت ہونا چاہیئے۔ ؎

چوں کہ برشیخت بہ بند دبستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

چنانچہ ایک حکایت ہے حاجی صاحبؒ کی اس سے آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہو گی۔ کہ ایک طالب آپ کے پاس آیا اور مرض کی شکایت کی۔ کہ اتنے دنوں بیمار رہا۔ اس مدت میں حرم شریف میں نماز پڑھنا بھی نصیب نہ ہوئی۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ صحت و قوت بخشئے۔ اس وقت حضرت نے اس

نے لئے دعا کی۔ جب وہ چلا گیا تو فرمایا یہ شخص عارف نہیں ہے۔ اگر عارف ہوتا تو نماز حرم کی غیر حاضری سے مغموم نہ ہوتا کیونکہ مقصودِ اصلی تو قرب ہے جس طرح بھی حاصل ہو اس کے طرق مختلف ہیں۔ ایک طریق یہ بھی ہے۔ کہ حرم میں آن کر نماز پڑھنے سے قرب حاصل ہو۔ ایک طریق یہ بھی ہے کہ بیمار ہو جائے اور اس پہ صبر کرے۔ شکوہ شکایت نہ کرے اور اس سے قرب ہو تو مقصود جس طریق سے بھی حاصل ہو اس پر راضی رہنا چاہیئے۔ حصول مقصود کے بعد کسی طریق کے فوت پر حسرت کرنا مقصود کی بے قدری ہے۔

اور اس کی ایک مثال بیان فرمائی۔ کہ دیکھو لوگ جو حج کرنے آتے ہیں تو مقصود کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود حضوری بیت اللہ ہے۔ کوئی خاص راستہ مقصود نہیں۔ کہ مثلاً بمبئی ہی ہو کر آوے۔ اب ایک شخص تو بمبئی ہو کر آیا۔ اس کو بہت سے حالات راستہ کے معلوم ہوتے اور ایک کراچی ہو کر آیا۔ جس کو وہ خاص حالات معلوم نہ ہوئے۔ اب کوئی بیوقوف ہی ایسا ہو گا۔ جو حج کو چھوڑ کر کراچی سے بمبئی آوے۔ تاکہ یہ حالات معلوم ہوں صوفیاء نے لکھا ہے۔ طرق الوصول الی اللہ بعددِ انفاس الخلائق۔ کسی کے لیئے کوئی طریق ہے، کسی کے لیئے کوئی طریق ہے۔ کوئی طریق مقصود نہیں۔ مقصود رضا ہے جب رضا حاصل ہے تو اب تمنا کرنا کہ یہ ہو وہ ہو یہ سجھ نہیں ہے جو ادب طریق کے خلاف ہے۔ صوفیاء تو اپنے ارادہ کو ایسا مٹاتے ہیں، کہ یہاں تک کہتے ہیں۔ ؎

اریدہ وصالہ ویرید ھجری فاترک ما ارید لما یرید

اور حافظ شیرازی نے اسی کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

پس عبدیت یہ ہے کہ اپنی خواہش کو فنا کر دے۔ جو ان کا ارادہ ہے اسی پر راضی رہے۔ بعض عارفین نے فرمایا ہے:۔

ارید ان لا ارید۔ واختار ان لا اختار۔

اس پر ابن عطا اسکندری نے ایک اشکال وارد کر کے خود جواب دیا ہے۔ اشکال یہ ہے۔ کہ عدم ارادہ کا ارادہ یہ بھی تو ایک ارادہ ہوا۔ پھر ارادہ کا فنا کہاں ہوا۔ کسی معقولی کا اشکال معلوم ہوتا ہے۔ پھر خود جواب دیا ہے۔ کہ مطلب مطلق ارادہ کا فنا کرنا نہیں۔ بلکہ صرف اس ارادہ کا جو کہ رضا کے خلاف ہو اور عدم ارادہ کا ارادہ رضا کے خلاف نہیں۔ کیونکہ خداوند کریم بھی چاہتے ہیں۔ کہ بندہ کسی ایسی بات کا ارادہ نہ کرے جو رضا کے خلاف ہو۔ پس عدم ارادہ کا ارادہ فناء ارادہ کے منافی نہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اعمال اختیاریہ میں کمی نہ کرے اور ثمرات غیر اختیاریہ میں تفویض کرے۔ اس قدر ان کے درپے نہ ہو۔ کہ فقدان پر غم کرنے لگے۔ البتہ جو ان میں محمود ہیں۔ ان کے لئے دعا کا مضائقہ نہیں۔ پھر حاصل ہوں تب نہ حاصل ہوں۔ تب دونوں حال میں راضی رہو اور اختیاری اعمال میں لگے رہو۔ کیونکہ غم تو جب ہوتا ہے، جب ان ثمرات کا وعدہ ہوتا ہے۔ یہ وعدہ کہاں ہے۔ کہ ذوق و شوق بھی عطا کروں گا۔ ہاں حدیث میں اس کی دعا آئی ہے۔ تو ذوق و شوق کے واسطے دعا کرو۔ اس سے کام میں سہولت ضرور ہوتی ہے۔ اس لیے اہل طریق نے کہا ہے کہ یہ احوال مقصود نہیں ہیں، ہاں محمود ہیں۔ جب محمود ہیں تو دعا کرلو اور جب مقصود نہیں اس کے فقدان سے پریشان نہ ہو۔ ان کا انتظار کرو۔ جیسے مقولہ مشہور ہے:۔

الحائك اذا صلى ـــــــ یومین انتظر الوحی۔

ایسے امور غیر اختیاریہ وغیرہ موعودہ کے متعلق حضرت حاجی صاحب سے کوئی شکایت کرتا۔ کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا۔ تو حضرت فرماتے کہ

یہ تمہارا نفع ہے کہ خدا نے تم کو اپنا نام لینے کی توفیق دی اور اکثر یہ شعر پڑھتے ۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم

حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

یہاں ایک علمی اشکال ہے۔ وہ یہ کہ یافتن حق تو نفسا مطلوب ہے اور اسی کے پانے کے لیئے تو رات دن مستانہ وار پھرتے ہیں۔ پھر نایافتن پر رضا جواب یہ ہے کہ قائل کی اصطلاح نہ جاننے سے یہ اشکال وارد ہوا۔ ہر فن کی اصطلاح جُدا ہے۔ عشاق کی اصطلاح الگ ہے۔ علماء کی جُدا اصطلاح ہے۔ تو ہر متکلم کی اول اصطلاح جاننا چاہیئے۔ یہاں یافتن حق سے مراد یافتن حقیقی نہیں، یافتن مرغوب ہے۔ جو اس نے اپنے ذہن میں تراش رکھا ہے۔ کہ اگر یہ بات حاصل ہو جو میرے ذہن میں ہے۔ تب تو یافتن متحقق ہوا ورنہ نہیں ہوا۔ تو اس کو فرماتے ہیں کہ یہ خواہ حاصل ہو یا نہ ہو۔ اس کو چھوڑو اور اپنا کام کیئے جاؤ۔ اسی کو عارف شیرازی دوسرے صاف عنوان سے فرماتے ہیں۔ ۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب

کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے!

فراق اور وصل دونوں کی نفی کر کے رضا کو مطلوب فرماتے ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال حقیقی مراد نہیں۔ وہ تو عین رضا ہے، نہ کہ مقابل رضا کا۔ اسی طرح فراق حقیقی مراد نہیں۔ وہ تو منافی رضا کا ہے نہ کہ ممکن الاجتماع رضا کے ساتھ۔ بلکہ وصال و فراق مزعوم یعنی تم جس کو فراق یا وصل سمجھے ہوئے ہو۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ تم اپنی نظر رضا پر رکھو۔ باقی حقیقی وصال اور رضا میں تو تلازم کا علاقہ ہے۔ یعنی رضا مستلزم ہے وصال کو یا یوں کہو کہ وصال مستلزم ہے رضا کو وصال میسر ہو تب بھی مطلوب حاصل رضا میسر ہو جب بھی مدعا حاصل اسی کو کہتے ہیں کہ ۔

بجنت اگر ہدد کند دامنش آدرم بکف   گر کشند زہے طرب ور بکشم زہے شرف

یعنی خواہ یہ لازم ہو اس کو یا وہ لازم ہو اس کو دونوں طرح مطلب حاصل ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وصال بلا رضا ہو جائے۔ جب یہ ہے تو پھر اس کے کوئی معنی ہی نہیں۔ کہ رضا کو طلب کرو اور وصال کے طالب مت ہو۔ تو اس سے صاف معلوم ہوا۔ کہ وصال دو قسم پر ہے۔ ایک وصال مزعوم اور ایک واقعی نفی وصال مزعوم کی ہے اور طلب وصال واقعی کی۔ اب میں اس کے مصداق کی تعیین کرتا ہوں۔ اس لیئے کہ اس غلطی میں سالکین بکثرت مبتلا ہیں۔ وہ وصال مزعوم بسط ہے اور فراق مزعوم قبض ہے۔ جب قبض ہوتا ہے تو سالک کو بڑی تنگی ہوتی ہے اور اس کو یہ متوہم ہوتا ہے کہ میں مردود ہو گیا اور یہ کم و بیش سب کو پیش آتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ تو فراق سے یہ قبض مراد ہے اور وصل سے اس کا مقابل بسط اور یہاں قبض و بسط اصطلاحی مراد ہے نہ کہ لغوی۔ یعنی واردات واحوال کا فیضان و فقدان۔

پس عارف شیرازی اس کے متعلق تسلی فرماتے ہیں۔ کہ قبض و بسط کیا چیز ہے۔ جس کو تم فراق و وصل سمجھ رہے ہو اور اس کے پیچھے پڑے ہو تمہارا کام تحصیل رضائے حق ہے۔ اسی کے طالب ہو اور یہی معنی ہیں۔ یا ہم او را یا نہ یا ہم کے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جستجو سیکنم کے بعد نیا ہم کا احتمال رہے۔ حالانکہ حدیث میں ہے :۔

من تقرب الیّ شبراً تقربت الیہ ذراعا الحدیث۔

خلاصہ یہ کہ صوفیاء کے نزدیک تسلیم و رضا روح سلوک ہے اور جتنے عقبات اس طریق میں پیش آتے ہیں۔ ان میں بڑے حصہ کا حل یہی رضا ہے اور اسی کا تتمہ یہ ہے۔ کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے یہ دونوں باتیں اگر سمجھ میں آجائیں۔ تو پھر کبھی پریشانی نہ ہو گی اور میں نے صوفیاء کا یہ قول۔ کہ ثمرات کا مرتکب ہونا مقصود نہیں ہے مقصود رضا ہے۔ اپنے مضمون کی تائید میں پیش کر دیا۔ ورنہ یہ مضمون خود قرآن کی آیات میں موجود ہے۔ کہ تبلیغ میں

ثمرہ مقصود نہیں۔ اصل مقصود رضا ہے۔ جس کا طریق عمل وسعی ہے۔
اب دُعا کیجئے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کجی سے بچا دے اور فہم سلیم و توفیق عمل عطا فرما دے۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ و اصحٰبہ واجمعین۔ واٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

ارشاد

فرمایا ایسی چیز مت دیکھو جس سے شک یا تردد پیدا ہو۔
اور جو بلا قصد ایسی بات کان میں پڑ جائے اور یہی حالت پیدا ہو جائے تو اس کو کسی خاص تدبیر سے زائل کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس اہتمام سے پریشانی اور بڑھے گی اور ہمیشہ کے لئے ایک مستقل شغل ہو جاوے گا۔ بلکہ بجائے تدبیر کے اس سے بے التفاتی اختیار کرو اور کتنا ہی وسوسہ آوے بالکل پرواہ نہ کرو البتہ دعاء و تفرع کرتے رہو اور اس کو کافی سمجھو۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد طبیعت صاف ہو جاوے گی اور جب یہی عادت ہو جاوے گی تو قلب میں ایسی قوت پیدا ہو جاوے گی کہ وہ ایسی چیزوں سے متاثر نہ ہوگا۔

(از حکیم الامت تھانویؒ)

عمر فاروق@ون اردو

التواصی بالحق

یہ وعظ پانچ شوال ۱۳۴۱ھ کی شب کو
مظفر نگر بر مکان حافظ تجارت علی صاحب سوداگر
۲، گھنٹے تک کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا
سامعین کی تعداد آٹھ سو تھی
حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی
مرحوم نے قلمبند فرمایا
مستورات کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان وعمل صالح پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق پر بھی موقوف کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دین کی نصیحت کرنا۔ دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا ———— پس آج کل جو فتنۂ ارتداد پھیل رہا ہے۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا ہم کو تبلیغ کا حکم ہے۔ کہ ان مسلمانوں کو جو فتنۂ ارتداد میں پھنسنے والے ہیں، یا ان پر اس کا خطرہ ہے۔ ان کو اسلام کی تبلیغ کریں۔ اسلام کے محاسن سے ان کو مطلع کریں اور اس طرح ان کو ارتداد سے بچائیں ———— تبلیغ ہمارے اوپر فرض ہے اصولاً بھی، فروعاً بھی ———— اس کا فرض ہونا تو اسی سے معلوم ہوگیا۔ کہ حق تعالیٰ نے جس طرح ہم کو ایمان وعمل صالح کا امر فرمایا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق کا بھی امر فرمایا ہے اور اس مجموعہ پر خسارہ سے بچنے کو موقوف فرمایا ہے۔

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد!

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ وَالۡعَصۡرِ۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ۔

تمہید

یہ ایک مختصر سی سورت ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے مثل دوسری سورتوں کے اور آیات کے ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے۔

اور میں نے مثل دوسری آیات و سورکے جو کہا ہے۔ یہ اس لیئے تاکہ کوئی شخص تخصیص تلاوت سے یہ نہ سمجھ جائے۔ کہ اور آیات ضروری اور مفید مضامین

پر مشتمل نہیں۔ سو تخصیص تلاوت کی یہ وجہ نہیں۔ کیوں کہ کوئی سورت اور کوئی آیت اور کوئی حدیث ضروری اور مفید مضمون سے خالی نہیں۔ بلکہ وجہ تخصیص کی یہ ہے۔ کہ ضروری اور مفید تو سب ہیں۔ مگر ضرورت اور فوائد کی انواع مختلف ہیں۔ کسی آیت و حدیث میں ایک نوع کی ضرورت ہے۔ کسی میں دوسری نوع کی اور ان انواع میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ اس وقت اس نوع کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے اور دوسرے وقت دوسری نوع کا اہتمام ہوتا ہے۔ جیسے طب کے اندر نسخے بہت ہیں اور سبھی مفید و ضروری ہیں۔ بے کار و فضول کوئی نہیں۔ مگر طبیب ان میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے۔ نہ اس لیئے کہ اور فضول ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اس وقت یہی زیادہ مناسب و موافق ہے اور اس لیئے دوسروں سے وہ زیادہ قابل اہتمام ہے۔ رہا یہ کہ کسی خاص وقت میں کسی خاص نوع کا اہتمام زیادہ ہے۔ سو اس کا فیصلہ مصلح کی رائے پر ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے کے نزدیک اس وقت کسی دوسری نوع کو ترجیح ہو۔ مگر یہ اختلاف اجتہادی مضر نہیں۔

وجہ ترجیحِ مضمون

اب سنیئے کہ میں نے اس وقت اس مضمون کو اختیار میں کیوں ترجیح دی بات یہ ہے۔ کہ اس وقت ایک خاص حالت پیش آرہی ہے جس کی وجہ سے اس مضمون کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ وہ حالت یہ ہے۔ کہ آج کل بعض اعدائے دین[1] نے ایک کارروائی اختیار کر رکھی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے زمانۂ سابق کے کفار کا حال بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:۔

---

[1] مراد تحریک شدھی ہے جو آریہ کی طرف سے شروع ہوئی۔ ۱۲ ظ

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً۔

کہ یہ کفار یوں چاہتے ہیں۔ کہ جیسے وہ خود کافر ہیں۔ اسی طرح تم بھی کافر بن جاؤ۔ تاکہ سب برابر (یکساں حالت میں) ہو جائیں۔ اسی طرح آج کل بعض اعداء دین نے یہ کوشش جاری کی ہے۔ کہ مسلمانوں کو کافر بنایا جائے۔ تاکہ سب ایک حالت میں ہو جائیں اور گو ایک حالت میں ہو جانے کی ایک صورت یہ بھی تھی۔ کہ سب مسلمان ہو جاتے۔ مگر کسی کوزہ پشت سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ کیا تو چاہتا ہے۔ کہ تیری کمر سیدھی ہو جائے یا یہ کہ اوروں کی بھی کبڑی ہو جاوے بھائیں تو یہ چاہتا ہوں کہ سب کبڑے ہو جائیں۔ ؎

شور بختاں بآرزو خواہند
مقبلاں را زوال نعمت و جاہ

منحوس یہی چاہتا ہے۔ کہ میری طرح سب منحوس ہو جائیں۔ وہ دوسروں کی ترقی کو دیکھ کر جلتا اور حسد کرتا ہے اور یوں چاہتا ہے کہ ان کے پاس یہ دولت نہ رہے۔ چاہے مجھ کو بھی نہ ملے۔

ہرچند کہ اس مضمون کی ضرورت ہمیشہ سے تھی۔ مگر اس وقت اس لئے اور زیادہ ضروری ہو گیا۔ کہ اس وقت دوسری طرف سے خاص سعی ہو رہی ہے اور ممکن تھا۔ کہ اس مضمون کو کسی دوسرے جلسہ میں اختیار کیا جاتا۔ مگر اس وقت مجھے یاد آ گیا۔ کہ رمضان سے پہلے میں یہاں آیا تھا اور اس وقت مجھ سے اس کے متعلق بیان کی درخواست کی گئی تھی اور میں نے اس کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بعد حاضری کی نوبت ابھی آئی ہے۔ اس لئے میں نے اس جلسہ میں اس کو اختیار کیا۔ بہرحال مضمون کی حقیقت تو معلوم ہو گئی ہو گی۔ اور اسی کے واسطے میں نے اس سورت کو اختیار کیا ہے۔ پس اس سورت کے مقصود کو انوکھا مضمون نہ سمجھا جائے اور نہ وہ فی نفسہ انوکھا ہے۔ بلکہ ایسا مضمون ہے۔ جس کو اسلام نے ابتداء سے ضروری تبلایا ہے۔ مگر ہاں

ایک وجہ سے انوکھا ہو گیا اور اسی وجہ سے وہ قابلِ تنبیہ ہے۔ یعنی غفلت کی وجہ سے کہ ہم کو عرصہ سے اس کی طرف توجہ و التفات نہیں تھا۔ اس لیئے وہ ذہن میں مستحضر تھا اور اس عارض سے کوئی مضمون نیا اور انوکھا ہو جاتا ہے ورنہ جس قدر مضامینِ حقہ ہیں۔ ان میں نیا اور انوکھا کوئی نہیں۔ بلکہ سب پرانے ہی مضامین ہیں۔ جو تیرہ سو برس[1] پہلے تئیس سال کے اندر اندر نازل ہو چکے ہیں اور تئیس سال کی مدت ایک مختصر مدت ہے۔ اس قلیل زمانہ میں نزول ہونا گویا سب احکام کا ساتھ ہی نزول ہے۔

جدّتِ مضمون

غرض تیرہ سو برس پہلے سب احکام نازل ہو چکے ہیں۔ تو اب کوئی مضمون فی نفسہٖ نیا نہیں۔ البتہ غفلت اور عدمِ استحضار کی وجہ سے اُن میں بعضے نئے اور انوکھے معلوم ہوتے ہیں اور سلامتی کی بات بھی یہی ہے۔ کہ نیا مضمون بیان نہ کیا جائے۔ کیوں کہ اب نیا وہ ہو گا۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہ ہوا ہو۔ نہ حقیقتہً نہ حکماً۔ بلکہ محض رائے سے گھڑا گیا ہو اور یہی تو بدعت ہے۔ جو قابلِ ترک ہے۔

حسنِ مضمون

یہ میں نے اس لیئے کہا۔ کہ بعض لوگ نئے مضامین کے مشتاق ہوا کرتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے۔ کہ جو مضمون وجود اور وقوع کے اعتبار سے نیا ہو وہ قابلِ ترک ہے اور جو استحضار کے اعتبار سے نیا ہو کہ اب تک اُس کی طرف سے غفلت تھی۔ وہ البتہ قابلِ اشتیاق ہے۔

---

[1] بحذف کسر ۱۲۔

اور اس تفصیل سے قطع نظر کرکے یہ مضمون ایک اور اعتبار سے بھی نیا ہے۔ بلکہ اس جہت سے سب احکام نئے ہیں۔ وہ یہ کہ حدیث میں قرآن کی نسبت آیا ہے:

لا یخلق عن کثرۃ الرد۔

کہ قرآن بار بار تکرار کرنے سے پرانا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں ہر دفعہ نیا لطف آتا ہے۔ جیسے بعض محبوبوں کے دقائقِ حسن روزانہ نئے نئے مدرک ہوتے ہیں شاعر کہتا ہے۔ ؎

یزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا

یہی وجہ ہے کہ وصال کے بعد بھی ایسے محبوب کے عاشق کو چین نصیب نہیں ہوتا کیوں کہ ہمیشہ حسن کے نئے نئے شعبے مدرک ہوتے جاتے ہیں اور عاشق کو بے چین کرتے ہیں۔ یہی حالت ہے قرآن کی اوّلاً اور حدیث کی ثانیاً کہ اس کے حسن کا ادراک ایک دم سے نہیں ہوتا۔ بلکہ جس قدر تکرار کرو اسی قدر لطف بڑھتا ہے۔ ؎

ھو المسک ما کررتہ یتضوع

بس وہ حال ہے۔ ؎

داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچیں بہارِ تو زداماں گلہ دارد

حضرت شیخ شیرازی اسی کو فرماتے ہیں۔ ؎

دلآرام در بر دلآرام جوئے
لب از تشنگی خشک بر طرف جوئے
نگویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحلِ نیل مستسقیند

صاحبو! جب بعض لوگوں نے محبوبانِ مجازی کی نسبت عدمِ احاطۂ حسن

کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ سے

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست!

بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

کہ بعض اداؤں کی لفظوں سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ وہ وجدانی امور ہیں۔ جن کو عاشق کا دل ہی سمجھتا ہے۔ تو اب محبوب حقیقی کے حسن کے متعلق خود ہی انصاف کر لیجئے۔ کہ اس کے غیر متناہی حسن کا ادراک ایک دم سے کیوں کر ہو سکتا ہے۔

صاحبو! قرآن و حدیث کے علوم کا جو کہ محبوب کا ایک حسن ہے۔ سچ مچ یہی حال ہے۔ کہ ان کی انتہا نہیں۔ اس لیے حضور نے دوسری عبارت میں اس کو صاف طور پر ارشاد فرمایا ہے:۔

ولا تنقضی عجائبه۔

کہ قرآن کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے اور یہی حال حدیث کا ہے۔ مگر قرآن کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ پس یہ عجیب بات ہے۔ کہ قرآن و حدیث باوجود کہنگی کے تازگی لیے ہوئے ہیں۔

پس یہ سن کر گھبرایا نہ جائے۔ کہ مضمون تو پرانا ہے۔ خصوص والعصر کہ یہ تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ خصوصاً خدا تعالیٰ سلامت رکھے اختصار پسند دل کو۔ کہ انہوں نے اختصار کی وجہ سے اسی سورت کو نماز میں قرأت کے لیئے اختیار کر رکھا ہے۔ ان لوگوں نے تین سورتیں چھانٹ رکھی ہیں۔ والعصر انا اعطینک اور قل ھو اللہ احد۔ بس سب نمازیں انہی سے پوری کر لیتے ہیں۔ یہ تو لفظی حیثیت سے اس مضمون کا پرانا ہونا تھا اور معنوی حیثیت سے اس لیئے کہ مسلمانوں کو قرآن کے الفاظ سے خاص اُنس ہے جس کی وجہ سے الفاظ کے ساتھ معانی بھی کچھ کچھ ذہن میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ سورہ والعصر میں عصر کے معنی زمانہ سب جانتے ہیں۔ ہاں واؤ قسمیہ کے معنی تبلانا پڑے ہیں

گے۔ کیونکہ اس کے معنی شاید معلوم نہ ہوں۔ مگر اس کی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔ اس کے بعد ان الانسان لفی خسر میں انسان کے معنی سب کو معلوم ہیں۔ فی کے معنی اندر خسر کو بھی سب جانتے ہیں۔ کیوں کہ خسارہ محاورہ میں مستعمل ہے۔ الا کے معنی استثنا کے ہیں۔ لا الہ الا اللہ سب بولتے ہیں۔ تو اس کے معنی بھی مخفی نہیں۔ الذین امنوا کوئی نئی بات نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یاایھا الذین امنوا سے خطاب کیا جاتا ہے۔ تو الذین امنوا کے معنی مسلمان ہوئے وعملوا الصلحت میں عمل صالح کا ذکر ہے۔ یہ بھی محاورہ میں بولا جاتا ہے۔ آگے وتواصوا کے معنی شاید معلوم نہ ہوں مگر وصیت کو تو سب سمجھتے اور بولتے ہیں۔ حق اور صبر کو سب جانتے ہیں۔ تو اس کے معنی بھی جانتے نہیں۔

ناقص کمال پر فخر

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جب کوئی نئی بات نہیں۔ تو ہم بھی مولوی ہو گئے۔ میں کہتا ہوں ہاں۔ مگر ایسے مولوی ہوئے جیسے ایک گاؤں والے کے سر میں درد ہوا۔ وہ گاؤں ہی میں ایک جھاڑنے والے کے پاس گیا۔ اس نے یہ کہہ کر جھاڑا۔ کل بلّاھت (یہ قل ھو اللہ احد کو بگاڑا) تو وہ درد والا کہتا ہے۔ کہ جا ساڑے کے ساڑے (یعنی سالے)، تُوں تو (یعنی تُو تو) ہاپج ہی ہو گیا (یعنی حافظ ہی ہو گیا)، تو جیسے وہ گاؤں والا حافظ تھا۔ ویسے ہی آپ بھی مولوی ہو گئے۔ اور جو لوگ قرآن کا ترجمہ دیکھ لیتے ہیں۔ وہ تو شاید اپنے کو پورا ہی مولوی سمجھتے ہوں۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم لوگ اپنے ناقص کمال پر مغرور ہو جاتے ہیں اور اس کو کمال سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ کمال کچھ اور ہی چیز ہے۔

صائب کہتا ہے۔ ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

کسی پرکھنے والے کو اپنا جوہر دکھلاؤ۔ تو وہ بتلائے گا۔ کہ یہ جوہر ہے یا کانچ ہے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ ؂

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجا ست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

لکھنؤ میں ایک مدنی قاری آئے تھے۔ جو بے نظیر قرآن پڑھتے تھے لوگوں نے ایک لڑکے سے اُن کی قرأت کی نقل کرائی۔ چند روز میں وہ بھی انہی کی طرح اُتار چڑھاؤ کرنے لگا اور بالکل ان کے لہجہ سے لہجہ مل گیا۔ تو جاہلوں کی نظر میں وہ بھی قاری ہو گیا۔ جاہلوں کو مخارج حروف اور دقائق قرأت کی کیا خبر۔ وہ تو صرف آواز اور لہجہ کو دیکھتے ہیں۔ تو یہ لوگ اُس لڑکے کو مدنی قاری کے پاس لے گئے اور عرض کیا حضور! اس نے بھی کچھ آپ کا اتباع کیا ہے۔ ذرا اس کا قرآن سن لیجئے۔ انہوں نے سنا اور سن کر خاموش ہو رہے۔ لوگ تعریف کے منتظر تھے۔ جب قاری صاحب نے خود تعریف نہ کی۔ تو انہوں نے پوچھا۔ کہ حضور! اس نے کیسا پڑھا۔ فرمایا۔ اس نے ایسا پڑھا۔ جیسا ہم نے ایک اردو نعت نامہ بنایا ہے:۔

الخیار ککری۔ العنکبوت ککری۔ الحطب لکری

کامل اور ناقص کا فرق

واقعی جیسے عرب والے اردو غلط بولتے ہیں۔ ایسا ہی ہم عربی غلط بولتے ہیں اور قرآن بہت ہی غلط پڑھتے ہیں۔ مولانا قاری رحمت اللہ صاحب سے

ایک عرب نے کہا تھا کہ اہلِ ہند قرآن غلط پڑھتے ہیں۔ فرمایا کہ جیسے اہلِ عرب اردو غلط بولتے ہیں۔ وہ عرب اردو زبان جانتا تھا۔ اس نے کہا بالکل غلط ہے ہم تو اردو صحیح بولتے ہیں۔ فرمایا اچھا کہو ٹوٹتا۔ تو وہ کہتے ہیں توتتا۔ فرمایا۔ یہ اردو نہیں ہے۔ تو جیسے ان عرب کو اپنی اردو دانی پہ ناز تھا۔ اسی طرح لکھنؤ والوں کو اس لڑکے کی قرأت پہ ناز تھا۔ کہ یہ بھی قاری ہو گیا۔ حالانکہ اس کی قرأت ایسی تھی۔ جیسے ایک بندر نے حجام کا استرہ اُٹھا کر یہ سمجھ لیا تھا۔ کہ میں بھی نائی ہوں۔ حجام نے دوسرا اُسترہ نکال کر الٹی طرف سے اپنی ناک پہ پھیرا۔ تو بندر نے بھی اُسترہ اپنی ناک پہ چلا دیا۔ مگر سیدھی طرف سے۔ انجام یہ ہوا کہ ناک اُڑ گئی اور استرہ پھینک کر بھاگا۔

اسی کو مثل میں کہا گیا ہے۔

ع آنچہ مردم می کند بوزینہ ہم

کہ جو کام آدمی کرتا ہے۔ بندر بھی اس کو نقل کرتا ہے۔ اسی طرح اس لڑکے نے قاری صاحب کی نقل کی تھی۔ آج کل نقل کا بازار بہت گرم ہے۔ لوگ حکیموں کی نقل کر کے حکیم بن بیٹھے ہیں اور جہلاء ان کے معتقد ہیں۔

چنانچہ حکیم محمود خاں دہلوی کے والد یا دادا سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضور آپ بھی علاج کرتے ہیں۔ نسخہ لکھتے ہیں اور فلاں پنساری بھی علاج کرتا ہے۔ آپ کے ہاتھ سے بھی لوگ اچھے ہوتے ہیں اور بعض مر جاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ سے بھی بہت سے اچھے ہوتے اور بعض مر جاتے ہیں۔ تو آپ میں اور اس میں کیا فرق ہوا۔ انہوں نے اس کا نہایت مہذب جواب دیا۔ کہ مجھ میں اور اس میں فرق یہ ہے۔ کہ مجھ سے آخرت میں مؤاخذہ نہ ہو گا۔ کیوں کہ میں فن سے واقف ہونے کے بعد علاج کر رہا ہوں اور اس سے مؤاخذہ ہو گا۔ کیوں کہ وہ ناواقف ہو کر پیش قدمی کر رہا ہے۔ رہی

شفا و موت یہ خدا کے قبضہ میں ہے۔ نہ میرے اور نہ اس کے۔ اس پر مؤاخذہ کا مدار نہیں۔

ناقص کے لیئے کامل کی احتیاج

بس یہی فرق ہے پورے عالم میں اور اس شخص میں جو محض ترجمہ قرآن دیکھ کر مسائل کا فیصلہ کرتا ہے۔ پس صرف ترجمہ دانی سے کوئی اپنے کو علماء سے مستغنی نہ سمجھے۔ جیسا کہ آج کل بہت لوگ ترجمہ دیکھ کر اپنے کو مجتہد سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ دو چار نسخے یاد کر کے کوئی شخص طبیب سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا سمجھے تو اس کو مالیخولیا ہے اور اب تو اس کو طبیب کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے۔ کیونکہ پاگلوں کو طبیب کی زیادہ احتیاج ہے۔

ہمارے اکابر میں سے ایک بزرگ بہاول پور تشریف لے گئے۔ اور وہاں ایک اندھے حافظ صاحب کو قرآن کا پورا ترجمہ یاد تھا اور اس میں ان کو دعوئے کمال تھا۔ ان بزرگ نے ان سے پوچھا۔ کہ حافظ صاحب مدھامتٰن کا ترجمہ کیا ہے۔ کہا بہت سبز۔ فرمایا کہ اس میں بہت کس لفظ کے معنی ہیں۔ اور سبز کس لفظ کے۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کہ مد کے معنی بہت اور ھامتٰن کے معنی سبز ہیں۔ اس جواب پر سب اہل علم ہنس پڑے۔ مجھے پھر صائب کا قول یاد آتا۔ ؎

ہمائے لبصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

ورنہ وہ مثال ہو گی۔ جو ایک دیہاتی آنریری مجسٹریٹ کی ہوئی۔ جو واقع میں اناڑی تھا۔ مگر مالدار ہونے کی وجہ سے اس کو آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا۔ اب جو اس کے پاس مقدمات آئے تو بڑی فکر ہوئی۔ کہ فیصلہ

کیوں کر کروں۔ تو وہ اپنے اجلاس سے اٹھ کر ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کے اجلاس میں گیا۔ کہ دیکھوں وہ کس طرح فیصلہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اس وقت اس کے سامنے دو درخواستیں پیش کی گئیں۔ ایک کو اس نے سن کر کہا۔ کہ منظور۔ دوسری کو سن کر کہا نا منظور۔ بس آنریری صاحب یہ دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ فیصلہ کرنا تو بہت آسان ہے۔ کہ جو ایک درخواست کو منظور اور دوسری کو نامنظور۔ ظالم نے منظور نامنظور یاد کر کے فیصلے کرنا شروع کر دیئے۔

صاحبو! خوب یاد رکھیئے۔ کہ ہر ناقص کو کامل سے رجوع کرنے کی احتیاج ہے اور ہر غیر ماہر کو ماہر کی احتیاج ہے۔ اگر ہم مولوی لوگ محکمۂ زراعت میں دخل دینے لگیں۔ تو واقعی ہم سارے محکمہ کا ناس کر دیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی جج اور مجسٹریٹ چند روز کسی عالم کے پاس رہ کر دیکھے۔ تو اس کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ دین میں بالکل جاہل ہے۔ اس کو مسائل و احکام میں دخل دینے کا حق نہیں، یہ کام علماء ہی کا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ ایک مرتبہ میں نے ایک کتاب قانون کی اردو میں دیکھ کر ایک وکیل کے روبرو اس کی ایک دفعہ کی تقریر کی۔ تو وکیل نے میری تقریر سن کر کہا کہ یہ غلط ہے۔ پھر اس نے خود تقریر کی۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ واقعی میں نے غلطی کی تھی۔ تو جب قانون کی کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو جانا ہم کو وکلاء سے مستغنی نہیں کرتا اور اس کے سمجھنے میں ہم غلطی کرتے ہیں تو قرآن کا ترجمہ ہو جانے سے علماء سے آپ کیوں کر مستغنی ہو سکتے ہیں۔ اور آپ کو کیا اطمینان ہے۔ کہ آپ غلطی نہ کریں گے۔ اردو میں ترجمہ ہو جانے سے زبان کی دقت تو نہ رہی۔ مگر معانی تو آسان نہیں ہوئے۔

بربادیٔ شریعت کے ذمہ دار

چنانچہ ایک ملا جی میرے پاس مترجم قرآن لائے (جس کو عام لوگ

مترجم کہتے ہیں۔ جیسے میرے ایک عزیز دیوان متنبی کو دیوان تبنی کہتے تھے) وہ ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا تھا۔ جس میں محاورہ کی زیادہ رعایت کی گئی ہے۔ اس میں فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ کا یوں کیا گیا ہے۔ کہ دھو واپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو اور ملو اپنے سروں کو اور اپنے پیروں کو۔ جس میں لفظ پیروں کو واقع میں مونہوں اور ہاتھوں کے ساتھ لگتا ہے جو کہ دور ہے بہ نسبت اس فقرہ سے کہ «ملو اپنے سروں کو» جو کہ نزدیک ہے۔ مگر وہ ملاجی ترتیب کے سبب یہی سمجھے۔ کہ یہ قریب سے متصل ہے۔ تو اب وہ ترجمہ دکھلا کر مجھ سے پوچھنے لگے۔ کہ قرآن سے تو پاؤں کو مسح ثابت ہوتا ہے۔ میں بڑا گھبرایا کہ اس جاہل کو کیونکر سمجھاؤں۔ یہ نہ عطف کو سمجھے نہ اعراب کو۔ تو میں نے اس سے کہا۔ کہ ملاجی تم نے یہ کیونکر معلوم کیا۔ کہ یہ قرآن ہے اور خدا کا کلام ہے۔ کہا علماء کے کہنے سے۔ میں نے کہا اللہ اکبر، علماء اس میں تو ایماندار ہیں۔ کہ وہ ایک عربی عبارت کو قرآن کہہ دیں اور اس میں ایماندار نہیں۔ کہ وہ پاؤں دھونے کو فرض کہیں۔ بس علماء نے فرما دیا ہے۔ کہ پیروں کا دھونا فرض ہے اور مسح کرنا جائز نہیں اور نیز یہ بھی کہا ہے۔ کہ تم جیسوں کو قرآن کا ترجمہ دیکھنا جائز نہیں۔ خبردار! جو تم نے آئندہ کبھی ترجمہ دیکھا۔ بس قرآن کی تلاوت کیا کرو، ترجمہ ہرگز نہ دیکھو۔

اس سے بھی بڑھ کر ہمیں ایک بڑے میاں ملے۔ جو بڑے تہجد گزار اور پابند اوراد تھے۔ مگر قرآن کا ترجمہ دیکھ کر گمراہ ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے۔ کہ جب میں قرآن پڑھا کروں۔ تو لفظ راعنا چھوڑ دیا کروں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا۔

جس کا ترجمہ یہ لکھا ہے۔ کہ اے ایمان والو! راعنا مت کہا کرو۔ تو کیا تلاوت کے وقت راعنا کو نہ پڑھا کروں۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ راعنا کو

ترمت چھوڑ دو۔ مگر آج سے قرآن کا ترجمہ دیکھنا چھوڑ دو۔ کیوں کہ تم کو سمجھنے کی قابلیت نہیں۔

صاحبو! ایسے ہی لوگوں نے شریعت کا ناس کیا ہے۔ جو ترجمہ قرآن و حدیث کا دیکھ کر مجتہد بن گئے ہیں۔ اب اگر ان کی کم لیاقتی کے سبب ان کے شبہات کا جواب نہ دیا جائے۔ بلکہ ان لوگوں کو ترجمہ دیکھنے سے منع کیا جائے تو بعضے یوں کہتے ہیں۔ کہ علماء کو ہمارے سوالات کا جواب نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں۔ کہ افسوس آپ کو سمجھنا نہیں آتا۔ جواب تو ہر سوال کا ہے۔ مگر یہ بتلاؤ کہ اس کے سمجھنے والا کون ہے؟ ؎

سیوف حداد یا لوئی بن غالب

مواض ولکن این للسیف ضارب (۱۲ جامع)

صاحبو! آپ یہ اعتراض علماء پر نہیں کرتے۔ بلکہ خود اپنی عقل پر اعتراض کر رہے ہیں۔ مگر آپ کو خبر نہیں۔ ؎

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

جیسے ہمارے ایک عورت عید کا چاند دیکھنے کھڑی ہوئی اور اس سے پہلے اس نے اپنے بچہ کا پاخانہ کپڑے سے پونچھا تھا۔ جس میں سے کچھ نجاست اس کی انگلی کو لگی رہ گئی۔ عورتوں کی عادت ہے۔ کہ وہ ناک پر انگلی رکھا کرتی ہیں۔ اس نے جو ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا۔ تو پاخانہ کی بدبو ناک میں پہنچی۔ تو وہ کہتی ہے۔ اوئی! اب کے چاند کیسا سڑا ہوا نکلا۔ کمبخت کو اپنی انگلی کی تو خبر نہ ہوئی۔ کہ اس میں کیا لگ رہا ہے۔ چاند پر اعتراض ہوا۔ کہ سڑا ہوا نکلا ہے۔

ترجمہ بینی کا نقصان

یہی حال ان جہلاء کا ہے۔ جو علماء پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ ہمارے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ ان کو اپنی عقل کی خبر نہیں۔ کہ اس میں جواب کے سمجھنے کی اہلیت نہیں۔ بھلا اگر ایک سائیس کسی کالج کے پروفیسر سے کہے کہ مجھے اقلیدس کے پہلے مقالہ کی پانچویں شکل سمجھا دو اور وہ اس کی تقریر کرے اور سائیس نہ سمجھ سکے اور کہے نہ معلوم یہ کیا بکتا ہے۔ تو بتلائیے قصور کس کا ہے۔ یقیناً سائیس کی عقل کا قصور ہے۔ مگر جاہلوں کے نزدیک تو وہ پروفیسر ہی بکتا ہے۔

جیسے ہمارے یہاں ایک دفعہ زنانہ میں وعظ ہوا۔ ایک جولاہی بھی وعظ سننے آئی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو کہتی ہے جانے کیا کیا بجو نکے ہے۔ واقعی اس کے نزدیک تو سارا بجو نکنا ہی ہوا۔ فرمایئے اس نے یہ اعتراض اپنے اوپر کیا یا واعظ پر کیا۔ اسی طرح اگر میں ان علاچی کو علمی قاعدہ سے نہ سمجھا سکا۔ تو قصور کس کا ہے؟

ان کی عقل کی تو یہ حالت تھی۔ کہ مہتمم مسجد نے ان سے یہ کہہ رکھا تھا۔ کہ تاریکی کے وقت پاخانہ میں چراغ رکھ دیا کرو۔ ایک دن آپ چراغ لے کر گئے۔ تو پاخانہ میں کوئی طالب علم تھا۔ آپ اس سے کہتے ہیں۔ میاں مولوی صاحب آنکھیں بند کر لینا۔ میں چراغ رکھوں گا۔ جی ہاں وہ تو آپ کو کپڑا پہنے ہوئے بھی نہ دیکھیں اور آپ اس کو ننگا دیکھ لیں۔ اب ایسے کم عقل کو کوئی کس طرح سمجھائے۔ کراجلکم کا تعلق وجوھکم وایدیکم سے ہے۔ یہ منصوب پر معطوف ہے۔ مجرور پر عطف نہیں ہے۔ جس شخص کو قواعد نحو سے کچھ بھی مس نہ ہو۔ وہ اس جواب کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ بس ایسے شخص کا جواب یہی ہے۔ کہ تم کو جس طریقہ سے قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہوا۔ اسی طریقہ سے اس

کے احکام بھی معلوم کرو، ورنہ تم کو خود معانی سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ تفصیل میں نے اس لیے کی، تاکہ آپ ترجمہ قرآن دیکھ کر اپنے کو ماہر نہ سمجھیں۔ جو لوگوں میں بڑا مرض ہے۔ اور یہ مرض اس مرض کے علاوہ ہے۔ جس کے متعلق بیان کرنے کی ضرورت درپیش ہے۔

ترجمہ سورت

اب میں اصل مقصود کی طرف عود کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ اس جگہ قسم کھا کر فرماتے ہیں۔ کہ قسم ہے زمانہ کی۔ کہ انسان ٹوٹے میں ہے (اس کی تحقیق میں عنقریب عرض کروں گا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قسم زمانہ کی کیوں کھائی ہے) آگے ارشاد ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے۔

(چونکہ اس جلسہ میں سب مخاطبین مسلمان ہیں۔ اس لیے اجمالاً اتنا کہے دیتا ہوں۔ کہ بحمد اللہ آپ پورے خسارہ سے تو بچے ہوئے ہیں۔ مگر کسی قدر خسارہ میں ابھی مبتلا ہیں۔ کیوں کہ دولت ایمان سے تو آپ بحمد اللہ مشرف ہیں اور یہی وہ چیز ہے۔ جس کے نہ ہونے سے انسان پورے خسارہ میں پڑتا ہے۔ لیکن اعمال صالحہ وغیرہ میں ابھی ہم کوتاہی کر رہے ہیں اور خسارہ سے بالکل بچنا اس پر موقوف ہے۔ کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح وغیرہ بھی ہو اور چونکہ خسارہ تھوڑا سا بھی بُرا ہے۔ اس لیے ہم کو کوشش کرنا چاہیے کہ خسارہ سے بالکل بچ جائیں) تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ مگر وہ لوگ خسارہ میں نہیں ہیں۔ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے اور باہم ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے۔ حق کے معنی ہیں سچی بات۔ یعنی خبر مطابق واقع۔ مگر یہاں اس سے زید قائم وغیرہ مراد نہیں۔ بلکہ خاص اخبار صحیحہ مراد ہیں۔ یعنی دین کی باتیں۔ کیونکہ قرآن دین کی کتاب ہے۔ اس میں حق سے مراد وہ اخبار صحیحہ نہیں ہو سکتیں۔ جن کو دین سے تعلق نہ ہو۔ آگے

فرماتے ہیں۔ کہ اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے ہیں۔ آگے حق اور صبر کا فرق بتلاؤں گا۔

فرضیت تبلیغ

اس وقت اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ایمان وعمل صالح پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق پر بھی موقوف کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دین کی نصیحت کرنا دوسروں کو دین کی تبلیغ کرنا۔ پس آج کل جو فتنۂ ارتداد پھیل رہا ہے۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا ہم کو تبلیغ کا حکم ہے۔ کہ ان مسلمانوں کو جو فتنۂ ارتداد میں پھنسنے والے ہیں۔ یا ان پر اس کا خطرہ ہے۔ ان کو اسلام کی تبلیغ کریں۔ اسلام کے محاسن سے ان کو مطلع کریں اور اس طرح ان کو ارتداد سے بچائیں۔ تبلیغ ہمارے اوپر فرض ہے۔ اصولاً بھی فروعاً بھی۔ اس کا فرض ہونا تو اسی سے معلوم ہو گیا۔ کہ حق تعالیٰ نے جس طرح ہم کو ایمان وعمل صالح کا امر فرمایا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق کا بھی امر فرمایا ہے اور اس مجموعہ پر خسارہ سے بچنے کو موقوف کیا ہے۔

اب اپنی غفلت کا حال دیکھیے۔ کہ ہم لوگ اس سے کس قدر غافل ہیں چوبیس گھنٹہ میں کتنی دیر ہم اس کام کو کرتے ہیں اور کتنا وقت اس فریضہ کی ادا میں صرف کرتے ہیں۔ جن پر ہمارا زور نہیں۔ ان کو تو رہنے دو۔ مگر جن پر زور ہے ان کے ساتھ بھی تو تواصی بالحق کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔

اہل وعیال کو تبلیغ

مرد گھر میں آتے ہیں۔ تو سوائے اس کے کہ کھانے پینے پر بیوی پر عتاب ہو گا یا کرتہ نہ سینے پر غصہ ہو گا۔ دین کی ایک بات بھی ان سے نہ

کہی جائے گی۔

پھر ان میں جو لوگ نوتعلیم یافتہ ہیں۔ وہ بے چاری شریف زادیوں کو بھوبڑ بنائیں گے اور ان کے سامنے دل خراش الفاظ میں میموں کی تعریف کی جاتی ہے اور جو مرد خود دیندار نہیں۔ میں ان کی زیادہ شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ مجھے زیادہ شکایت دینداروں کی اور نمازیوں کی ہے۔ کہ وہ بھی اپنے گھر والوں کو دین پر متنبہ نہیں کرتے، نہ اس کی خبر رکھتے ہیں۔ کہ آج بیوی بچوں نے نماز پڑھی یا نہیں؟ اور کوئی کام خلافِ شرع تو نہیں کیا؟ بس ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ ہم کو خود اپنی اصلاح کر لینا چاہیئے۔ اس طرح ہم خود جنت میں پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ آپ سے اس امر کا بھی مواخذہ ہوگا۔ کہ تم نے اپنے گھر والوں کو دین کے رستہ پر کیوں نہیں چلایا۔ صاف ارشاد ہے۔ کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔

اے مسلمانو! تم اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو نارِ جہنم سے بچاؤ۔

اور حدیث میں ہے:۔

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته۔

کہ تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحتوں کا ذمہ دار اور نگہبان ہے اس سے اس کے ماتحتوں کے متعلق باز پرس ہوگی۔ تو یہ گھر والے تمہارا پیچھا کب چھوڑنے والے ہیں۔ اگر یہ جہنم میں گئے۔ تو تم بھی وہاں ان کے ساتھ ہی رہو گے۔

تعلیم نسواں

عورتوں کے متعلق اوّل تو باپ کے ذمہ تعلیم فرض ہے۔ کہ ان کو دین سے باخبر کرے۔ اگر وہ جاہل رکھے۔ تو شوہر کے ذمہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنی

بیوی کو تعلیم دے۔ بتلائیے اس فرض کو کتنے شوہر ادا کرتے ہیں۔ پھر شکایت کی جاتی ہے۔ کہ عورتیں جاہل ہیں۔ اے صاحب! تم نے خود ان کو جاہل رکھا ہے۔ اگر تم ان کو تعلیم دیتے۔ تو وہ کیوں جاہل رہتیں۔ اور اگر کسی کو تعلیم نسواں کا اہتمام بھی ہوا تو وہ ان کو انگریزی کی تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ اب عورتیں بھی ایم اے ہونے لگی ہیں۔ ان کو تاریخ اور جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے اور کیا اس سے تواصی بالحق کا فرض ادا ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ ان علوم سے عورتیں تو کیا۔ اگر مرد بھی جاہل رہیں تو دین کا کچھ ضرر نہیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس پر فخر فرماتے ہیں:۔

نحن امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا وهكذا۔

کہ ہم ان پڑھ لوگ ہیں۔ ہم کتاب و حساب نہیں جانتے۔ پھر انگلیوں کے اشارہ سے بتلایا کہ مہینہ کے دن اتنے اتنے ہوتے ہیں۔ یعنی کبھی تیس، کبھی انتیس۔

چنانچہ حضرات صحابہؓ میں بہت ایسے بھی تھے۔ جن کو لکھنا تک نہیں آتا تھا۔ اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ہم کو اس پر فخر ہے۔ کہ بایں ہمہ تمام عالم کے فصحاء، بلغاء، و حکماء، و عقلاء کو انہوں نے نیچا دکھا دیا ہے۔ کیوں کہ دین کا علم ان کو پوری طرح حاصل تھا۔ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے اور جس پر ہم تمام دنیا کو دعوت دیتے ہیں۔ کہ کوئی ایسی تعلیم مقابلہ میں لائے جیسی قرآن کی تعلیم ہے۔ کہ آج ایک ادنیٰ طالب علم دعوے کر سکتا ہے۔ کہ تمام عالم قرآن کی بلاغت و حکمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بس یہی علم تھا کہ جو صحابہؓ کے پاس تھا اور وہ بھی محض زبانی تھا۔ جو لکھنے پڑھنے سے حاصل نہ ہوا تھا۔ بلکہ محض سننے سنانے سے حاصل کیا گیا تھا۔ مگر حضورؐ کے فیض صحبت سے اور اس زبانی علم ہی سے ان کا عقل و فہم اس قدر عالی ہو گیا تھا۔ کہ امام ابو حنیفہؒ جو فقہ و معانی کے امام ہیں

فرماتے ہیں۔ کہ صحابی کی تقلید واجب ہے۔ میں قول صحابی کے سامنے قیاس کو ترک کردوں گا۔

(ولنعم ما قال اکبر حسین الہ آبادی ؎

در فشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی ہو گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

۱۲ جامع)

غرض محض زبانی تعلیم سے بھی اس فرض کی ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے۔ گو کتابت و تعلیم بھی ایک درجہ میں ضروری ہو۔ مگر تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم عورتوں کو دینا تو بالکل ہی فضول بلکہ مضر ہے۔ ان کو تو صرف دین کی تعلیم دینا چاہیئے شوہر صاحب بیوی میں عیب تو نکالتے رہتے ہیں۔ مگر وہ اس کی تعلیم کا تو اہتمام کریں۔

میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ عورتوں کو دین کی تعلیم دے کر دیکھو۔ کہ اس سے ان میں عقل و فہم و سلیقہ و انتظام دنیا کا بھی کس قدر پیدا ہوتا ہے۔ جن عورتوں کو دین کی کی تعلیم حاصل ہے۔ عقل و فہم میں ان کا مقابلہ وہ عورتیں کبھی نہیں کر سکتیں۔ جو ایم اے بنیں ہو رہی ہیں۔ ہاں بے حیائی میں وہ ان سے ضرور بڑھ جائیں گی اور باتیں بنانے میں بھی انگریزی پڑھنے والیاں شاید بڑھ جائیں۔ مگر عقل کی بات دیندار عورتوں ہی کی زبان سے زیادہ نکلے گی اور تعلیم دین کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اگر عورتیں لکھ پڑھ نہ سکیں۔ تو ان کو روزانہ دو چار مسئلے اُن کی ضرورت کے بتلا دیا کریں اور کوئی کتاب عقائد کی اور مواعظ و نصائح کی اور حکایات صلحا کی ان کو سنا دیا کریں۔ انشاء اللہ چند روز میں بدوں لکھے پڑھے ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔

غرض جن پر ہمارا اثر ہے۔ ان کو بھی تو آج کل خطاب نہیں کیا جاتا۔ پھر جن پہ اثر نہیں ہے۔ ان کو تو کیا خاک تبلیغ کریں گے۔

ترکِ تبلیغ

شاید بعض لوگ یہ کہیں کہ ہم تو وعظ کہتے رہتے ہیں۔ تو تبلیغ ہو گئی۔ جیسے مثلاً میں ہی وعظ کہہ رہا ہوں۔ سو میں وعظ کی حقیقت کو خوب جانتا ہوں۔ خود کوئی کسی جگہ جا کر وعظ نہیں کہتا۔ بلکہ اول ان سے درخواست کی جاتی ہے۔ جس پہ یہ سو بہانے کرتے ہیں۔ نخرے کرتے ہیں۔ کہ اس وقت سر میں درد ہے ناک میں درد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عذر خطاب طویل کے لئے تو ہو سکتا ہے۔ مگر اس میں درد سر کیا مانع ہو سکتا ہے۔ کہ کسی سے ایک دو بات کہہ دی جائے بس شکایت اسی کی ہے۔ کہ جو لوگ دیندار اور نمازی ہیں۔ جس طرح وہ نماز کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا اسی درجہ میں تواصی بالحق اور تبلیغ کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگر کبھی نماز قضا ہو جائے۔ تو اس پر ندامت تو ہوتی ہے مگر ترک تواصی اور ترک تبلیغ پر ذرا ندامت نہیں ہوتی۔ انصاف سے کہئے کیا کبھی بیوی کو نصیحت نہ کرنے پر بھی آپ کو ندامت ہوئی ہے یا کسی دوست کی وضع خلاف شریعت تھی۔ کیا اس کو نصیحت نہ کرنے پر بھی ندامت ہوئی ہے۔ کبھی نہیں۔

اور اگر کبھی اتفاقاً کسی کو نصیحت کر دیتے ہیں۔ تو بجائے اس کے کہ اس پر شکر کریں۔ کہ آج مدت کے بعد فرض کی ہم کو توفیق ہوئی۔ اُلٹا اس پہ ناز کرتے ہیں۔ کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ جیسے شب قدر کے جاگنے پر فخر ہوتا ہے مگر ظہر کی نماز پڑھ کر کوئی فخر نہیں کرتا۔ کھانا کھا کر کوئی ناز نہیں کرتا۔ پھر نصیحت کر دینے پر فخر کیوں ہے۔ راز وہی ہے کہ نماز ظہر کی تو اپنے ذمہ فرض سمجھتے ہیں اور فرض کا ادا کر دینا کچھ کمال شمار نہیں ہوتا اور تواصی بالحق کو فرض نہیں

سمجھتے۔ اس کو زائد کام سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے اگر اس کی نوبت کبھی آجاتی ہے۔ تو اس پر فخر کرتے ہیں۔ اگر اس کو بھی فرض سمجھتے۔ تو اس پر فخر نہ ہوتا۔ بلکہ یہ سمجھتے۔ کہ یہ تو ہمارے ذمہ ضروری تھا اور جس طرح نماز کے ترک پر ندامت ہوتی ہے اسی طرح وہ دن کو تواصی بالحق بھی ترک ہو جاتی۔ تو اس پر بھی اپنے نفس کو ملامت کی جاتی۔ مگر اس پر کوئی بھی اپنے کو ملامت نہیں کرتا۔ تو یہ تو ایسا ہوا۔ جیسے ایک آدمی عشاء کی نماز نہ پڑھے۔ صرف چار نمازیں پڑھے۔ تو یہ کوئی نمازی ہے۔ اس کو کوئی بھی نمازی نہ سمجھے گا۔ پھر آپ تبلیغ کو ترک کر کے اپنے کو دیندار کیوں کر سمجھتے ہیں؟ خوب سمجھ لیجئے۔ کہ بدوں اس کے آپ دیندار نہیں ہو سکتے۔

تبلیغ صرف علماء کا کام نہیں

آج کل لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ یہ تو مولویوں کے ذمہ ہے۔ سو اگر یہ کام تنہا مولویوں کے ذمہ ہے۔ تو پھر نماز روزہ کو بھی پیروں کے ذمہ سمجھو اور تم آزاد زندگی گذارو۔ جیسے بعض دیہات والوں کا خیال تھا اور شاید اب بھی کوئی موضع ایسا ہو جہاں یہ خیال ہو۔

چنانچہ ایک پیر گاؤں میں پہنچے۔ تو وہاں کا چودھری اس کو دیکھ کر کہنے لگا۔ کہ پیر توں تو (یعنی تُو تو) بہت دُبلا ہو گیا۔ تیرا جی بھی اچھا ہے۔ پیر نے کہا دُبلا کیوں کر نہ ہوں۔ تم لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ تمہارے بدلے میں نمازیں پڑھتا ہوں، روزہ نہیں رکھتے۔ سب کے بدلے میں روزے رکھتا ہوں۔ اور سب سے مشکل کام یہ ہے۔ کہ سب کی طرف سے پل صراط پر مجھے چلنا پڑتا ہے۔ جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ چودھری نے کہا واہ رے (کلمہ تعجب کا ہے) توں تو بہت کام کرے ہے۔ جا میں نے تجھے مونجی کا کھیت دیا۔

پیر کو خیال ہوا۔ کہ گاؤں والوں کی بات کا کیا اعتبار۔ جلدی سے کھیت پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ تو چودھری سے کہا۔ کہ خان صاحب! پھر کھیت پر میرا قبضہ کرا دو۔ کہا ہاں ہاں چل تجھے قبضہ بھی کرا دوں۔ تو وہ چودھری پیر کو ڈول ڈوال لے گیا (یعنی کھیتوں کے درمیان جو تپلی تپلی مینڈھ ہوتی ہے۔ اس راستہ سے لے گیا) یہ ڈول بہت تپلی ہوتی ہے۔ جس پر چلنا ہر ایک کو آسان نہیں چنانچہ ایک جگہ پیر کا پیر پھسلا اور وہ کھیت کے اندر گر گیا۔ چودھری مرید نے پیر کی کمر میں ایک لات رسید کی۔ کہ تو تو کہتا تھا کہ میں پل صراط پر چلتا ہوں۔ جو بال سے باریک تلوار سے تیز ہے۔ تجھ سے ایک بالشت کی ڈول پہ تو چلا نہ گیا۔ پل صراط پہ کیا خاک چلتا ہو گا۔ تو جھوٹا ہے۔ جا ہم کھیت تجھے نہیں دیتے۔

تو گاؤں والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ نماز روزہ پیروں کے ذمہ ہے۔ ہمارے ذمہ کچھ نہیں۔ جیسے عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام سب کی طرف سے کفارہ ہو گئے۔ اس کے بعد سونے پر سہاگہ یہ ہو گیا۔ کہ بعض بزرگوں کو یہ منکشف ہو گیا تھا۔ کہ تمہارے سلسلہ والے سب بخش دیئے جائیں گے۔ یہ بات ان پیرزادوں کے ہاتھ آ گئی۔ اس سے وہ مخلوق کو ورغلاتے ہیں۔ حالانکہ اس کا یہ تو مطلب نہیں۔ کہ سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد نماز کی بھی ضرورت نہیں۔ روزہ کی بھی ضرورت نہیں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تو وعدہ ہے۔ کہ آپ کی امت کی مغفرت کر دی جائے گی تو کیا اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ نماز وغیرہ کی اُمت کو کچھ ضرورت ہی نہیں رہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابیؓ نے درخواست کی تھی۔ کہ میں جنت میں آپ کے ساتھ مرافقت چاہتا ہوں۔ تو حضورؐ نے فرمایا بہت اچھا۔

ولکن اعنی علی نفسك بكثرة السجود۔

کہ تم کو بھی اس میں کچھ سہارا لگانا چاہیئے اور وہ سہارا یہ ہے۔ کہ تم نماز کی کثرت کرتے رہنا۔ یہ حدیث صاف بتلاتی ہے۔ کہ بزرگوں کے سلسلہ سے جو نفع ہوتا ہے۔ اس میں یہ شرط ہے۔ کہ اُن بزرگ کے طریقہ پر چلتا رہے بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ اگر تواصی بالحق اور تبلیغ صرف علماء کے ذمہ ہے۔ تو پھر نماز روزہ کو پیروں کے ذمہ کر کے آزاد ہو جاؤ۔ یہ علماء ہی سارا بوجھ لادنے کے لیئے کیوں منتخب کیئے گئے اور انہی پر لادا جائے۔

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ اس کام میں علماء کو عوام سے امتیاز نہیں ہے۔ امتیاز ضرور ہے۔ مگر سارا کام انہی کے ذمہ نہیں ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ خطاب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطاب عام، دوسرے خطاب خاص۔ دوسری تقسیم یہ ہے۔ کہ ایک خطاب بالمنصوص ہے، ایک خطاب بالاجتہاد۔

پس خطاب عام بصورت وعظ تو علماء ہی کا کام ہے۔ انہی کے خطاب عام میں اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کو مقتدا سمجھتے ہیں اور عامی کو مقتدا کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے وعظ عام میں اثر نہیں ہوتا۔ مگر انفرادی خطاب میں علماء کی تخصیص نہیں۔ انفرادی طور پر ہر مسلمان ایک دوسرے کو نصیحت کر سکتا ہے۔

اسی طرح خطاب بالمنصوص علماء کے ساتھ خاص نہیں۔ دیکھئے جو مسائل صاف صاف شریعت میں مذکور ہیں۔ ان کی تبلیغ صرف علماء سے خاص نہیں) ہر شخص بآواز بلند کہہ سکتا ہے۔ کہ ایمان لانا فرض ہے۔ نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج فرض ہے اور امور اجتہادیہ سے خطاب کرنا علماء کے ساتھ خاص ہے۔ عوام اس میں غلطی کریں گے۔ عالم کو اول تو جزئیات بہت یاد ہوں گے۔ وہ اس میں غلطی نہ کرے گا اور اگر جزئیات یاد بھی نہ ہوتے۔ تو علم کی شان کے اعتبار سے اس کو لاادری[1] کہنے میں عار نہ ہوگا۔ غرض ایسے امور

[1] کہ میں نہیں جانتا۔ ۱۲

کی تبلیغ کرنا جن کی حقیقت علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یا خطاب عام کے ساتھ وعظ کہنا اور دین کے احکام بیان کرنا تو علماء کے ساتھ خاص ہے۔ اور انفرادی خطاب ایسے مسائل کے ساتھ جو منصوص اور مشہور ہیں۔ علماء سے خاص نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ تو یوں فرمایا ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ۔

کہ اے مسلمانو! تمہارے اندر ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے۔ جو خیر کی طرف بلائیں۔ یہاں تو دعوت کو ایک جماعت کے ساتھ خاص فرمایا ہے اور اس کے بعد ارشاد ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

کہ اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو۔ جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیئے ظاہر کیئے گئے ہو۔ تم نیک کاموں کا حکم کرتے ہو، بُرے کاموں سے روکتے ہو۔

یہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو سب کے لیئے عام کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہو گیا۔ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایک درجہ ایسا بھی ہے۔ جو سب کے ذمہ ہے اور علماء کے ساتھ خاص نہیں۔ اس کی تفصیل وہی ہے۔ جو میں نے اوپر بیان کی۔

تقسیم خدمات

ہاں اس جگہ ایک فرق اور ہے۔ وہ یہ کہ ایک جماعت تو سارے کام چھوڑ کر صرف تبلیغ ہی کے واسطے مقرر ہونا چاہیئے۔ اس کا ذکر ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر میں ہے اور ایک جماعت دوسرے کاموں کے واسطے ہوگی۔ فرصت و موقعہ کے وقت میں امر بالمعروف

بھی کر لیا کرے۔ اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے۔ اس کو اہل تمدن تقسیم خدمات کہتے ہیں اور کوئی قوم بدوں تقسیم خدمات کے ترقی نہیں کر سکتی۔ پس علماء کے ذمہ تو تبلیغ اس شان سے ہے۔ کہ وہ اپنے سارے اوقات میں یہی کام کریں اور دوسرے آدمی جستہ جستہ اوقات میں کبھی یہ کام کیا کریں۔ کیونکہ اس سورۃ میں حق تعالیٰ نے تواصی بالحق وتواصی بالصبر کو خسارہ سے بچنے کی شرط قرار دیا ہے اور خسارہ سے بچنا سب کے ذمہ فرض ہے۔

عذرِ لنگ

اب اگر کوئی یہ کہے۔ کہ صاحب اگر کسی کو عذر ہو۔ مثلاً ہم کسی کو نصیحت کریں اور وہ اس سے بُرا مانتا، ناک منہ چڑھاتا ہے اور ہمارے درپئے ایذا ہو جاتا ہے۔ تو کیا پھر بھی امر بالمعروف کریں۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ پہلے آپ امر بالمعروف شروع کر دیں۔ جب کام شروع کر کے کہیں گاڑی اٹکے گی۔ اس وقت استفتاء کر لینا۔ ابھی سے اعذار کا حکم دریافت کرنے کا آپ کو حق نہیں۔ بلکہ اس وقت اعذار کا حکم دریافت کرنا، گویا جان بچانے کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ سب مسلمان جانتے ہیں۔ کہ شریعت نے طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر پھر بھی اس قسم کے اعذار کو دوسرے کاموں کی بابت کوئی پیش نہیں کرتا۔ مثلاً وضو بعض دفعہ عذر سے ساقط ہو جاتی اور نماز میں قیام عذر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ مگر جس وقت نماز کے لیے کسی کو کہا جاتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ پہلے مجھے یہ بتلا دو۔ کہ وضو اور قیام کن کن عذروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہاں آپ نماز کے پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور عذر کو عارضی۔ اسی طرح کھانے میں بھی کسی نے طبیب سے یہ نہیں پوچھا کہ حکیم جی کھانے کے شرائط تو بتلا دو اور یہ بھی تو سمجھا دو۔ کہ کس وقت کھانا چھوڑ دیا جاتے۔ کیوں کہ یہاں بھی کھانے کو ضروری اور نہ کھانے کو عارضی

سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ وہ کبھی پہلے یہ نہیں پوچھتے۔ کہ مولوی صاحب روزہ کن کن وجوہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ بلکہ اگر کبھی کوئی ایسا سوال کرے۔ تو اس کی نسبت عام طور پر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید روزہ نہ رکھنے کے ارادے ہیں۔ صاحب! آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ امر بالمعروف شروع کرتے۔ پھر کسی وقت کسی باوجاہت آدمی کو خلاف شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹکتی۔ اس وقت مولوی صاحب سے پوچھتے۔ کہ اس موقعہ پر کیا کروں۔ یہ کیا کہ آپ نہ حاکم کو امر بالمعروف کریں، نہ محکوم کو، نہ مسلم کو، نہ کافر کو، نہ بیوی کو، نہ اولاد کو اور پہلے ہی سے لگے عذر کا حکم دریافت کرنے۔

شاید آپ یہ کہیں۔ کہ نماز روزہ میں تو عذر کم پیش آتے ہیں اور امر بالمعروف میں تو اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ یہ خیال غلط ہے۔ اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے میں کونسا عذر مانع ہے۔ بیوی نے نماز نہ پڑھی تھی۔ اس کو نصیحت کرنے میں کیا خوف تھا۔ کیا وہ آپ کو مار ڈالے گی۔ یا لڑکا نماز نہیں پڑھتا۔ تو وہ آپ کا کیا کر لے گا۔

اگر آپ کہیں کہ وہ سنتا نہیں ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر وہ کبھی امتحان میں فیل ہو جائے۔ تو اس وقت آپ اس کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں سزا دیتے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی بات کو کیوں کر سننے لگتا ہے۔ پس یہ سب بہانے لغو ہیں۔ اصل بات وہی ہے۔ کہ آپ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ بھلا اگر کوئی آپ کا دوست آپ کے سامنے زہر کھانے لگے۔ تو کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے۔ یقیناً ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر زہر کو اس کے ہاتھ سے لے لیں گے۔ اگر آپ تنہا قادر نہ ہوں گے۔ تو دوسروں کو امداد کے واسطے بلائیں گے۔ پھر اس کی کیا وجہ

ہے۔ کہ دین میں جو افعال مضر ہیں۔ ان سے روکنے میں اس اہتمام سے کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر نہیں سمجھتے اور یہ سخت مرض ہے۔ جس کا علاج بالضد ہے۔ مگر افسوس! اس قدر غفلت ہے۔ کہ خدا کی پناہ۔ کسی کو بھی اس مرض کے علاج کی طرف توجہ نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

کمالِ دین

سو اس سورت میں حق تعالیٰ نے اسی پر ہم کو متوجہ کیا ہے کہ جب تک تم دین کو کامل نہ کرو گے۔ خسارہ میں رہو گے اور دین کا کمال دو باتوں پر موقوف ہے۔ ایک اپنی تکمیل پھر دوسروں کی تکمیل۔ دوسروں کی تکمیل تواصی اور تبلیغ سے ہوتی ہے اور اس کے دو محل ہیں۔ دونوں کو حق تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے۔ ایک کو لفظ حق سے اور دوسرے کو لفظ صبر سے۔ اوپر میں نے ان دونوں کے اندر فرق بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس کو پورا کرتا ہوں۔ حق کہتے ہیں امر مطابق للواقع کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی خبر ہے۔ سو سمجھ لیجئے۔ کہ اس سے مراد عقائد ہیں اور عقائد حقہ جس قدر ہیں۔ وہ سب اخبارات ہی ہیں:۔

اللہ احد الرسول صادق والقیامۃ اٰتیۃ لا ریب فیہا والجنۃ حق والنار حق والقدر حق وغیرہ وغیرہ۔

اور صبر سے مراد اعمال ہیں۔ کیونکہ صبر کے معنی ہیں مضبوطی اور پختگی اور حبس علی ما یکرہ۔ کہ نفس کو ناگوار باتوں پر جمانا اور اس میں استقلال و پختگی پیدا کرنا اور مشقت و ناگواری اعمال ہی میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں کچھ کرنا پڑتا ہے۔ عقائد میں کوئی دشواری نہیں۔ کیونکہ ان میں تو صرف چند سچی باتوں کو جان لینا اور مان لینا ہے۔ اگر مشقت بھی

ہے. تو اپنے پہلے عقیدہ کے چھوڑنے میں ہوتی ہے. عقیدۂ حقہ کے اختیار کرنے میں کوئی مشقت نہیں. مشکل اور دشواری اعمال میں ہوتی ہے. اسی لیئے ان کو صبر سے تعبیر کیا گیا.

حاصل یہ ہوا. کہ تواصی اور تبلیغ عقائد کی بھی کرو اور اعمال کی بھی. دوسری عبارت میں یوں کہیئے. کہ حق سے مراد اصول ہیں اور صبر سے مراد فروع ہیں. اسی کو میں نے پہلے کہا تھا. کہ تبلیغ اصولاً بھی فرض ہے اور فروعاً بھی. یا یوں کہیئے حق سے مراد علوم ہیں اور صبر سے مراد اعمال. اور اس میں بڑا لطیفہ یہ ہے. کہ لفظ حق امنوا کے مناسب ہے اور لفظ صبر عملوا الصلحت کے مناسب ہے. جس چیز کو پہلے ایمان وعمل صالح کے عنوان سے بیان فرمایا تھا. اسی کو اس جگہ دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے. حاصل یہ ہوا. کہ خسارہ سے وہ لوگ بچے ہوئے ہیں. جو خود بھی ایمان لائیں اور دوسروں کو بھی ایمان کی ترغیب دیں اور خود بھی عمل صالح کریں اور دوسروں کو بھی عمل صالح کی نصیحت کریں.

طریقِ تبلیغ

رہا یہ سوال کہ جب مراد وہی ہے. جو امنوا وعملوا الصلحت سے مراد تھی. تو پھر عنوان کیوں بدلا گیا. اس کا جواب یہ ہے. کہ تفنن کلام کے لیئے الفاظ کا بدلنا موجب نشاط ہوتا ہے اس کے علاوہ اور بھی نکات ہیں. چنانچہ یہاں تواصوا بالایمان و تواصوا بالاعمال اس لیئے نہیں فرمایا. کہ تواصی میں دوسرے کو ترغیب ونصیحت ہوتی ہے اور دوسرے شخص کو شرعی اصطلاحوں میں نصیحت کرو گے تو اس کو وحشت ہوگی. اگر کافر سے دفعۃً یہ کہا جائے. کہ اسلام لے آؤ. تو اس سے گھبرا جائے گا. پس حق تعالیٰ نے عنوان کو بدل کر واعظ کو وعظ کا طریقہ تبلایا ہے. کہ نصیحت کے وقت اول

مخاطب سے یوں کہو۔ کہ آؤ ہم تم کو ایک سچی بات بتلائیں۔ کہ اس عالم کا ایک پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے وجود کو ماننا چاہیئے۔ جب اس نے اس کو مان لیا۔ تو اب کہو کہ وہ ذات وصفات میں یکتا ہے۔ اس کا علم ایسا ہے۔ قدرت ایسی ہونا چاہیئے۔ اس کو شرکت ومساوات اور جملہ عیوب سے پاک ہونا چاہیئے۔ ان باتوں کو سب مانیں گے۔ اس کے بعد اس سے کہو کہ پھر دیکھو کہ صانع عالم کی توحید اور تعظیم اس کی شان کے لائق کس مذہب میں ہے۔ یقیناً اسلام کے سوا کسی مذہب میں یہ بات نہیں ہے اب اس سے کہو کہ تم کو اسلام لانا چاہیئے۔ کیوں کہ اسلام ہی میں ان باتوں کی بخوبی تعلیم دی گئی ہے۔ اس طرح مخاطب کو ذرا وحشت نہ ہو گی۔ مجھے خوب یاد ہے۔ کہ جب میں نے صدرا میں شناۃ بالتکریر کی بحث پڑھائی ہے تو شروع میں طلبہ کو اس کی خبر نہیں۔ اس بحث کا نام شناۃ بالتکریر ہے۔ بلکہ اول سہل اور آسان لفظوں میں اصطلاحی الفاظ کو چھوڑ کر اس مقام کو حل کر دیا۔ جب سب سمجھ گئے۔ اس وقت میں نے کہا۔ کہ اسی مقام کا نام بحث شناۃ بالتکریر ہے۔ جس کو طلبہ بہت دشوار اور مشکل سمجھتے ہیں۔ مگر کچھ بھی مشکل نہیں تم خود دیکھ لو۔ کتنی آسانی سے تم نے اس کو سمجھ لیا ہے اور میں نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرۂ خوں نہ نکلا

مگر یہ باتیں میں نے ان کا دل بڑھانے کو کہہ دی تھیں۔ ورنہ جس مصیبت سے میں نے اس کو آسان کر کے حل کیا تھا۔ میرا ہی دل جانتا تھا۔

اور قاعدہ سمجھانے کا یہی ہے۔ کہ مصلح کو اپنے اوپر مشقت لینی چاہیئے اور مخاطب کو آسان کر کے مطلب سمجھانا چاہیئے۔ یہی طریقہ قرآن میں اختیار کیا گیا ہے۔ کہ مخاطب کو ایسے عنوان سے نصیحت کی جاتی ہے۔ جس

سے وہ متوحش نہ ہو۔ چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ نے اسی طرز کی تعلیم فرمائی ہے ارشاد ہے:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ.

کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک بات سنو۔ جو ہمارے تمہارے نزدیک برابر (درجہ میں ماننے میں قابل) ہے وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں۔ یہ عنوان ایسا ہے جس سے وحشت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کفار بھی شرک کو برا سمجھتے تھے۔ گو اپنے شرک کو برا نہ سمجھتے تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہے:۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ.

(یعنی اگر وہ اس بات کو مان لیں، تب تو گویا اسلام کو مان لیا۔ کیونکہ اسلام کی تعلیم یہی ہے) اگر وہ اس سے اعراض کریں تو (صاف) کہہ دو۔ کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔ اس میں تالیفِ قلب کی رعایت نہیں جیسے کہ مخاطب کسی طرح سمجھنے پر آتا ہی نہیں۔ سبحان اللہ! اس آیت میں ایسی بات تبلائی گئی ہے۔ جس کا فیصلہ عقلاء ہزاروں برس میں بھی نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ عقلاء میں بعض کی رائے تو اصلاح میں تالیفِ قلب کی طرف مائل ہوتی ہے اور بعض کی رائے صفائی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مگر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ تبلایا ہے۔ کہ ابتداء میں تو تالیفِ قلب کرو اور انتہا میں صفائی سے کام لو۔

چنانچہ اس آیت میں ابتداء تو ایسے عنوان سے ہے جس میں تالیف

قلب ہے اور انتہا میں صفائی کی تعلیم ہے۔ مگر آج کل حالت یہ ہے۔ کہ اگر مصالح کی رعایت ہے۔ تو عمر بھر مصالح ہی مصالح چلتے جائیں گے۔ کبھی صاف بات منہ پہ نہ آئے گی اور اگر صفائی اختیار کرتے ہیں۔ تو شروع ہی سے لٹھ سا مار دیتے ہیں۔

اسی طرح وتواصوا بالصبر میں اعمال کی ترغیب کا عنوان بتلایا ہے۔ کہ ابتدا ہی سے یہ نہ کہو کہ نماز پڑھو۔ کیوں کہ اس سے وحشت ہو گی۔ بھلا کفار کا تو کیا ذکر آج کل تو مسلمان بھی اس کے نام سے متوحش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک جنٹلمین نے اخبار میں لکھا تھا۔ کہ نماز کو اسلام کی برادری سے نکال دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس نے بہت سے کافروں کو اسلام سے روک رکھا ہے۔ جب وہ یہ سنتے ہیں۔ کہ مسلمان ہو کر پانچ وقت کی نماز پڑھنا پڑے گی۔ تو وہ اسلام لانے کی ہمت نہیں کرتے۔ یہ مسلمان صاحب ہیں جو اسلام کو کفر بنا کر کفار کو اس میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ بھلا جب اسلام سے نماز کو نکال دیا گیا۔ تو وہ اسلام کہاں رہا۔ کیونکہ ایک فرض کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ قصہ میں نے اس لیئے بیان کیا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ دفعتہً نماز روزہ کا ذکر تبلیغ کے وقت نہ کرنا چاہیئے کہ اس سے مخاطب کو وحشت ہو گی۔ بلکہ ابتداء میں اعمال کی ترغیب اخلاق کے پیرایہ میں دینا چاہیئے۔ کہ نفس کو پابند کرنا اور آزادی سے روکنا اور اس میں استقلال و پختگی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ انسان اور جانور میں کیا فرق ہو گا؟ مردانگی اسی میں ہے۔ کہ انسان اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو نفس کا تابع فرمان نہ ہو اور نفس کو تباہ کرنے والی سب سے بڑی چیز تکبر ہے۔ انسان کو تواضع اور عاجزی اختیار کرنی چاہیئے۔ جس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ کسی سب سے بڑی عظمت والے کی عظمت اس کے پیش نظر رہے۔ اسلام نے اس کے لیئے پانچ وقت کی نماز مقرر کی ہے۔ جس کو باقاعدہ ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا نقش اس کے دل پر جم جاتا ہے۔ کیوں کہ نماز میں ایسے

ارکان ہیں۔ جن سے انسان کی نہایت درجہ ذلت ظاہر ہوتی اور نفس پامال ہو جاتا ہے۔

دوسری تباہ کرنے والی چیز نفسانی خواہشوں کی حرص ہے مثلاً کھانے پینے اور عورتوں سے مخالطت کرنے کی حرص۔ اس کو بھی دبانا اور معتدل کرنا چاہیئے۔ ورنہ آدمی انسانیت سے باہر ہو جاتا ہے اور جرائم پر اقدام کرنے لگتا ہے۔ اسلام نے اس کا علاج روزہ کی صورت میں فرض کیا ہے۔ جو سال میں ایک مہینے کے اندر رکھا جاتا ہے۔

تیسری مہلک شئے حب مال ہے۔ جس شخص کے دل میں حب مال کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ ہر طرح اپنا ہی بھلا چاہتا ہے۔ گو دوسروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو چنانچہ بہت لوگ غریبوں کے حقوق دبا لیتے ہیں اور ان کے مال و جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے ہیں اور اس کا ظلم و قبیح ہونا ہر عاقل پر ظاہر ہے۔ اس لیئے حب مال کا علاج لازم ہوا۔ اسلام نے اس کے لیئے زکوٰۃ کو فرض کیا ہے جس سے مال کی حرص گھٹ جاتی اور دنیا کی محبت سے دل پاک ہو جاتا ہے اور تمام اعمال کا حاصل یہ ہے۔ کہ نفس کو جانوروں کی طرح آزاد نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اس کو پابند کیا جائے اور ناگوار امور کے استقلال و تحمل کا عادی کیا جائے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے وتواصوا بالصبر کے عنوان سے بیان فرمایا ہے۔ جس میں تمام اعمال کا مغز بتلا دیا گیا ہے۔ تو اس طرح نصیحت کرنے سے مخاطب کو وحشت نہ ہوگی۔

طرزِ نصیحت

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی قدس سرہٗ کی حکایت ہے کہ آپ سے کسی نے ایک رئیس خان صاحب کی شکایت کی۔ کہ یہ نماز نہیں پڑھتے۔ مولانا نے ان سے پوچھا۔ کہ خان صاحب نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ کہا، حضرت!

آپ سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے۔ کہ میں ڈاڑھی چڑھانے کا عادی ہوں۔ یہ شوق مجھ سے نہیں چھوٹتا اور نماز کے لیئے پانچ وقت وضو کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے باربار ڈاڑھی کا اُتارنا چڑھانا مشکل ہے۔ اس لیئے میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ مولانا نے فرمایا کہ بس آپ کو یہی عذر ہے۔ کہا ہاں۔ فرمایا، ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں۔ کہ آپ بے وضو ہی نماز پڑھ لیا کریں۔ مگر نماز کو نہ چھوڑیں۔ خان صاحب نے کہا۔ حضرت! بے وضو کے نماز پڑھنے سے تو یُوں سنا ہے۔ کہ آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ فرمایا، تم کافر نہ ہوگے تم بے فکر رہو اور بے وضو ہی[ك] پڑھ لیا کرو۔ چنانچہ خان صاحب بے وضو ہی نماز پڑھنے کھڑے ہوتے۔ مگر اندر سے دل نہ مانتا۔ آخر نماز چھوڑ کر وضو کیا اور وضو سے نماز پڑھی۔ پھر ایک دو روز تک تو ہر وضو کے بعد ڈاڑھی چڑھا لیا کرتے۔ اس کے بعد یہ بھی چھوڑ دیا اور اچھے خاصے پکے نمازی ہو گئے۔ دیکھئے مولانا نے کیسے عجیب طرز سے نصیحت کی۔ کہ مخاطب کو ذرا بھی توحش نہ ہوا۔

اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے ایک معتقد پاجامہ ٹخنوں سے نیچا رکھتے تھے۔ کسی نے اس کے سامنے ہی حضرت مولانا سے عرض کیا۔ کہ یہ آپ کے معتقد ہیں اور پاجامہ ٹخنوں سے نیچا رکھتے ہیں۔ آپ اُن کو منع نہیں فرماتے۔

مولانا نے فرمایا۔ کہ بھائی یہ اپنی وضع کے بڑے پختہ معلوم ہوتے ہیں کسی کے کہنے سے نہ چھوڑیں گے۔ خود ہی جی میں آجائے گا تو چھوڑیں گے۔ اور جب چھوڑ دیں گے۔ تو پھر دوسری وضع پر پختہ ہو جائیں گے۔ اس عنوان سے ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا نے امر بالمعروف کو ترک کیا۔ مگر

[ك] مولانا کو نورِ قلب سے پُورا اطمینان تھا کہ بے وضو نماز نہ پڑھیں گے۔۱۲

مگر سمجھنے والا سمجھ سکتا ہے۔ کہ مولانا نے عجیب طرز سے اس کو نصیحت کی ہے چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ اسی وقت سے وہ معتقد اس فعل سے تائب ہو گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

امر بالمعروف کی ایک صورت یہ ہے۔ کہ ظاہر میں ہر دیکھنے سننے والا سمجھ جائے۔ کہ اس نے نصیحت کی ہے اور ایک صورت یہ ہے۔ کہ ظاہر میں تو ترکِ امر ہو اور باطن میں امر ہو۔ بعض دفعہ یہ پہلی صورت سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ جب کہ نصیحت کرنے والا صاحب برکت ہو۔ پس بزرگوں کے ترکِ امر بالمعروف پر اپنے حال کو قیاس نہ کرو۔ تمہارے لیئے وہی طریقہ لازم ہے کہ زبان سے نصیحت کرو۔

اور اہل باطن کبھی قال سے نصیحت کرتے ہیں۔ کبھی حال سے۔ کبھی بال سے یعنی دل سے۔ کیونکہ ان کی توجہ قلبی میں بھی بڑا اثر ہے۔ کہ تمہاری زبان میں بھی وہ اثر نہیں۔

بزرگوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ان کے ادنیٰ غلاموں کی حالت یہ ہے۔ کہ بعض دفعہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ مگر دوسرے پر ایسا اثر ہوتا ہے۔ کہ زبان سے کہنے کا وہ اثر نہ ہوتا۔ ایک بار میں ریل سے سفر کر رہا تھا۔ میرے درجہ میں ایک جنٹلمین ڈپٹی کلکٹر بھی سوار تھے۔ ایک دوست نے ان سے تعارف کرایا اور میرے ساتھ وہ بہت دل کھول کر باتیں کرنے لگے۔ کہ اتنے میں مغرب کا وقت آ گیا اور میں نے اپنے ساتھیوں سمیت نماز کا اہتمام کیا۔ تو ایک دوست کہنے لگے کہ یہ ڈپٹی صاحب آپ کے معتقد معلوم ہوتے ہیں ان کو بھی نماز کے لیئے کہنا چاہیئے۔ اگر آپ ذرا اشارہ کریں گے۔ تو وہ ضرور [illegible] پڑھیں گے۔ میں نے کہا۔ کہ میں کیوں کہوں۔ کیا نماز کا فرض ہونا ان کو معلوم

نہیں، وہ خود کیوں نہیں پڑھتے۔ میرے کہنے سے پڑھیں گے۔ تو احسان مجھ پر ہوگا اور بھلا ان کا ہوگا۔ میں تو کچھ نہ کہوں گا۔ اگر آپ کو امر بالمعروف کا جوش ہے۔ آپ کہہ کر دیکھئے۔ میرے اس جواب پر وہ دوست بھی خاموش ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں پھر اُن کے پاس جا بیٹھا اور اسی بشاشت سے باتیں کرنے لگا جیسے پہلے کر رہا تھا۔ اس کا ان پر اس قدر اثر ہوا کہ بعد میں میرے دوست سے انہوں نے بیان کیا۔ کہ نماز پڑھ کر جب پھر مجھ سے اسی بشاشت کے ساتھ اُس نے باتیں کیں، تو گویا میں ذبح ہو گیا۔ کیونکہ میں تو یہ سمجھتا تھا۔ کہ جب سب نماز میں لگ گئے اور میں نہ لگا۔ تو مجھے نہایت ذلیل سمجھا جائے گا۔ مگر جب اس طرح باتیں کی گئیں۔ کہ گویا میری حرکت پر التفات ہی نہیں ہوا۔ تو میں زمین کے اندر گڑ گیا، کہ افسوس! میں تو اس قدر نالائق اور اُدھر سے یہ کرم۔ پھر وہ اس دن سے بڑے پکے نمازی ہو گئے اور بعد میں ملے تو ڈاڑھی بھی خوب بڑھالی تھی۔ تو بعض دفعہ ترکِ نصیحت زبانی نصیحت سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

گرچہ تفسیرِ زبان روشن گر ست
لیک عشقِ بے زبان روشن تر ست

بوئے آں دلبر چو پراں می شود
ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

مگر یہ دقائق ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ عوام کے لئے اصل طریق وہی ہے جو عام ہے۔ کہ زبان سے نصیحت کرو۔

حکمت کے ساتھ دعوت

غرض وتواصوا بالصبر میں یہ بتلایا گیا ہے۔ کہ اعمال کی ترغیب اخلاق کے پیرایہ میں دو۔ کیونکہ اخلاق حمیدہ کا استحسان سب کو مسلم ہے۔ اس

سے وحشت نہ ہوگی اور نصیحت میں اس کی رعایت ضروری ہے۔ کہ مخاطب کو وحشت نہ ہو۔ جیسا دوسری آیت میں ارشاد ہے:۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔

کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دو۔ دفعۃً لٹھ سا نہ مارو۔ سبحان اللہ اس ایک لفظ میں کتنی باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اعمال کا مغز بھی تبلا دیا۔ نصیحت کا طریقہ بھی تبلا دیا اور یہ صاف دلیل ہے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر کس قدر شفقت ہے۔ کہ نافرمانوں کی بھی اس قدر رعایت ہے۔ کہ ان کو متوحش نہ کیا جائے۔ دیکھئے اطباء بخار میں کونین دیتے ہیں۔ مگر ہر شخص کے لیئے طریقہ جُدا ہے۔ ایک تو اجنبی مریض کو دیتے ہیں۔ اس کے لیئے کچھ اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ویسے ہی پانی میں گھول کر اس کے سامنے کر دیتے ہیں۔ اگر وہ تلخی کی وجہ سے نہ پی سکے۔ تو طبیب یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا۔ کہ نہیں پیتا تو میری بلا سے میں کیا کروں۔

اور ایک صورت یہ ہے۔ کہ حکیم صاحب اپنے بیٹے کو کونین دیں۔ تو اس وقت مٹھائی لپیٹیں گے اور اس تدبیر سے گلے کے نیچے اس کو اتار دیں گے۔ پس پھر تو کونین کی حکومت ہے۔ ہم تو صرف اپنی اولاد کے لیئے یہ تدبیریں کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کے واسطے بھی یہی تدبیر کرتے ہیں۔ کہ مٹھائی میں کونین لپیٹ کر دیتے ہیں۔ اسی لیئے حکم ہے حکمت کے ساتھ دعوت کرنے کا اور اخلاق کے پیرایہ میں اعمال کی ترغیب دینے کا۔ اللہ تعالیٰ کی اس شفقت کا ظہور اہل اللہ میں بھی ہوتا ہے۔ اہل اللہ کو بھی مخلوق کے ساتھ بہت شفقت ہے۔ وہ ایسے طرز سے نصیحت کرتے ہیں۔ کہ جس سے مخاطب کو نفع ہی ہوتا ہے۔ اگر اس میں کچھ بھی ارادہ

اور طلب ہے. ورنہ اگر وہ خود نہ چاہے تو ایسے شخص کا علاج تو انبیاء علیہم السلام بھی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہدایت کرتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں اور یہ من یشاء کون ہے۔ وہی ہے جو خود بھی اپنی اصلاح کا قصد کرے۔

پھر اس شفقت کے ساتھ ایک بات سب سے بڑھ کر عجیب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتداء میں تو شفقت سے تبلیغ کرتے ہیں لیکن بعد میں جب نا امیدی ہو جاتی ہے۔ تو اب ان کو قطع شفقت کا امر ہوتا ہے پھر ان کو قوم کی بدحالی پر حزن نہیں ہوتا۔ (یعنی عقلاً ویمکن ان یکون طبعا کما یشیر الیہ قول شعیب علیہ السلام یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ نقد قال الشیخ فی بعض مواعظہ ان قولہ فکیف آسی یدل علی حزنہ وانہ سلی نفسہ بھذا الکلام ۱۲ جامع)

چنانچہ اسی موقعہ کے لئے ارشاد ہے:۔

ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون۔ یہ ہے ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

اسلام کا نرالا طرز تبلیغ

اب میں دعوے کرتا ہوں۔ کہ ہے کوئی مذہب جس میں اس آثار چڑھاؤ کے ساتھ تبلیغ کا طریقہ تعلیم کیا گیا ہو۔ کسی مذہب کا منہ نہیں جو اسلام کے سامنے آسکے۔

اور اس میں راز یہ ہے کہ ابتداء میں شفقت نہ کرنے سے تو خود تبلیغ کا کام اٹکتا ہے اور نا امیدی کے بعد حزن کرنے سے تبلیغ کی ترقی رکتی ہے۔ کیونکہ اب حزن کرنے سے مبلغ کی ہمت پست ہو جائے گی۔ اس وقت اس کو یہ تعلیم ہے کہ ہدایت تمہارے قبضہ میں نہیں۔ بلکہ خدا کے قبضہ میں ہے بس تم کو اپنا کام کرنا چاہیئے۔ تمہارا ثواب کہیں نہیں گیا اور جو کام خدا کا ہے اس کو خدا کے سپرد کرو۔

ع کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن

اب اس تعلیم سے اس کا دل بڑھے گا اور برابر تبلیغ کرتا رہے گا۔ سبحان اللہ! کیسی پاکیزہ اور عجیب تعلیم ہے اور یہ نکتے ہی نہیں۔ بلکہ سب باتیں قرآن میں مصرح ہیں۔

دوسرا راز وتواصوا بالصبر میں یہ ہے۔ کہ جب اس عنوان سے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر کیا ہے اور تواصی و تبلیغ بھی ایک عمل ہے۔ تو اس میں مبلغ کو تنبیہ ہے۔ کہ جب تم دوسروں کو صبر کی (یعنی استقلال فی الاعمال کی) نصیحت کرتے ہو تو ذرا خود تبلیغ میں بھی صبر و استقلال سے کام لینا۔ کیونکہ تبلیغ میں بعض ناگواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ اگر صبر و استقلال سے کام نہ لیا تو تبلیغ دشوار ہو جائے گی۔

رہا یہ کہ اس عنوان کو تبلیغ عقائد میں کیوں اختیار نہ کیا گیا۔ تبلیغ اعمال ہی میں کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کی وجہ آئندہ معلوم ہو جاتے گی (جہاں والعصر کی قسم کی توجیہ شروع ہوئی ہے۔ اس سے ذرا پہلے)۔

رہا یہ کہ تواصی بالحق کو مقدم اور تواصی بالصبر کو مؤخر کیوں کیا گیا۔ اس کی وجہ ایک تو ظاہر ہے۔ کہ حق مفسر بالعقائد ہے اور صبر مفسر بالاعمال ہے اور عمل عقائد سے مؤخر ہے۔ دوسری بات ابھی میرے ذہن میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ عقائد میں تو ہر شخص اُسی عقیدہ کا معتقد ہوتا ہے۔ جس کو

وہ حق سمجھتا ہے۔ کوئی شخص اپنے نزدیک باطل عقیدہ کا معتقد نہیں ہوتا۔ کیونکہ عقائد میں کچھ کرنا نہیں پڑتا، نہ اُن میں کچھ لذت ہے جو خواہ مخواہ لذت کی وجہ سے غلط اور باطل عقیدہ کا اعتقاد قائم کیا جائے اور اعمال میں چونکہ لذت ہے۔ اس لیئے انسان اعمال فاسدہ کا بھی جان بوجھ کر مرتکب ہو جاتا ہے۔ گو جانتا ہے کہ یہ عمل قبیح ہے۔ مگر لذت عاجلہ کی وجہ سے اس کو اختیار کرتا ہے۔ جیسا کہ بہت لوگ زنا اور شراب خوری میں مبتلا ہیں اور اس کے قبح سے بھی واقف ہیں۔ مگر عقائد میں یہ بات نہیں ہے۔ کہ لذت کی وجہ سے جان بوجھ کر کوئی غلط عقیدہ کا معتقد ہو۔ کیوں کہ وہ تو پھیکی چیز ہے۔ اس میں نفسانی لذت کچھ نہیں۔ اس لیئے عقائد میں ہر شخص اسی بات کا معتقد ہے۔ جو اس کے نزدیک حق ہے۔ پس اب عقائد حقہ شرعیہ کی جو لوگوں کو تعلیم کی جائے گی۔ تو گویا مخاطب فاسد العقائد کو اس کے زعم میں طاعات سے چھڑایا جاتا ہے۔ اسی لیئے عقائد کی تبلیغ لوگوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ نیز عقائد کا فساد محسوس نہیں صرف عقلی ہے اور اعمال کا فساد حسی ہے۔ ان کے مفاسد کا مشاہدہ کرایا جا سکتا ہے۔ اس لیئے مخاطب کو اپنے عقائد کا فساد جلدی معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ جو ان کو غلط کہے۔ اس کی بات ناگوار گزرتی ہے۔ ان وجوہ سے عقائد حقہ کی تبلیغ عام طور پر لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے اور یہی ناگواری سبب ہے۔ اس کا کہ ہم لوگ کفار کو اسلام کی تبلیغ نہیں کرتے۔

وقتِ ترکِ تبلیغ

بلکہ آج کل عموماً ہر قسم کی تبلیغ اسی لیئے متروک ہے۔ کہ مخاطب کو اس سے ناگواری ہوتی ہے اور عقائد کی تبلیغ میں یہ ناگواری زیادہ ہے۔ تو لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ ناگواری خلائق کو کون اپنے سر لے۔ مگر یہ کوئی عذر نہیں۔ اگر ہمارے اسلاف بھی اس کا خیال کرتے۔ تو آج ہم میں سے کسی کو بھی

کلمہ شہادت نصیب نہ ہوتا۔ آخر ہمارے آباؤ اجداد میں کوئی تو اول المسلمین ہوگا۔ اس کو جس نے اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ کیا اس نے بھی ناگواری مخاطب کی کوئی رعایت کی تھی۔ ہرگز نہیں۔ یاد رکھو۔ کہ محض ناگواری مخاطب کوئی عذر نہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ.

(کیا ہم تم کو نصیحت کرنے سے اس لیئے پہلو تہی کر لیں۔ کہ تم لوگ حد سے نکلنے والے ہو) حالانکہ حق تعالیٰ کے ذمہ تو امر بالمعروف واجب نہیں۔ وہ اس سے پاک ہیں۔ کہ ان پر کوئی بات واجب ہو۔ لیکن پھر بھی وہ مخاطب کی ناگواری کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہی امر ہم کو ہے۔

بس یاد رکھیئے۔ کہ ترک امر بالمعروف کے لیئے عذر صرف یہ ہے۔ کہ لحوق ضرر کا اندیشہ ہو اور ضرر بھی جسمانی محض فوت منفعت عذر نہیں۔ اب غور کیجیئے۔ کہ لحوق ضرر ترک تبلیغ کے کتنے مواقع میں ہوتا ہے۔ زیادہ تو یہ ہے کہ محض ناگواری مخاطب کا خیال مانع ہوتا ہے۔ تو اس شخص کی ناگواری کی پرواہ کیوں کی جاتی ہے۔ آپ کا مذاق تو یہ ہونا چاہیئے کہ ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

جو شخص خدا سے بیگانہ ہے۔ اگر اس کو احکام الٰہی کی تبلیغ ناگوار ہے تو ہماری جوتی سے ہم تبلیغ سے کیوں رکیں بس ہم کو خدا پر نظر رکھنا چاہیئے اور صرف اس کی رضا کا طالب ہونا چاہیئے۔ چاہے تمام عالم ناراض ہوجائے: ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

صاحبو! میں آپ کو ایک عبرتناک کثیر الوقوع (؟) قصہ سناتا ہوں۔ کہ

ایک چودہ برس کی ناقص العقل لڑکی جس نے ماں باپ کی گودوں میں پرورش پائی اور اُن کے گھر کو اپنا گھر، ان کے دوست کو اپنا دوست، اُن کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ دو لفظوں سے یعنی نکحت اور قبلت سے اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ کہ نامعلوم ان دو لفظوں میں کیا جادو بھرا ہوا ہے۔ کہ جہاں اس کے منہ پہ سے ہاتھ آتا اب شوہر کا گھر اس کا گھر ہے۔ اس کا دوست اس کا دوست ہے۔ اس کا دشمن اس کا دشمن ہے۔ گو شوہر کا دوست اس کے باپ کا دشمن ہی کیوں نہ ہو اور شوہر کا دشمن اس کے باپ کا دوست ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ اگر کسی وقت اس کا باپ بھی اس کے شوہر کا دشمن ہو جائے۔ تو عموماً عورتیں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہیں۔ افسوس اس لڑکی نے تو عقد کے ایجاب و قبول کو اس پختگی سے نبھایا اور ایسی مردانگی دکھائی اور ہم لوگ باوجود مرد ہونے کے خدا تعالیٰ سے معاملہ منعقد کر کے اس کو نہیں نبھاتے۔ کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر خدا تعالیٰ کے کے دوست کو اپنا دوست اور خدا کے دشمن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ غضب ہے۔ کہ ناقص العقل لڑکی تو ایک انسان سے تعلق جوڑ کر صرف اُسی کی ہو جاتی ہے اور ہم خدا سے علاقہ جوڑ کر صرف اس کے نہیں ہوتے۔ میں پھر کہتا ہوں۔ کہ آپ کا یہ حال ہونا چاہیئے۔ ؎

دلآرامی کہ داری دل درو بند

دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

بس تمام عالم سے کہہ دو کہ ہم نے ایک ذات سے علاقہ جوڑ لیا ہے جو اس سے ملے وہ ہمارا دوست ہے۔ جو اس سے الگ ہے، وہ ہم سے الگ ہے۔

اُسوۂ تبلیغ

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو اسلام کی دعوت دی۔ جب وہ راہ پر نہ آئے۔ تو صاف فرمادیا:۔

سَلٰمٌ عَلَیْکَ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا۔

کہ بس میرا سلام لو۔ اب تم سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا۔ اپنے خدا سے دعا کروں گا۔ صاحبو! ابراہیم علیہ السلام کا طرز اختیار کرو۔ اسلام کا مقتضیٰ یہی ہے۔

شاید اس پر کوئی یہ کہے۔ کہ وہ تو نبی تھے۔ ہم سے نبی کا طرز کیونکر اختیار ہو سکتا ہے۔ تو حضرت! یہ جواب دے کر تو آپ نے ذمہ داری کو اور بڑھا لیا۔ کیونکہ نبی تو مقتدا کو کہتے ہیں اور نبی کو حق تعالیٰ نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں۔ تاکہ لوگ اس نمونہ کے مطابق ہو کر حق تعالیٰ سے ملیں اور نمونہ کا مقتضا یہ ہے۔ کہ اگر آپ درزی کے پاس اچکن کا نمونہ بھیج دیں اور وہ نمونہ کے خلاف کپڑا تیار کر کے لائے۔ تو آپ حشر برپا کر دیتے ہیں اور اس کی ساری محنت کو اکارت سمجھ کر ایک پیسہ بھی مزدوری کا نہیں دیتے۔ بلکہ اس سے کپڑے کی قیمت بھی وصول کرتے ہیں۔ اب سمجھ لو کہ رسول کو خدا نے نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تم اس نمونہ کے خلاف رہو گے تو یہی حشر تمہارا ہو گا۔ جو تم نے درزی کے ساتھ کیا۔

حق تعالیٰ نے انبیاء و رسل کو اسی لیئے بھیجا ہے۔ تاکہ نمونہ دیکھ کر لوگوں کو عمل میں سہولت ہو۔ ورنہ حق تعالیٰ یہ بھی کر سکتے تھے۔ کہ روزانہ یا ہفتہ وار اخبار بھیج دیا کریں۔ جو ہر شخص کے گھر میں گرپڑا کرتا۔ جس میں ہر کام کی تصویر بھی ہوتی۔ جیسے بعض لوگوں نے نماز وغیرہ کے رسائل میں آدمی اور لوٹا وغیرہ کی تصویر بنائی ہے۔ تو حق تعالیٰ کو ایسا کرنا کیا مشکل تھا۔ مگر اس سے زیادہ

سہولت زندہ نمونہ میں ہے۔ جو تبلیغ بھی کرے، احکام کو سمجھائے بھی اور عمل کر کے دکھلا بھی دے۔ اس لیئے انبیاء بھیجے گئے۔ پس آپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام تو نبی ہیں حقیقت میں اپنے ذمہ الزام قائم کر لینا ہے۔ چنانچہ حق تعالے ارشاد فرماتے ہیں:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۚ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ

(ترجمہ) تمہارے لیئے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں اچھا نمونہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے بیزار ہیں اور تمہارے ان معبودوں سے بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ ہم تم سے الگ ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان عداوت و بغض ہمیشہ کے لیئے قائم ہو چکی ہے۔ جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ۔ پس ہم کو کسی کی ناگواری کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور ناگواری مخاطب کی وجہ سے تبلیغ میں کوتاہی نہ کی جائے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ناگواری زیادہ عقائد کی تبلیغ میں ہوتی ہے۔ اس لیئے تواصی بالحق کو اہتمام کے لیئے مقدم کیا گیا اور تواصی بالصبر کو مؤخر۔

مبلّغ کو صبر و استقلال کی تعلیم

رہا یہ کہ تواصی بالصبر کے عنوان سے مبلغ کو بھی صبر و استقلال کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ تعلیم تبلیغ عقائد میں کیوں نہیں دی گئی۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اول یہ کہ تبلیغ عقائد بھی عمل ہے۔ تو وہ بھی تواصی بالصبر میں داخل ہے۔ پس یہ کہنا ہی صحیح نہیں۔ کہ تبلیغ عقائد میں مبلغ کو صبر کی تعلیم نہیں۔ دوسرے

بعد تسلیم کے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ تبلیغ عقائد میں مخاطب کو ناگواری زیادہ ہوتی ہے۔ مگر جب وہ اپنے عقائد سابقہ کی غلطی سمجھ کر عقائد حقہ اختیار کر لیتا ہے۔ تو اب اس کے لیے بار بار تبلیغ کی ضرورت نہیں رہتی۔ بخلاف اعمال کے۔ کہ ان کی تبلیغ ابتداء میں کچھ دشوار نہیں، نہ مخاطب کو اس میں زیادہ ناگواری ہوتی ہے۔ مگر اس میں تبلیغ کی بار بار حاجت ہوتی ہے۔ کیوں کہ انسان اپنے اعمال فاسدہ کو ایک بار چھوڑ کر بوجہ لذت نفسانی کے پھر اختیار کر لیتا ہے۔ تو اس میں ابتدائی تبلیغ کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ بقاء تبلیغ کی بھی حاجت رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تبلیغ عقائد کی ابتداء دشوار ہے۔ مگر بقاء سہل ہے اور تبلیغ اعمال میں ابتداء آسان ہے۔ مگر بقاء دشوار ہے۔ اس لیئے یہاں ایسا عنوان اختیار کیا گیا جس میں مبلغ کو بھی استقلال و صبر کی تعلیم ہے۔ واللہ اعلم باسرار کلامہ۔

توضیح قسم زمانہ

اب قسم کی توجیہ بتلاتا ہوں۔ جس کا میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا۔ تو سمجھیئے۔ کہ قسم کے ساتھ تاکید کلام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے۔ اس کے نام کی عظمت کی وجہ سے قسم کھانے والا جھوٹ سے رکتا اور ڈرتا ہے۔ کہ اگر اس کا نام لے کر جھوٹ بولوں گا۔ تو وبال میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ یہ صورت تو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی کھائی ہوئی قسموں میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مخلوق میں کوئی ایسا معظم نہیں۔ جس کا نام لینا خدا تعالیٰ کو کسی امر سے مانع ہو۔

دوسری صورت تاکید بقسم کی یہ ہے۔ کہ مقسم بہ سے جواب قسم کی توضیح مقصود ہو۔ میں نے جہاں تک غور کیا۔ تو اقسام قرآن میں یہی صورت معلوم ہوئی۔ کہ مقسم بہ کو جواب قسم کی توضیح میں بڑا دخل ہے اور یہ بہت بڑا علم ہے۔ لیکن ہر مقام پہ سیاق و سباق کو دیکھنا اور غور کرنا پڑتا ہے اور غور کرنے

سے قسم و جوابِ قسم میں ارتباط معلوم ہو جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.

مگر غور کرنے کی اس کو اجازت ہے۔ جس کے پاس آلاتِ اعتبار ہوں۔

چنانچہ اس کی ایک مثال اس وقت ذہن میں آئی حق تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى.

یہ سورت ایک بار کی فترۃ وحی کے بعد نازل ہوئی ہے اور فترۃ وحی قبض کی صورت ہے اور نزول وحی بسط ہے۔ تو حق تعالیٰ دن اور رات کی قسم کھا کر فرماتے ہیں۔ کہ آپ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ نے نہ چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہے۔ اس قسم کو جوابِ قسم کی توضیح میں اس طرح دخل ہے۔ کہ تبلا دیا۔ کہ قبض کو علامت غیر مقبولیت نہ سمجھو۔ جیسا کہ بعض سالکین اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ نزول واردات کو علامتِ رضا اور انسداد احوال و کیفیات کو علامتِ رد سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ دنیا والے قبض و بسط رزق کو بھی علامت رضا و عدم رضا کی سمجھتے ہیں۔ روزی والے کو سب لوگ بھاگوان کہتے ہیں اور تنگدست کو منحوس اور مبتلائے ادبار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس کی حکایت فرماتے ہیں :۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ.

اللہ تعالیٰ نے اس خیال کو سورۃ والضحیٰ میں لیل و نہار کی قسم سے رفع فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ قبض و بسط کی مثال لیل و نہار جیسی ہے۔ بس جس طرح دن کے بعد رات کا آنا علامتِ رد نہیں۔ کیونکہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔ اسی طرح بسط کے بعد قبض کا آنا علامتِ رد نہیں۔ اور جس طرح تعاقب

لیل و نہار حکمت پر مبنی ہے۔ اسی طرح تعاقب قبض و بسط میں بھی حکمتیں ہیں۔ جیسے لیل و نہار کا تعاقب ناگزیر ہے۔ کہ بدون اس کے عالم کا انتظام درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سالک پر قبض و بسط کا تعاقب ضروری ہے۔

اس مثال کے بعد اب سورۃ العصر کی قسم کو سمجھیئے کہ اس کو جواب قسم سے کیا مناسبت ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ انسان دو چیزوں میں مقید ہے۔ ایک زمان میں، ایک مکان میں۔ لیکن مکان مستقر ہے۔ یعنی اس کے لیئے انقضا نہیں اور زمان غیر مستقر ہے۔ یعنی اس کے لیئے انقضاء ہے۔ کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ جو زمانہ گزر گیا، قبضہ سے باہر ہو گیا۔ تو حق تعالیٰ اس قسم سے انسان کے خسارہ کی دلیل بتلاتے ہیں۔ کہ یہ ایسا عاجز ہے۔ کہ جس طرف میں اس کا عمل مقید ہے۔ وہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اگر کسی وقت میں کوئی عمل اس سے فوت ہو گیا۔ تو اگر یہ اس کا تدارک بھی کرے گا تو دوسرے وقت میں کرے گا اور جو زمانہ عمل سے خالی گزر گیا وہ بے کار گیا۔ تو واقعی انسان بڑے خسارہ میں ہے۔ البتہ مسلمان اس خسارہ سے بچا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ایمان کی دولت ایسی ہے۔ کہ وہ ہر وقت میں باقی رہنے والی ہے۔ کہ ایک دفعہ ایمان کو اختیار کر لینے سے جب تک معاذ اللہ اس کی ضد کا اعتقاد نہ ہو ایمان قائم رہے گا اور یہ ہر وقت میں مؤمن ہو گا۔ سوتے ہوئے بھی، چلتے پھرتے بھی اور کھاتے پیتے ہوئے بھی۔ غرض کوئی وقت اور کوئی ساعت مسلمان کی طاعت سے خالی نہیں گزرتی۔ اگر اس سے اور بھی کوئی عمل صادر نہ ہو۔ تب بھی ایمان تو ایسی طاعت ہے۔ جو ہر وقت اس سے صادر ہو رہی ہے۔ اسی سے کافر کا خسارۂ عظیم میں ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا کوئی وقت معصیت سے خالی نہیں گزرتا۔ اگر وہ اور بھی کچھ گناہ نہ کرے۔ تو کفر ہی اس سے ہر وقت صادر ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ ایک بار

کفر اختیار کرنے کے بعد جب تک ایمان نہ لائے۔ کافر ہر وقت کافر ہے۔ کوئی ساعت اس کی کفر سے خالی نہیں گزرتی پس اس قسم سے انسان کے خسارہ کی بڑی دلیل معلوم ہوئی۔ کہ بدون ایمان کے اس کے خسارہ کی کچھ انتہا نہیں۔ کہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ میں اس کے سر پر عذاب بڑھتا جارہا ہے اور ایمان کے بعد اس کے نفع کی کچھ انتہا نہیں۔ کہ ہر ساعت میں اس کی طاعت بڑھتی رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام دنیا جانتی ہے۔ کہ نفع اور خسارہ زمانہ ہی میں ہوتا ہے۔ پس اس شخص سے بڑھ کر کوئی خسارہ میں نہیں۔ جس کا کوئی وقت سیکنڈ خسارہ سے خالی نہ ہو (اور یہ کافر ہے) اور اس شخص سے بڑھ کر کوئی نفع میں نہیں۔ جس کا کوئی وقت کوئی سیکنڈ کوئی حالت نفع سے خالی نہیں (اور وہ مومن ہے)۔

اور ہر چند کہ مسلمان کا نفع صرف ایمان ہی سے ہر وقت بڑھ رہا ہے مگر پورا نفع جب بڑھے گا۔ جب کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔ کیوں کہ عمل صالح سے ایمان قوی ہوتا اور گناہوں سے کمزور ہوتا ہے۔ پس مومن فاسق کا ہر وقت نفع کا بڑھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو ہر سیکنڈ میں ایک پیسہ کا منافع بڑھتا ہو اور مومن صالح کا ہر وقت نفع بڑھنا ایسا ہے۔ جیسے کسی کی ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا منافع بڑھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ پورا نفع اسی کا بڑھ رہا ہے۔ جس کو ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا نفع ہوتا ہو۔ پس گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہایت ضروری ہے اور عمل صالح اختیار کرنا لازم ہے۔ تاکہ ہر سیکنڈ میں ہزاروں کی ترقی ہو اور ہزار روپیہ سے کمی ہو کر ایک پیسہ ہی نہ رہ جائے۔ کہ نفع عظیم کے مقابلہ میں یہ بھی خسارہ ہے۔ گو کافر کے خسارہ کے مقابلہ میں نفس ایمان کا نفع بھی لاکھ درجہ افضل ہے۔

اور اگر معاملہ یہیں تک رہتا۔ تب بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا۔ کہ ہم کو ہزار کا نفع نہ سہی ایک پیسہ ہی کا سہی۔ مگر مصیبت اور خطرہ تو یہ ہے کہ گناہوں

کی وجہ سے بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایک پیسہ کی ترقی بھی نہیں رہتی۔ بلکہ خسارہ ہی خسارہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح اور تواصی بالحق و تواصی بالصبر کو کیوں بڑھایا۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ اعمال صالحہ جوہر ایمان کے محافظ ہیں اور گناہ و معاصی اس دولت کے دشمن ہیں۔ جو شخص خود گناہ کرتا، یا دوسروں کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر نصیحت نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل سے گناہوں کی نفرت کم ہو جاتی، پھر زائل ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں کو ہلکی معمولی بات سمجھنے لگتا ہے اور یہی کفر ہے۔ غرض اس مقام پر زمانہ کی قسم کو جوابِ قسم کی توضیح میں بہت بڑا دخل ہے۔ کہ اس سے خسارہ کی دلیل معلوم ہو گئی اور یہ دعوے مدلل ہو گیا۔ کہ واقعی انسان بڑے خسارہ میں ہے۔ اگر ایمان و عمل صالح سے محروم ہو۔

آیت کی تفسیر تو بقدر ضرورت ہو چکی اور جو باتیں اس کے متعلق اس وقت ذہن میں تھیں۔ میں بیان کر چکا۔ اب مقصود پر مکرر تنبیہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تک میں نے گو مشترک بیان کیا ہے۔ کہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر دونوں سے تعرض کیا ہے۔ مگر زیادہ مقصود اس وقت جزو اول یعنی تواصی بالحق کا بیان ہے۔ کہ ہم کو عقائد حقہ اسلامیہ کی تبلیغ کرنا چاہیے۔ کفار میں بھی اور کفار سے پہلے اُن نو مسلموں میں بھی جن پر ارتداد کا اندیشہ ہے۔ کیوں کہ آج کل فتنۂ ارتداد بعض اہل باطل کی طرف سے شروع ہو رہا ہے۔ وہ ناواقف نو مسلم جماعتوں کو بہکا رہے اور اسلام سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور واقعی اب تک ہم کو اس طرف توجہ نہ تھی۔ ہم اپنی کوتاہی کی تاویل نہ کریں گے۔ تاویل سے کیا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو تو حقیقتِ حال کا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے۔ واقعی اب تک ہم اس کام سے غافل تھے۔ اب جو غور

کر کے دیکھا جاتا ہے۔ تو حالت یہ ہے کہ بعض دیہات والوں کا اسلام نہایت کمزور اور نازک ہو رہا ہے۔ بعض لوگوں کو نماز روزہ کی تو کیا خبر ہوتی ان کو کلمہ تک بھی نہیں آتا۔ ان لوگوں میں تبلیغ اسلام کی سخت ضرورت ہے۔ خیر اب تک جو غفلت ہوئی وہ تو ہو چکی۔ لیکن آئندہ کے لیئے ہم کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔

ضرورتِ اخلاص

اور بحمد اللہ اس وقت کسی قدر توجہ مسلمانوں کو اس کام کی طرف شروع ہوئی ہے۔ مگر ان میں بھی غضب یہ ہے کہ انتظام نہیں ہے۔ بلکہ محض رسم پرستی ہے۔ کہ آگرہ کی طرف بعض اہل باطل نے کچھ نومسلموں کو مرتد بنانے کی کوشش کی تھی۔ تو جس کو دیکھو آگرہ ہی میں تبلیغ کرنے جا رہا ہے۔ سب کے سب آگرہ ہی میں آگرے۔ حالانکہ کام کا طریقہ یہ تھا۔ کہ ایک جماعت آگرہ جاتی، دوسری جماعت دوسرے مقامات کی خبر لیتی۔ کہ اور تو کسی جگہ اس قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ مگر ایسا کرنے سے نام نہ ہوتا۔ کیوں کہ آگرہ میں تبلیغ کرنے والے پہنچے ہوئے ہیں۔ وہاں جائیں گے۔ تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہاں یہ بھی تبلیغ کرنے آتے ہیں اور اخباروں میں بھی اُن کی آمد شائع ہو جائے گی۔ کیونکہ اخبار والوں کی توجہ ضلع آگرہ ہی کی طرف زیادہ ہے دوسرے مقامات پر جانے سے یہ نام نہ ہوگا۔ مگر مسلمان کو کام کرنا چاہیئے، نام سے کیا لینا۔ اسلام نام و نمود سے نہیں پھیلا۔ بلکہ کام سے پھیلا ہے اور کام بھی وہ جو خلوص کے ساتھ محض اللہ واسطے تھا۔

علماء پر بے جا الزام

اور مزہ یہ ہے۔ کہ اخباروں میں لیڈروں کی زبان پر اس فتنہ ارتداد

کا سارا الزام علماء کے سر رکھا گیا ہے۔ کہ ان کی غفلت کی وجہ سے یہ فتنہ پیدا ہوا۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ سب کا الزام علماء پر ہے۔ سلطنت اسلام پہ کوئی بلا آوے تو علماء کی بدولت۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر کوئی وبال آئے۔ تو علماء کی بدولت۔ مسلمانوں میں افلاس آئے تو علماء کی بدولت۔ کہ یہ سود کو حلال نہیں کرتے۔ نومسلم مرتد ہوں تو اس کا الزام بھی مولویوں پر ہے۔ کہ انہوں نے تبلیغ نہیں کی۔ ان نومسلموں کی خبر نہیں لی۔ بس آج کل علماء کی وہ حالت ہے۔ جو انوری شاعر نے کہا ہے۔ ؎

ہر بلائے کز آسمان آید
گرچہ بر دیگرے روا باشد

بر زمیں نارسیدہ می پرسد
خانۂ انوری کجا باشد

یا جیسے مولوی سالار بخش صاحب وعظ میں گناہوں کی لمبی فہرست بیان کر کے کہ آج کل لوگ زنا اور حرام خواری اور ترکِ صلوٰۃ وغیرہ میں مبتلا ہیں۔ اخیر میں یہ کہا کرتے تھے۔ کہ یہ سارا فساد مرچوں کا ہے۔ تو جیسے ان کے نزدیک ہر گناہ اور شر کا سبب مرچ تھی۔ ایسے ہی آج کل کے مسلمانوں کے نزدیک ہر بلا کا سبب مولوی ہیں۔

جیسے ایک مسافر کی حکایت ہے۔ کہ وہ سرائے میں ٹھہرا اور بھٹیاری کو آٹا دال وغیرہ دے کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کہ میرا کھانا پکا دے اور سامنے اس لیئے بیٹھا۔ تاکہ بھٹیاری چوری نہ کر سکے۔ جب بھٹیاری نے یہ دیکھا کہ سپاہی تو میرے اوپر مسلط ہو کر بیٹھ گیا۔ تو اس نے یہ تدبیر کی۔ کہ کھانا پکا کر جب سپاہی کے سامنے رکھا تو اپنے لڑکے سے کہا کہ خان صاحب کے ساتھ تو بھی بیٹھ جا (تاکہ اسی طرح کچھ وصول ہو) چونکہ دسترخوان پر سے کسی کو اٹھانا شرافت کے خلاف تھا۔ اس لیئے سپاہی خاموش ہو گیا۔ اور

بھٹیاری کے لڑکے کو اپنے ساتھ بٹھلالیا. بھٹیاری پنکھا ہاتھ میں لے کر پاس ہی بیٹھ گئی اور پنکھا جھلنے لگی. اتفاق سے بھٹیاری کی ریح صادر ہوئی. اس نے اپنی خفت اتارنے کو لڑکے کو ایک چپت مارا. کہ ڈور موتے یہ کیا کرتا ہے. سپاہی سمجھ گیا. تو اس نے قصداً ریح صادر کر کے لڑکے کے ایک چپت رسید کیا اور کہا سسرے کرے گا کوئی مگر پٹے گا تو ہی.

بس یہی حال آج علماء کا ہے. کہ سارا الزام انہی کو دیا جاتا ہے. کہ سلطنت اسلام کا زوال بھی انہی کی غفلت سے ہے اور فتنہ ارتداد بھی انہی کی غفلت سے ہے. آگے کو یہ کرنا کہ بس کسی کو دست آئیں تو اس میں بھی علماء کا قصور نکال دینا اور کبھی کو دق ہو تو اس میں بھی علماء کی خطا کہہ دینا. کسی جگہ طاعون و ہیضہ ہو تو اس میں بھی علماء ہی کی خطا تبلا دینا. کیا یہی انصاف ہے. مجھے اس سے انکار نہیں کہ علماء نے بھی اس معاملہ میں کوتاہی کی ہے. مگر میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا. کہ سارا الزام انہی کو دیا جائے اور سارا قصور انہی کا تبلایا جائے آخر آپ کے ذمہ بھی کچھ تھا یا نہیں.

عوام کی ذمہ داری

میں تبلا چکا ہوں. کہ تبلیغ صرف مولویوں کے ذمہ نہیں. بلکہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے. البتہ تبلیغ عام بطریق وعظ کے علماء کے ساتھ خاص ہے. باقی تبلیغ خاص انفرادی طور پہ ہر شخص کے ذمہ ہے اور تبلیغ عام جو علماء کے ساتھ خاص ہے تو اس میں بھی عام مسلمانوں کے ذمہ یہ کام ہے. کہ وہ علماء کے لیے اس کے اسباب مہیا کریں مثلاً چندہ کر کے سفر خرچ ان کو دیا جائے. تاکہ جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں جائیں اور سفر خرچ لے کر کرایہ ریل وغیرہ سے بے فکر ہو جائیں. کیوں کہ علماء کے پاس تبلیغ کے لیئے زبان تو ہے. مگر کرایہ وغیرہ کے لیئے روپیہ تو نہیں ہے اور ان کے ذمہ یہ کام بھی نہیں ہے کہ وہ

آپ سے بھیک مانگتے پھریں۔ کہ ہم کو روپیہ دو تاکہ تبلیغ کے لیے سفر کریں یہ کام عام مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے۔ کہ وہ خود چندہ جمع کر کے علماء کو آگے کریں اور ان سے عرض کریں کہ یہ روپیہ ہے اور یہ کام ہے۔ جس طرح آپ کہیں۔ اس کام کو شروع کیا جائے۔

مگر آج کل عوام کی یہ حالت ہے۔ کہ علماء کو اول تو آگے کرتے نہیں اور اگر آگے کریں گے بھی۔ تو اس طرح جیسے بیل پہلوان کا امام ہوتا ہے۔ کہ آگے تو وہ رہے۔ مگر پہلوان کے اشارے پر چلتا رہے۔ یوں آج کل علماء کو امام بنایا جاتا ہے۔ کہ جھنڈا لے کر آگے تو وہ رہیں۔ مگر کن آنکھوں سے وہ مقتدیوں کے اشارہ کو دیکھتے رہیں۔ کہ اُن کی مرضی کیا ہے۔ جیسے امام نماز میں جب کبھی بولتا ہے۔ تو مقتدیوں کو تکتا ہے۔ آج کل علماء سے دو باتوں کی درخواست کی جاتی ہے۔ ایک پالیسی کی دوسری پالیسی کی۔ ایک انگریزی کی پالیسی ہے۔ ایک فارسی کی یعنی پائوں جاٹنا کہ علماء اس زمانہ کی رفتار کے موافق سیاسی امور میں بھی دخل دیں اور لیڈروں کی خوشامدیں بھی کرتے رہیں۔ اُن کی رائے کا اتباع کرتے رہیں۔ کہ جہاں ان کی زبان سے کوئی بات نکلے۔ علماء فوراً ہدایہ وغیرہ سے اس کا فتوے نکال دیں اور جب اُن کی رائے بدلے تو ہدایہ ہی سے پھر اس کے خلاف کا بھی فتوے نکال دیں۔

علماء حقّانی کا مذاق

سو یاد رکھو! جو عالم حقانی ہوگا۔ وہ دین کے معاملہ میں کسی کی رعایت ہرگز نہ کرے گا۔ نہ کسی کی موافقت و مخالفت کی پرواہ کرے گا۔ اُن کا مذاق تو یہ ہے۔ ؎

ترکت اللات والعزی جمیعا
کذلک یفعل الرجل البصیر

وہ خدا کی رضا کے سامنے تمام دنیا پر لات مارتے ہیں۔ اگر سارا عالم بھی ان کے خلاف ہو جائے۔ تب بھی وہ سرِ مو شریعت سے تجاوز نہ کریں گے۔ چاہے اس میں اُن کی عزت ہو یا ذلت ہو۔ اُن کا تو حال یہ ہے۔ ؎

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

اُن کا مقصود محض رضائے حق ہے اور کچھ نہیں۔ ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

اتّباعِ علماء

صاحبو! اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو علماء کا اتباع کرو۔ ان کو متبوع بناؤ۔ تابع نہ بناؤ۔ اس کا مضائقہ نہیں کہ ان میں انتخاب کرلو۔ جو نا قابل ہوں اُن کا اتباع نہ کرو اور جو قابل ہوں اُن کو مقتدار بناؤ۔ کیوں کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے آدمی عالم نہیں ہو جاتا بلکہ علم دوسری چیز کا نام ہے جیسے طب کی کتابیں پڑھ لینے سے ہر شخص طبیب نہیں بن جاتا۔ بلکہ جس کو ملکۂ علاج حاصل ہو جائے۔ وہی طبیب ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو حدیث و قرآن اور فقہ کی کتابیں پڑھ لینے سے علم کی حقیقت حاصل نہیں ہوتی محض الفاظ یاد ہو جاتے ہیں۔ حقیقتِ علم حاصل ہونے کے لئے کتابوں کے سوا ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ جس کو اس زمانہ کا ایک شاعر خوب کہہ گیا ہے۔ ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

یعنی صحبت اہل اللہ کی بھی ضرورت ہے اور اس سے آج کل اکثر

علماء کو رہے ہیں۔ الا ماشاء اللہ اس طرف توجہ ہی نہیں۔ اسی واسطے حقیقی علم والے بہت تھوڑے ہیں۔

رہا دنیا داروں کا یہ خیال کہ علماء کو دنیا کی خبر نہیں۔ اس کو ہم زیادہ جانتے ہیں۔ اسی لیے علماء کو دنیوی معاملات و سیاسیات میں ہمارا اتباع کرنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ ان معاملات میں علماء کس جزو کو نہیں جانتے۔ آیا اس جزو کو نہیں جانتے جو محض دنیا ہے۔ یعنی واقعات تو یہ انکے واسطے فخر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

تا بدانی ہر کہ ایزداں بخواند
از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

اور اگر یہ کہو کہ ان معاملات میں جو جزو دین کا ہے۔ یعنی ان واقعات کے احکام علماء اس کو بھی نہیں جانتے۔ تو یہ بالکل غلط ہے۔ وہ دین کو تم سے زیادہ جانتے ہیں اور اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ وائسرائے کپڑا بُننا نہیں جانتے۔ تو یہ کوئی نقص نہیں۔ بلکہ ان کے واسطے فخر ہے۔ کیونکہ وائسرائے کا یہ کام نہیں۔ کہ وہ کپڑا بُنا اور جوتا سینا بھی جانتا ہو۔ ہاں احکام و قوانین ہر پیشہ کے وہ جانتا ہے۔ کہ جلاہوں کو کس قسم کا کپڑا بُننا قانون سے جائز ہے اور کس قسم کا نہیں اور موچیوں کو کیسا جوتا بنانا جائز ہے۔ اور کیسا نہیں اور ان کی آمدنی پر ٹیکس ہو گا یا نہیں۔ یوں ہی علماء کو دنیا کے کام کرنا تو نہیں آتے۔ لیکن احکام ہر کام کے معلوم ہیں۔ تم اپنے معاملات کو ان کے سامنے پیش کرو۔ پھر دیکھو وہ فتوے دیتے ہیں یا نہیں۔ پس جب علماء احکام کے جاننے والے ہیں اور بے غرض ہیں۔ اُن کو مقتدا بناؤ۔ ان کو تابع نہ بناؤ۔ تبلیغ کے کام میں ان کو آگے کرو اور تم ساتھ ساتھ رہو۔ اور ان کے مشورہ سے ہر کام کرو۔ پھر کبھی تو وہ خود آگے ہو جائیں گے اور کبھی خود نہ جائیں گے۔ بلکہ تم کو بھیجیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تو غزوہ میں خود تشریف

لے جاتے ہیں اور کبھی ایک شخص کو سردار بنا کر چند صحابہؓ کو بھیجتے تھے۔ یہ نظیر ہے کام کرنے کی۔ یہ ضرور نہیں۔ کہ ہر جگہ علماء خود ہی جائیں۔ جیسا کہ عوام نے سمجھ رکھا ہے۔ کہ علماء کے ذمہ ہے۔ کہ وہ تمام ملک کا اور تمام دیہات کا دورہ کریں سو یاد رکھو اس طرح کام نہیں ہو سکتا۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ۔

یعنی جہاد کے لیئے سب مسلمانوں کو نہیں جانا چاہیئے۔ بلکہ ایک جماعت جائے۔ تاکہ باقی لوگ دین کا علم حاصل کریں۔ شریعت کا حکم تو یہ ہے۔ کہ سارے آدمی ایک ہی طرف نہ جھکیں۔ بلکہ ایک بڑے فرقہ میں سے چھوٹی سی جماعت اس کام کے لیئے جائے۔ باقی لوگ فقہ دین حاصل کریں۔ شریعت تو فقہ دین کو اصل بتاتی اور دوسرے کاموں کو اس کی فرع قرار دیتی ہے مگر آج کل ہندوستان میں ایک ہوا چلی تھی۔ جس میں ہر تقریر میں یہ کہا جاتا تھا۔ کہ مدرسوں کو آگ لگا دو۔ خانقاہوں کو بند کر دو اور سب کے سب اس تحریک میں شریک ہو کر کام کرو۔ نا معلوم ان کے پاس بجز رائے محض کے اس پہ کیا دلیل تھی۔

تبلیغ میں غلو کی ممانعت

اور یہ رائے تو شریعت اور عقل و تمدن دونوں کے خلاف ہے شریعت کے خلاف تو اس لیئے ہے۔ کہ آیتِ قرآنیہ میں سب کے جانے کی ممانعت صریح مذکور ہے اور عقل و تمدن کے خلاف اس لیئے ہے۔ کہ اہل تمدن کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ جب کوئی مہم کام درپیش ہوتا ہے۔ تو ریل ڈاک اور عدالت دیوانی وغیرہ سب محکمے برابر چلتے رہتے ہیں اور ایک

خاص جماعت امر مہم میں لگی رہتی ہے۔ بلکہ اُن کا اصول تو یہ ہے۔ کہ جو جماعت امر مہم کو سرانجام دینے والی ہے۔ اس کے سوا دوسرے محکموں کے ملازموں کو اس مہم کی خبر بھی نہیں کرتے۔ کہ اس میں حکومت کو کامیابی ہو رہی ہے۔ یا ناکامی۔ تاکہ دوسرے محکموں کے ملازم بے فکر ہو کر اپنے کام میں لگے رہیں اور خبر ہونے سے اُن کے قلوب پریشان ہوں گے۔ تو کچھ کام نہ ہو سکے گا۔ غرض ایک کام کے لیئے سب کاموں کو کوئی بند نہیں کرتا۔ اور یہی طریقہ ہے کام کا۔ اس کے خلاف صورت میں کام ہو نہیں سکتا۔

یاد رکھو! محکمہ تعلیم اور محکمہ مال تمام کاموں کی جڑ ہے۔ اگر محکمہ تعلیم نہ رہا۔ تو آئندہ کام کرنے والے کیوں کر پیدا ہوں گے اور محکمہ مال نہ رہا تو چندہ کون دے گا۔ پس یہ کیسی حماقت تھی۔ ان لوگوں کی جو مدرسوں اور خانقاہوں کو ایک ذراسے کام کے واسطے بند کرنا چاہتے اور سب مسلمانوں کو اسی میں لگانا چاہتے تھے۔ افسوس! یہ لوگ اپنے کو سیاست دان سمجھتے ہیں۔ مگر واللہ ان کو سیاست کی ہوا بھی نہیں لگی۔

صاحبو! سیاست کو بھی وہی لوگ زیادہ جانتے ہیں۔ جن کو تم دنیا سے بے خبر اور تاریک خیال کہتے ہو۔ کیونکہ وہ شریعت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں اور شریعت نے سیاست کے اصول سب سے بہتر بتلائے ہیں پس تبلیغ میں بھی یہ صورت نہ ہونا چاہیئے۔ کہ علماء سب کے سب آگرہ ہی میں جا گریں۔ بلکہ اصول سے کام کرنا چاہیئے۔ میں نے بتلا دیا ہے۔ کہ تبلیغ کے مختلف شعبے ہیں، خطاب عام و خطاب خاص۔ اور خطاب بالمنصوص اور خطاب بغیر المنصوص۔ پس خطاب عام اور خطاب بغیر المنصوص تو علماء ہی کریں اور خطاب خاص بالمنصوص کے ساتھ ہر مسلمان تبلیغ کا کام کر سکتا ہے اور اسی لیئے تبلیغ کا امر سب کو دیا گیا ہے۔

اب مسلمانوں میں دو جماعتیں ہیں۔ ایک علماء کی، ایک عوام کی اور دونوں

ہیں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک فارغ البال، دوسرے مشغول پس جو علماء اور عوام فارغ ہوں۔ وہ تو اپنے کو اسی کام کے لیے وقف کر دیں۔ اور جو لوگ مشغول ہیں وہ اپنی فرصت اور تعطیل کے زمانہ میں کبھی کبھی دیہات کا دورہ کر لیا کریں۔ اور اُمراء بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ ہو لیا کریں۔ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔ کفار کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ اس کام میں اُمراء و غریب سب شریک ہیں۔ اس کا ان پر رُعب ہوگا۔

تدبیرِ تبلیغ

مگر یہ نہ کیا جائے۔ کہ سارے ایک ہی طرف ڈھل جایا کریں جیسا آجکل ہو رہا ہے۔ کہ جو اُٹھتا ہے آگرہ ہی جا پہنچتا ہے۔ بلکہ تدبیر یہ ہے۔ کہ ہر ضلع میں ایک مجلس تبلیغ قائم کر دی جائے۔ جس کا نام وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج کل انجمن کے قوانین اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹر سیاہ کیئے جاتے ہیں۔ مگر کام نہیں ہوتا۔ ہم کو کام کرنا چاہیئے۔ جتنا جس سے ہو سکے بڑے پیمانہ کی بھی فکر نہ کرو چھوٹے ہی پیمانہ پہ کام شروع کر دو۔ ہماری حالت یہ ہے۔ کہ یا تو کام کرتے ہیں ٹیپ ٹاپ سے۔ ورنہ کچھ نہیں کرتے۔ وہی مثل ہے "کھاؤں تو گھی سے ورنہ جاؤں جی سے"۔ یہ بڑی غلطی اور حماقت ہے۔

یاد رکھو! ابتداء ہر کام کی کمزور اور معمولی ہوتی ہے۔ ترقی تدریجاً ہی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس عالم میں اپنے افعال کو بھی تدریجاً ہی ظاہر کیا ہے کہ اول نطفہ قرار پاتا ہے۔ پھر نو ماہ بعد بچہ پیدا ہوتا۔ پھر رفتہ رفتہ نشوونما ہو کر پندرہ برس میں لڑکا بالغ ہوتا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ قادر ہیں۔ کہ ایک ہی منٹ میں سب کچھ کر دیں۔ جیسا کہ جنت میں ہوگا۔ کہ جس شخص کو وہاں اولاد کی تمنا ہوگی۔ تو بیوی کے پاس جاتے ہی حمل قرار پا کر فوراً بچہ پیدا ہوگا اور اسی وقت باپ کے برابر ہو

ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ کا اس عالم میں نمونہ نہ ظاہر نہ کرنا اور تدریجاً افعال کرنا ہماری تعلیم ہی کے لیے تو ہے۔ کہ تم دنیا میں ابتدائے عمل کے ساتھ ہی ترقی و عروج کے طالب نہ بنو۔ بلکہ چھوٹے پیمانہ ہی پر کام شروع کردو اور اس میں لگے رہو۔ رفتہ رفتہ ایک دن عروج و کمال بھی حاصل ہو جائے گا۔ تم سے جتنا کام ہو سکتا ہے اُتنا ہی کرنے لگو۔ تم اسی کے مکلف ہو۔ اُس سے زیادہ کے مکلف نہیں۔ حق تعالیٰ اسی میں برکت دے دیں گے۔ انجمن کا نام کرنے اور عہدہ داروں کے مقرر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اشتہاروں اور اخباروں میں چھاپنے سے کچھ ہوتا ہے۔ فائدہ کام کرنے سے ہوتا ہے۔ چاہیے تھوڑا ہی ہو۔ تو دو چار آدمی ہی مل کر تبلیغ شروع کردو اور اپنی قلت پر نظر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ذات پاک کے ذریعہ سے اسلام کو عرب سے تمام دنیا میں پہنچایا ہے۔ سو وہ خدا اب بھی موجود ہے۔ تم اسی پر بھروسہ کر کے کام شروع کرو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہؓ کی مثال قرآن میں یوں بیان فرمائی ہے:۔

كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔

کہ ان کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک بیج زمین میں بویا جائے۔ تو وہ اوّل اپنی سوئی کو نکالتا ہے۔ پھر خدا اس کو پانی ہوا اور مٹی وغیرہ سے قوت دیتا ہے تو قوی مضبوط ہو کر تناور سید ھا درخت ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے دیکھا ہو گا۔ کہ ایک ذرا سے بیج سے کتنا بڑا درخت پھیلتا ہے۔ جو سارے محلہ پر سایہ فگن ہوتا ہے۔

جب جمادات میں ادنیٰ تخم کی یہ حالت ہے۔ تو انسانوں میں ایک دو آدمی اللہ کے بھروسہ پر کام کریں اور ان کے کام کو قوت و ترقی حاصل ہو جائے۔ تو کیا بعید ہے۔ مگر آج کل مشکل یہ ہے۔ کہ کام تو شروع نہیں ہوتا اور

پہلے ہی سے یہ لیڈری دوڑتی ہے۔ کہ اس تجویز کو اخباروں میں شائع کرادیں اشتہار چھپوادیں۔

صاحبو! کیا یہ ریا نہیں اور کیا ریا وغیرہ سے ممانعت نہیں اور وہ ممانعت کس کے لیئے ہے؟ کیا یہ احکام کفار کے واسطے ہیں؟ بلکہ مسلمانوں ہی کو ریا وغیرہ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ کفار مخاطب بالفروع نہیں ہیں۔

بعضے اس پر یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ ہم اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے اظہار اس لیئے کرتے ہیں۔ کہ دوسروں کو بھی اس سے ترغیب ہوگی بس میاں بس رہنے دو۔ یہ تو تاویل ہی تاویل ہے۔ ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھو تو معلوم ہوگا۔ کہ بجز شہرت اور نام کے کچھ مقصود نہیں اور اگر کسی کی واقعی غرض ترغیب ہی کی ہو۔ جب بھی اس کو چاہیئے۔ کہ اس اشاعت و اشتہار کے متعلق اول کسی عالم محقق بے غرض سے مشورہ کرلے۔

حکیم الامت کا طریق تبلیغ

میں نے اپنے یہاں سے دو مبلغ بھیجے ہیں۔ مگر صورت یہ ہے۔ کہ نہ تو کسی اخبار میں ان کا نام شائع ہوا، نہ کسی انجمن میں۔ بس وہ بے چارے خود ہی کام کر رہے ہیں اور میں نے اُن کو بھیجتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا تھا۔ کہ بھائی! میں تم سے حساب نہ لوں گا۔ اگر مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا۔ تو میں تم کو اتنا بڑا کام دین کا کبھی سپرد نہ کرتا اور جب میں نے تم کو اس کام کے لائق سمجھا ہے تو اب تم سے چار پیسوں کا حساب لینا بے کار سمجھتا ہوں۔ مگر اُن کی لیاقت یہ ہے کہ وہ پائی پائی پیسہ پیسہ کا حساب بھیجتے ہیں۔

کام کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ کہ جس کو قابل سمجھ کر کام سپرد کیا جائے۔ اس سے حساب[لہ] نہ لیا جائے اور اگر اس پر اتنا اطمینان نہ ہو اور حساب لینے کی

لہ اور حدیث میں جو مصدق سے حساب لینا وارد ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ضرورت محسوس ہو تو ایسے شخص کو کام ہی دینا نہ چاہیئے اور کام کرنے والے کی قابلیت یہ ہے۔ کہ وہ باوجود دوسرے کے اطمینان کے برابر حساب سمجھتا رہے۔ اس سے اُس کے اطمینان میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

خیر میں نے ان دونوں میں سے کسی کو امیر و مامور بھی نہیں بنایا۔ گو اس میں بڑی مصلحت ہے۔ کہ دونوں میں ایک امیر ہو ایک مامور ہو۔ مگر اس کے لیئے سلامت طبائع شرط ہے اور آج کل طبائع ایسی گندی ہیں۔ کہ جہاں ایک کو امیر بنایا۔ فوراً دوسرا اسیر ہو جاتا ہے۔ یعنی امیر صاحب اس پر بیجا و بے جا حکومت کرتے ہیں اور مامور کو بھی اس کی امارت ناگوار ہوتی ہے۔ دوست بن کر تو آج کل دوسرے کا کہنا مان لیتے ہیں۔ مگر محکوم بن کر کہنا نہیں مانتے۔

اور گو مجھے اپنے مبلغوں کے ساتھ یہ بدگمانی نہ تھی۔ مگر عام طبائع کا حال دیکھ کر میں نے اس سے احتراز کیا۔ کہ اپنی طرف سے ایسی صورت کیوں کر اختیار کروں جس میں اس زمانہ کی حالت کے اعتبار سے خطرہ کا احتمال ہے۔ تو میں نے اُن سے کہہ دیا ہے۔ کہ جب تک تم دونوں میں اتفاق رہے اس وقت تک اتفاق سے مل کر کام کرو اور جب کچھ نزاع ہو۔ تو اسی وقت سرمایہ کو بانٹ کر آدھا ہر شخص لے لے۔ پھر جس کا جی چاہے مشرق کو چلا جائے اور جس کا جی چاہے۔ مغرب کو چلا جائے۔ دونوں الگ

(بقیہ) وہ اس لیئے ہے۔ کہ وہ رقم بذریعہ حکومت وصول ہوتی ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ دینے والے مصدق پر مطمئن نہ ہوں۔ اس لیئے حاکم کو حساب لینا چاہیئے بخلاف چندہ کے کہ وہ دینے والے بطیب خاطر جس کو دیں گے اس پر مطمئن ہیں۔ پھر اس نے جن کو دیا وہ اس پر مطمئن ہے۔ اس لیئے مصدق سے حساب لینے پر اس کو قیاس نہیں کر سکتے۔ ۱۲ منہ

الگ کام کرو۔

تبلیغ میں اعتدال

صاحبو! میں کیا کہوں۔ کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے۔ اپنے ہی گھر کا راز کھلتا ہے۔ آج کل ہماری حالت یہ ہے۔ کہ اجتماعی کام میں ہمیشہ گڑبڑ ہوتی ہے جس کام میں جتنا زیادہ اجتماع ہو گا۔ اتنا ہی جھگڑا ہو گا۔ ہم لوگوں نے اپنی حالت سے دوسروں کو دکھلا دیا ہے۔ کہ ہم میں اجتماع کے ساتھ کام کرنے کی بالکل قابلیت نہیں۔ کیوں کہ رات دن کا مشاہدہ ہے۔ کہ جس کام میں جتنا زیادہ ہنگامہ ہوتا ہے۔ جو لوازم اجتماع سے ہے۔ وہ جلدی ہی ختم بھی ہو جاتا ہے بقا اسی کام کو ہوتا ہے جو تدریج کے ساتھ بڑھے اور اعتدال کے ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ جو لوازم انفراد سے ہے۔ ورنہ وہی حالت ہوتی ہے۔ کہ جیسے بازی گر شعبدہ سے آم کا درخت لگاتے ہیں۔ کہ وہ ذرا سی دیر میں پیدا بھی ہو جاتا ہے اور فوراً ہی پھل بھی لے آتا ہے اور جلدی ہی فنا بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ ابتداء ہی سے بڑی لمبی چوڑی تجویزیں کرتے اور انجمن اور عہدہ دار مقرر کرتے اور جلسہ کرتے ہیں۔ ان سے کام کچھ نہیں ہوتا۔ چار دن کے بعد سب باتیں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ جب تم کسی کو ایسی حالت میں دیکھو۔ کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا ہو کہ بہت کام کرتا ہے۔ اس کو شمار میں نہ لاؤ اور جس کو اعتدال سے کام کرتا ہوا دیکھو۔ فارجوہ اس سے امید رکھو۔ کہ انشاء اللہ یہ کامیاب ہو گا۔

شریعت کی تعلیم تو یہ ہے۔ مگر آج کل کچھ مذاق ایسا بدلا ہے۔ کہ اظہار و اشتہار و ٹیپ ٹاپ کے بغیر کام کرنا ہی نہیں جانتے۔ یاد رکھو جوش سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ ہوش سے کام چلتا ہے۔ پس جوش اور ہنگامہ کی ضرورت

نہیں۔ ہوش سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا وہی طریقہ ہے۔ کہ جس سے جتنا ہو سکے بس اللہ کا نام لے کر شروع کر دے۔ نہ انجمن کی ضرورت ہے، نہ سیکرٹری کی۔ بس دو چار دس پانچ آدمی جتنے متفق ہو سکیں، کام شروع کر دیں اور اگر کوئی متفق نہ ہو تو تم اکیلے ہی کام شروع کر دو۔ گاؤں والوں کو کلمہ پڑھانا، نماز سکھا دینا تو ایسا کام ہے جو ہر مسلمان تھوڑی سی لیاقت کا بھی کر سکتا ہے۔

ہاں اس کی ضرورت ہے۔ کہ کسی عالم سے جو بستی میں رہتا ہو۔ مشورہ کرتے رہا کرو۔ مگر صرف اس سے پوری طرح کام چلنا دشوار ہے۔ بلکہ تبلیغ عام کی بھی ضرورت ہے۔ جو عالم ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ بعض جگہ دیہات والوں کو کفار نے شبہات میں ڈال دیا ہے۔ ان شبہات کا دور کرنا اور جواب دینا بھی ضروری ہے اور یہ کام ہر شخص کا نہیں۔ اس لیے اس کی بھی ضرورت ہے۔ کہ ہر ضلع میں ایک عالم بھی مبلغ ہو۔ علماء اس کام کے لیئے حاضر ہیں اور انشاء اللہ بہت مل جائیں گے۔ مگر ان سے کام لینے کی صورت یہ ہے۔ کہ پہلے اُن کے اہل وعیال کے نفقہ کا بندوبست کر دیا جائے۔ کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ علماء کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس وقت ہر شخص کسی نہ کسی حیلہ میں لگا ہوا ہے۔ جس میں ان کو معقول تنخواہ مل رہی ہے۔ جس سے اُن کے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ اب اُن کو اس حیلہ سے چھڑا کر تبلیغ میں جبھی لگا سکتے ہیں۔ جب کہ پہلے اُن کی تنخواہ کا انتظام ہو جائے۔ اس کی ایک سہل تدبیر یہ ہے۔ کہ ہر ضلع میں ایک امیر یا امراء یا امراء وغرباء سب مل کر ایک مبلغ کا خرچ اپنے ذمہ کر لیں۔ اس صورت میں کسی انجمن یا مرکز سے کوئی واسطہ نہ ہو گا۔ بس مبلغ اور مبلغ دو ہی سے واسطہ ہو گا۔ اگر اس کا انتظام ہو جائے۔ تو کام نہایت اطمینان سے ہوتا رہیگا اور دوامًا ہوتا رہے گا۔ ہر چند کہ ایک مرکز کا سب کو تابع ہونا بہت اچھا ہے۔ مگر آج کل دشواری تو یہی ہے۔ کہ

مرکز کس کو بنایا جائے. تجربہ یہ ہے کہ چند روز کے بعد یوں کہنا پڑتا ہے مرائے کز دمعنی گج)اس لیئے کسی مرکز یا انجمن کے تابع ہو کر کام کرنا آج کل دشوار ہے.

پس سہل صورت یہ ہے. کہ ہر ضلع کے مسلمان باہم مل کر ایک مبلغ اپنے ضلع کے واسطے مقرر کرلیں اور اس کو خود تنخواہ دیا کریں اور یہ کچھ مشکل نہیں. اگر مسلمانوں کو ضرورت کا احساس ہو جائے اور اس کی فکر سب کو ہو جائے. تو ایک مبلغ کی تنخواہ تیس چالیس روپیہ ایک ضلع کے مسلمان بہت سہولت سے دے سکتے ہیں.

البتہ اتنی ضرورت پھر بھی ہوگی. کہ روپیہ کا انتظام کر کے مبلغ کی تجویز اور راہ عمل کی تحقیق کے لیئے کسی ایک عالم کو مشورہ کے واسطے منتخب کر لو. اس کے مشورہ سے مبلغ رکھو اور اسی کی رائے سے تبلیغ کا طریقہ اختیار کرو اور مبلغ سے کہہ دو کہ جس طرح فلاں شخص کہے، اس طرح کام کرو. اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر جس عالم پر یا جس انجمن کے سیکرٹری وغیرہ پر اعتماد ہو. اس کے پاس رقم بھیج دو اور لکھ دو کہ اس رقم سے ہمارے ضلع کے واسطے کوئی آدمی تجویز کر کے بھیج دیا جائے. اس صورت میں مبلغ کی تنخواہ وغیرہ کا معاملہ اس عالم یا انجمن کے ساتھ وابستہ ہوگا.

تبلیغ اور سوال

مگر اب تو غضب یہ ہے. کہ مسلمان یوں چاہتے ہیں. کہ علماء خود ہی روپیہ جمع کریں اور خود ہی مبلغ تجویز کریں اور سب اپنے گھروں میں بے فکر بیٹھے رہیں.

جیسے اکبر نے ایک ڈوم کو انعام میں ہاتھی دیا تھا ڈوم بڑا گھبرایا کہ ہاتھی تو بادشاہ نے دے دیا. اس کے کھانے کے واسطے خوراک کہاں سے لاؤں گا. ایک دن اکبر کی سواری جو قلعہ سے نکلی. تو ڈوم نے ہاتھی کے گلے میں

ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے اپنے ہاتھی کو راستہ میں اس حلیے سے پھرتا ہوا دیکھا۔ تو مصاحبوں سے دریافت کیا۔ کہ یہ شاہی ہاتھی اس حالت سے کیوں پھر رہا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کہ حضور نے یہ ہاتھی فلاں ڈوم کو انعام میں دیا تھا۔ حکم ہوا اُس کو بلایا جائے۔ چنانچہ وہ لایا گیا اور اس سے سوال ہوا۔ کہ تم نے شاہی ہاتھی کو اس طرح کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ کہا حضور نے غلام کو ہاتھی دے دیا مگر اس کی خوراک کے لیئے کچھ عنایت نہ ہوا۔ تو میں نے اس کے گلے میں ڈھول ڈال دیا ہے۔ کہ بھائی جس طرح میں گا بجا کر کھاتا ہوں۔ تو بھی گا بجا کے اپنا پیٹ بھرے۔ اکبر ہنسا۔ اور اسی وقت اس کے راتب کا بھی انتظام کر دیا۔

تو آج کل مسلمانوں کی رائے یہ ہے۔ کہ علماء ڈوم کے ہاتھی کی طرح خود ہی گا بجا کر چندہ کریں اور خود ہی تبلیغ بھی کریں۔ تو صاحبو علماء اس طرح نہیں کر سکتے اور جو ایسا کرتے ہیں۔ اچھا نہیں کرتے۔ چندہ کرنا علماء کا کام نہیں یا ہے یہ کام دنیا والوں کا ہے اور اس کا انتظام سب مسلمانوں کے ذمہ ہے۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ کام بھی کریں اور بھیک بھی مانگیں۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ کہ جن علماء کو مقتدا سمجھتے ہو۔ انہی سے بھیک منگوانا چاہتے ہو۔ آپ کو لازم ہے۔ کہ رقم کا انتظام خود کرو اور کام کے لیئے علماء سے عرض کرو۔

میں نے اپنے مبلغین سے کہہ دیا ہے۔ کہ جب تمہارے پاس اتنی رقم رہ جائے۔ کہ اس سے اپنے گھر تک پہنچ سکو۔ اس وقت مجھے اطلاع کر دیا کرو۔ اگر اور رقم ہوگی تو بھیج دوں گا۔ ورنہ بلا لوں گا۔ کیونکہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ رقم نہ رہے۔ تو لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں کہ لاؤ روپیہ۔ ہم سے جتنا ہو سکتا ہے۔ اس کے لیئے ہم حاضر ہیں اور جس کام میں روپیہ کی ضرورت ہے اگر بدون مانگے۔ ہمارے پاس مسلمان روپیہ بھیج دیں گے۔ اس سے کام کو چلاتے رہیں گے۔ اور نہ بھیجیں گے۔ تو ہم خدا تعالیٰ سے عرض کر دیں گے۔ کہ اس کام کے لیئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں نے اعانت مالی پہ توجہ نہ کی اور ہم نے

بھیک مانگنے میں دین کی ذلت سمجھی۔ اس لیئے یہ کام نہ ہو سکا۔ ہم تو اس جواب کے بعد سبکدوش ہو جائیں گے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں سے مؤاخذہ ہو گا۔ کہ تم نے تبلیغ میں مالی اعانت کیوں نہیں کی اور اگر تم کو کسی پر اعتماد نہ تھا۔ تو تم نے رقم کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنے ضلع کے واسطے مبلغ کا انتظام کیوں نہ کیا؟

میں نے سب صورتیں آپ کو بتلا دی ہیں۔ کہ کام کی اتنی صورتیں ہیں اب جو جیا ہو اختیار کر لو۔ سو اس کے بعد آپ کو کسی عذر کا موقع نہیں ہے۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ تبلیغ کا کام کہاں کہاں ہو رہا ہے۔ اب جس کا جی چاہے گا جس پر اطمینان ہو گا اس کے پاس رقم خود بھیج دے گا۔ باقی ہم کسی سے مانگنے نہ جائیں گے۔

غرض یہ اصول ہیں کام کرنے کے۔ آپ کو اس طرح تبلیغ کرنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ تواصی بالحق جس کا دوسرا عنوان تبلیغ اسلام ہے۔ نہایت ضروری ہے۔ کہ بدون اس کے آپ خسارہ سے نہیں بچ سکتے۔ اس میں اپنی سعی کو جاری رکھو۔ ورنہ بڑا خسارہ ہو گا۔ جو تمام مسلمانوں کو محیط ہو جائے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام تواصی بالحق رکھتا ہوں۔ کیوں کہ اس میں زیادہ تر تبلیغ عقائد ہی کا بیان ہوا ہے اور حق کی تفسیر عقائد ہی سے کی گئی ہے۔ اگر کل کو پھر بیان ہوا تو اس کا نام تواصی بالصبر تجویز کرتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت تبلیغ اعمال کا ذکر اجمالی ہوا ہے۔ کل کو اس جزو کی بھی تفصیل ہو جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر ایسا ہو گیا، تو ہر بیان کے مستقل کے نام کے ساتھ مجموعہ کا نام تواصی بالدین ہو گا۔ کیونکہ دین عقائد اعمال اصول و فروع کے مجموعہ ہی کا نام ہے۔ اب دعا کیجیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحت۔ اشرف علی ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ

عمر فاروق@ون اردو

التواصی بالصبر

افسوس ہے کہ ہم لوگ اس فریضہ کو چھوڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے قلوب مخلوق کی ہیبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم کو تبلیغ سے رکاوٹ ہے ـــــ اور ہر شخص کو تبلیغ کی ہمت نہیں ہوتی، خواہ کیسی ہی قدرت ہو اور دوسرا ہمارے ماتحت ہی کیوں نہ ہو؟

از حکیم الامت حضرت تھانوی رح

"التواصی بالصبر" سے موسوم یہ وعظ ۲ شوال ۱۳۳۴ھ کی شب کو چودھری نصیرالدین صاحب کی درخواست پر مظفر نگر میں ہوا۔ جو دو گھنٹہ ۵۴ منٹ تک جاری رہا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی مستورات بھی پس پردہ تھیں۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد، فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

تمہید

یہ وہی سورت ہے جس کی تلاوت شب گذشتہ میں کی گئی تھی اور اس کے متعلق ایک جزو کا بیان کیا گیا تھا حاصل اس کا یہ تھا کہ اس سورت میں تبلیغ و دعوت الی اللہ کی ضرورت ثابت کی گئی ہے اور اس کے دو جزو ہیں۔ ایک دعوت الی الحق (بمعنی العقائد) اور ایک دعوت الی الصبر (بمعنی الاعمال)، اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہم ان دونوں میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جزو یعنی دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد کی طرف گذشتہ رات میں زیادہ روئے سخن تھا۔ گو بیان مشترک ہی ہوا تھا۔ مگر مقصود زیادہ تر یہی جزو تھا اور اسی کی تفصیل کی گئی تھی۔ اس وقت ایک جزو تفصیل سے رہ گیا تھا۔

یعنی قصداً اس کا بیان نہ ہوا تھا۔ گو ضمناً اس کا بیان بھی کسی قدر ہوا تھا۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ اگلی شب اگر خیریت رہی اور بیان کا موقعہ ملا تو دوسرے جزو کے متعلق قصداً بیان ہوگا۔ سو یہ وقت ہے اس وعدہ کے ایفاء کا۔ اس لئے اس وقت میں تبلیغ اعمال کے متعلق کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

عذر بلا اہتمامِ عمل

سُنیئے! ہماری حالت یہ ہے۔ کہ جیسا تبلیغ اعمال کا اہتمام کرنا چاہیئے ویسا ہم کو اس کا اہتمام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔ جیساکہ دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد میں کوتاہی ہو رہی ہے اور جیسا ایک امر مانع ہو رہا ہے۔ تبلیغِ عقائد اور دعوت الی الایمان سے اسی طرح ایک امر مانع ہو رہا ہے تبلیغ اعمال سے اور وہ امر یہ ہے کہ ہم کو عادت ہو گئی ہے ترکِ دعوت الی الاعمال کی اور اس کے مانع ہونے سے یہ مطلب نہ لیا جائے۔ کہ یہ عادت عذر ہے۔ کیونکہ جب میں اس کا لغو ہونا بیان کر دوں گا۔ تو اس سے عذر نہ ہونا معلوم ہو جائے گا اور اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ ترکِ دعوت الی الاعمال کے لیئے کوئی عذر فی نفسہٖ بھی نہیں۔ اگر اعذار شرعیہ موجود ہوں اور ان کا تحقق ہو جائے۔ تو اس وقت ترکِ دعوت جائز ہے۔ مگر اس وقت میں ان اعذارِ شرعیہ کو بیان نہ کروں گا، نہ بیان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی عمل کے متعلق بیان اعذار کی ضرورت جب ہو کہ ہم کو اس عمل کا اہتمام ہو اور جہاں مخاطب کو عمل ہی کا اہتمام نہ ہو۔ وہاں اعذار کو بیان نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اوّلاً اس کو اہتمامِ عمل پر متوجہ کیا جائے گا۔ جب وہ عمل کا اہتمام کرنے لگے اور عمل میں مشغول ہو جائے گا۔ پھر اس کو اعذارِ شرعیہ سے مطلع کیا جائے گا۔

جیسے ایک شخص نمازی ہے، نماز کو ضروری سمجھتا ہے، اس کی پابندی بھی کرتا ہے۔ وضو کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں بھی وضو کو ترک نہیں کرتا، وہاں ضرورت ہے اعذارِ شرعیہ بتلانے کی۔ کہ ان اعذار سے وضو ساقط ہو کر تیمم جائز ہو جاتا ہے تطہیرِ ثیاب معاف ہو کر ناپاک کپڑوں ہی سے نماز درست ہو جاتی ہے، استقبال

قبلہ معاف ہو کر جس طرح بھی نماز پڑھ سکے نماز صحیح ہے اور قیام پر قادر نہ ہو تو قعود سے اور قعود پر قدرت نہ ہو تو اضطجاع سے نماز صحیح ہو جاتی ہے۔

ایسے وقت میں بیانِ اعذار کی ضرورت کا راز یہ ہے۔ کہ اگر ایسے شخص کو اعذار نہ بتلائے جائیں۔ تو اس کو اعتقادی اور عملی تنگی پیش آوے گی۔ اعتقادی تنگی تو یہ ہوگی۔ کہ اس کو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ اور شبہ ہو گا۔ جو کہ زوال یا ضعفِ ایمان کا سبب ہے۔ اور عملی تنگی یہ پیش آئے گی۔ کہ اگر اس کو تیمم کا قاعدہ نہ بتلایا گیا۔ تو وہ عذر کے وقت مجبور ہو کر وضو ترک کرے گا اور چونکہ وضو کو شرط سمجھتا ہے۔ اس لئے بے وضو نماز پڑھے گا نہیں، یہ عملی تنگی ہے۔ پس ایسے شخص کے سلامت ایمان اور سلامتِ اعمال کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اعذارِ شرعیہ کے احکام سے مطلع کیا جائے۔ اِس سے اُس کا ایمان تو سلامت رہے گا۔ کہ اس کو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ نہ ہوگا اور عمل یُوں سلامت رہے گا کہ وہ کسی عذر کے وقت عمل کو فوت نہ کرے گا۔

غرض بیان عذر کی ضرورت وہاں ہوگی۔ جہاں مخاطب ضرورت عمل کا قائل ہو اعتقاداً بھی اور عملاً بھی، پھر اس کو کسی موقعہ پر پیش آتی ہو بخلاف اس کے جو ابھی عمل ہی کی ضرورت کا قائل نہیں، وہ تو اعذار کو سن کر ترک عمل کا بہانہ ڈھونڈیں گے اور کھینچ تان کر اپنے کو معذوروں کی فہرست میں داخل کریں گے۔ پس اگر ہم یہ دیکھتے۔ کہ ہم لوگ امر بالمعروف کا اہتمام پوری طرح کرتے ہیں۔ تو اس وقت البتہ بیان احکام اعذار کا موقع تھا اور جب اس کا اہتمام ہی نہیں۔ چنانچہ عملاً اہتمام نہ ہونا تو مشاہد ہے اور اعتقاداً بھی بعض لوگ اس کی ضرورت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے۔ جیسا کہ قرائن احوال اس

پر شاہد ہیں۔ تو ایسی حالت میں تو اعذار کو سن کر ہر شخص ترک امر بالمعروف کا بہانہ ڈھونڈے گا اور کوئی بھی اپنے کو عذر سے خالی نہ سمجھے گا اور اس فریضہ کو اپنے اوپر سے بالکل ساقط کر دے گا۔ حالانکہ ایسا کون سا عذر ہے۔ جس سے فرض بالکل ہی ساقط ہو جائے۔

دیکھو نماز و وضو کے لیئے بھی بعض عذر ہیں۔ مگر وہ ایسے وسیع نہیں۔ جن سے وضو اور نماز بالکل ہی ساقط اور معدوم ہو جاتے۔ مگر جس عمل کا اہتمام ہی قلب میں نہ ہو۔ اس کے اعذار کو سن کر مخاطب عذر کے میدان کو اتنا وسیع کر لیتا ہے۔ کہ فرض کو بالکل ہی ساقط کر دیتا ہے۔ تو ایسے شخص کو اعذار سے ہنوز مطلع نہ کیا جائے گا۔

دو حالتیں

اسی لیئے میں نے رات بھی عذر کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ یہ عرض کیا تھا۔ کہ حالتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم کام کو اپنے ذمہ ضروری سمجھیں پھر عذر سے تنگی پیش آتے اور ایک حالت یہ ہے۔ کہ کام ضروری ہی نہ سمجھیں تو جن اعمال کو ہم اپنے ذمہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جیسے نماز وضو وغیرہ۔ ان میں عمل کو شروع کرنے کے بعد عذر سے سوال ہوتا ہے اور جن کو اپنے ذمہ ضروری نہیں سمجھتے۔ ان میں قبل از عمل ہی عذر سے سوال کیا جاتا ہے۔ تو مجیب کو لازم ہے۔ کہ پہلی صورت میں تو اعذار کو بیان کرے اور دوسری صورت میں بیان نہ کرے۔ لہٰذا اسی اصل کے موافق میں اس وقت بھی اعذار کو بیان نہیں کرتا۔ بلکہ تبلیغ اعمال کی ضرورت پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں۔

تبلیغ اعمال

رات میں نے تبلیغ ایمان یعنی دعوت الی العقائد سے مانع یہ تبلایا

تھا۔ کہ اس تبلیغ میں مبلغ مخاطب کو ایسے امور سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ جو اس کے زعم میں دین اور طاعات ہیں۔ جس سے اس کو ناگواری ہوتی ہے اور اس ناگواری کے خیال سے مبلغ کھٹکتا اور تبلیغ سے رُکتا ہے۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا۔ کہ اول تو عنوان تبلیغ کا ایسا ہونا چاہیئے۔ جس سے مخاطب کو ناگواری نہ ہو اور وہ عنوان قرآن ہی نے ہم کو بتلادیا ہے کہ عقائد کو اخبارِ صادقہ کے عنوان سے بیان کرو اور جو شخص اس سے بھی ناگواری کرے تو اس کی پرواہ نہ کی جائے۔

نیز میں نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ اسی ناگواری مخاطب کی وجہ سے تبلیغ عقائد کو مقدم کیا گیا۔ اور تواصی بالعمل کو مؤخر کیا گیا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ تبلیغ اعمال فی نفسہٖ مہتم بالشان نہیں۔ کیونکہ اگر یہاں ایک وجہ اثنائی قلت اہتمام کو مقتضی ہے۔ تو دوسری وجہ شدت اہتمام کو بھی مقتضی ہے۔ وہ یہ کہ بلاغت کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ کلام کو جس بات پر ختم کیا جاتا ہے وہ مہتم بالشان اور زیادہ مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ اہل بلاغت اس کو خوب جانتے ہیں۔ اسی لیئے بلغاء کا قاعدہ ہے۔ کہ وہ کلام کو اول و آخر میں زوردار کرتے ہیں۔ کیونکہ ابتداء بھی مقصود کی جاتی ہے اور انتہا بھی مقصود ہوتی ہے۔ تو اب یہاں دو جزو ہیں۔ جن میں ایک جزو کا اہتمام تقدیم سے ظاہر کیا گیا۔ دوسرے جزو کا اہتمام ختم کلام پر واقع کرنے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس چیز پر کلام ختم کیا جاتا ہے۔ وہ مخاطب کے ذہن میں باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیئے ختم کلام پر مقصود اہم ہی کو بیان کیا جاتا ہے۔ پس قرآن کی عجیب بلاغت ہے۔ کہ اس نے دونوں اجزاء کا مہتم بالشان ہونا دو طرز سے ظاہر کر دیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ دو چیزوں کا ایک درجہ میں مہتم بالشان ہونا تو بعید ہے تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ہم دونوں کو ایک درجہ میں مہتم بالشان نہیں کہتے

بلکہ تبلیغ عقائد کی اہمیت اس لیئے ہے۔ کہ وہ اصل ہیں۔ اسی لئے ان کی اہمیت کو تقدیم سے ظاہر کیا گیا۔ (فان الاصل مقدم علی الفرع)

اہمیّتِ اعمال

اور اعمال کی اہمیت ایک اعتبار خاص سے ہے۔ وہ اعتبار خاص یہ ہے۔ اور یہ حقیقت میں وجہ اول ہی سے ناشئے ہے۔ کہ جو لوگ عقائد کو اصل سمجھ کر مہتم بالشان سمجھتے ہیں۔ وہ اعمال کو فرع سمجھ کر ان کا اہتمام بالکل ترک کر دیتے ہیں اور اتنا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ جتنا فرع کا ہونا چاہیئے۔ بس یہ لوگ عقائد ہی کو ضروری سمجھتے ہیں، اعمال کو ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ تعریف میں کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص کے عقائد بہت اچھے ہیں، اس تعریف کو کافی سمجھتے ہیں اور صحت عقائد کے بعد اس کے اعمال پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اسی لیئے اعمال کے متعلق امر بالمعروف اور اور نہی عن المنکر بھی نہیں کرتے۔ بلکہ غضب یہ ہے کہ اعمال کی کوتاہی کو منکر بھی نہیں سمجھتے ہم نے مانا۔ کہ عقائد کا اچھا ہونا بڑی بات ہے۔ اور یہ بھی سمجھاتے خود قابل مدح ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ اعمال کو غیر ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور ان میں کوتاہی کرنے کو نقص کیوں نہیں سمجھا جاتا؟

اگر آپ کہیں کہ اعمال فرع ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کیا فرع کے نقص سے شئے میں نقص نہیں آتا۔ دیکھئے آپ ایک درخت امرود کا لگائیں۔ جس کا بیج الٰہ آباد سے عمدہ امرودوں کا بڑے اہتمام سے انتخاب کر کے منگایا گیا تھا۔ مگر آپ کے باغ میں آ کر اس عمدہ بیج سے درخت تو بہت بڑا لگ گیا۔ لیکن پھل ایک بھی نہ آیا۔ تو کیا اس صورت میں آپ اپنے دوستوں کے سامنے خوش ہو ہو کر اس درخت کی یوں تعریف کریں گے۔ کہ یہ بڑا قیمتی

درخت ہے۔ اس کا بیج بہت عمدہ الہ آباد کے نفیس امرودوں میں سے ہے یا افسوس کے ساتھ یوں کہیں گے۔ کہ اس کا بیج بڑے اہتمام سے منگایا گیا تھا۔ مگر افسوس اس نے پھل نہیں دیا اور اگر اتفاق سے پھل بھی آیا۔ مگر الہ آباد جیسا شیریں نہ ہوا۔ بلکہ معمولی امرودوں سے بھی بدتر نکلا۔ تو اس صورت میں ہرگز آپ بیج کی تعریف کر کے اپنا جی خوش نہ کریں گے۔ بلکہ سخت رنج و افسوس کے ساتھ یہ کہیں گے۔ کہ بڑی مشقت سے میں نے اس کے لیے الہ آباد سے عمدہ بیج منگایا تھا۔ مگر ساری محنت ضائع گئی۔ پھل بالکل خراب نکلا۔

میرا مقصود اس مثال سے یہ ہے۔ کہ آپ دنیوی امور میں محض اصل کی عمدگی کو مدح کے لیے کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کے ساتھ فرع کی عمدگی پر بھی نظر ہوتی ہے۔ پھر دین کے معاملہ میں کیا وجہ ہے۔ کہ صرف عقائد (اصول) کی عمدگی پر نظر کی جاتی ہے اور اسی کو مدح کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ اعمال (و فروع)، کی عمدگی پر کیوں نظر نہیں کی جاتی؟ اور اس کے نقص سے افسوس کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور اس افسوس کا اثر آپ میں کیوں ظاہر نہیں ہوتا؟

دیکھئے اگر ایک شخص کا چہرہ حسین ہے۔ مگر ہاتھ پیر بھدے ہیں یا انگلیاں مڑی ہوئی ہیں۔ تو ہر چند کہ حسن میں چہرہ ہی کا حسن اصل ہے۔ مگر یہ نہیں کہ ہاتھ پیر کا اعتدال مطلوب نہ ہو۔ گو اس سے آپ کو اتنی نفرت نہ ہوگی۔ جتنی اس شخص سے ہوتی ہے۔ جس کا چہرہ بھی بد شکل ہے۔ مگر ظاہر ہے۔ کہ جس شخص کے ہاتھ پیر اور انگلیاں بھی حسین ہوں اور چہرہ بھی حسین ہو۔ اس کی طرف زیادہ میلان ہوگا۔ اور پہلے شخص کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے جب آپ یہ کہیں گے۔ کہ چہرہ، آنکھ، ناک بڑی خوبصورت ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہیں گے۔ کہ مگر افسوس اس کا ہے۔ کہ اس کی انگلیاں مڑی ہوئی ہیں۔ اگر یہ نقص نہ ہوتا تو بہت ہی حسین ہوتا۔ اب بتلائیے کہ اسی طرح حسن دین

میں فسادِ فروع یعنی فسادِ اعمال کو آپ منکر کیوں نہیں سمجھتے اور ایسے شخص سے آپ کا دل کیوں کڑھتا ہے۔ جو فروعِ ایمان میں ناقص ہے۔ اس سے بلا تکلف دوستی کس طرح کی جاتی ہے؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فمن لم یستطع فبلسانہ فمن لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان (او کما قال)

کہ جو کوئی تم میں سے امرِ منکر کو دیکھے، تو اس کو ہاتھ سے مٹائے، یا زبان سے یا دل سے۔ یہ مقتضا ہے امرِ منکر کا شرعاً۔ پھر یہ کیا غضب ہے۔ کہ ہم لوگ امرِ منکر کو دیکھ کر نہ ہاتھ سے روکتے ہیں، نہ زبان سے، نہ دل سے نفرت کی جاتی ہے۔ بلکہ اعمال میں کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ وہی بشاشت ہے، وہی دوستی ہے۔ جیسے کامل الایمان کے ساتھ ہوتی ہے۔ گویا آپ خدا تعالیٰ کی طرف سے وکیل و مختار ہیں۔ کہ جس چیز کو چاہیں معاف کر دیں، اور جس منکر سے چاہیں قطع نظر کر لیں۔ تو بات یہ ہے۔ کہ لوگوں نے عقائد کی اہمیت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ اہمیتِ عقائد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد اصلاحِ اعمال کی ضرورت ہی نہیں اور یہ بالکل غلط ہے۔ اس لیئے اس اعتبارِ خاص سے اعمال زیادہ مہتم بالشان ہو گئے۔ اس واسطے یہاں کلام کو تواصی بالاعمال کے ذکر پر ختم کیا گیا تاکہ اس طرزِ خاص سے مخاطب کو معلوم ہو جائے۔ کہ گو اعمال عقائد سے ذکر میں مؤخر ہیں۔ مگر ختمِ کلام پر مذکور ہونے سے ان کی اہمیت بھی مطلوب ہے اور وہ بھی مہتم بالشان ہیں۔ سو یہ اتنی تو ضروری چیز، مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال کی طرف سے ہم بہت بے فکر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عقائد اصل ہیں اور اعمال فروع۔ مگر میں بتلا چکا ہوں۔ کہ فروع بھی مطلوب ہوتے ہیں اور ان کے انعدام یا نقصان سے اصل میں بھی نقصان آ جاتا

ہے۔ جیسا کہ اوپر مثالوں میں واضح کیا گیا۔

تعلیم عقائد اور اعمال

دوسرے نصوص قرآنیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عقائد کی تعلیم سے تکمیل اعمال بھی مقصود ہے۔ یعنی عقائد کی تعلیم اس لیئے بھی کی گئی ہے۔ کہ ان سے اعمال میں کام لیا جائے۔ اس کی دلیل حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے:۔

مَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ

ترجمہ:۔ تم کو جو کچھ بھی مصیبت ارضی یا سماوی پہنچتی ہے۔ وہ سب مقدر ہو چکی ہے۔ قبل ازیں کہ مصیبت کو پیدا کریں (اور چونکہ خدا تعالیٰ کا علم کامل ہے اس لیئے) بے شک یہ بات خدا کے لیئے آسان ہے (کہ وہ ظہور سے پہلے مصائب وغیرہ کو مقدر کر دیں) اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ۔

(یہ مضمون تم کو اس لیئے تبلایا گیا) تاکہ تم کسی فوت شدہ چیز پر غم نہ کرو اور حاصل شدہ پر اتراؤ نہیں۔ یہ تعلیل ہے ما سبق کی۔ جس کا تعلق اخبار کہ بذٰلک مقدر سے ہے۔ یعنی ہم نے تم کو اس مسئلہ کی تعلیم اس لیئے کی۔ تاکہ تم مغموم نہ ہو اور اتراؤ نہیں۔ اب غور کے قابل یہ امر ہے۔ کہ لام کے غایت کے واسطے لایا جاتا ہے اور اوپر مسئلہ تقدیر کا ذکر ہے۔ تو اس کی علت وغایت دوسری آیت میں تبلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ کہ ہم نے تم کو مسئلہ تقدیر اس لیئے تعلیم کیا ہے۔ کہ جب تم اس کے معتقد ہو گے۔ تو تم کو حزن وفرح نہ ہو گا اور مسئلہ تقدیر کا یہ اثر مشاہد ہے۔ جو لوگ

تقدیر کے معتقد ہیں۔ وہ مصائب و حوادث میں منکرین تقدیر سے زیادہ مستقل اور ثابت قدم رہتے ہیں۔ تو اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ مسئلہ تقدیر کا ثمرہ ایک عمل بھی ہے۔ یعنی حصول تفویض و توکل اور اس کا عمل ہونا ظاہر ہے۔ پس عقائد ہر چند کہ خود بھی مقصود ہیں۔ مگر ان کو تکمیل عمل میں بھی بڑا دخل ہے اور یہ دخل مطلوب بھی ہے۔ جیسا کہ آیت میں لکیلا تأسوا سے مستفاد ہوتا ہے۔

تعلیم توحید اور اعمال

اب اسی پر تمام عقائد کو قیاس کر لیجئے۔ کہ مثلاً توحید کی تعلیم خود بھی مقصود ہے اور اس سے اعمال کی تکمیل بھی مقصود ہے۔ کیونکہ جس شخص پر جس قدر توحید کا غلبہ ہو گا۔ اتنا ہی اس کے اعمال مکمل ہوں گے۔ اس کی نماز دوسروں کی نماز سے اکمل اس کی زکوٰۃ و روزہ دوسروں کی زکوٰۃ و روزہ سے افضل ہو گی۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ؎

مغرور بہ سخن مشو کہ توحید خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

اور شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس
ہمیں ست بنیاد توحید و بس

غرض موحد کامل کی یہ حالت ہو گی۔ جو شیخ نے بیان فرمائی ہے جو ادنے توحید والے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو عقائد گو بظاہر جمل خبریہ ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان میں عرض کیا ہے۔ مگر ان سے مقصود جمل انشائیہ

ہیں۔ اعتقادیہ بھی عملیہ بھی۔ جیسا ابھی مذکور ہوا۔ اس بناء پر اللہ واحد کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں بھی اس کا لحاظ رکھو۔ کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ پس اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ بناؤ۔ ورنہ ریاء ہو جائے گی۔ جو شرکِ اصغر ہے اور توحید کامل کے خلاف ہے۔

اسی طرح عقلاً خدا کے سوا کسی سے طمع و خوف نہ رکھو۔ کہ یہ بھی توحید کے خلاف ہے ۔ ہاں طبعی طمع و خوف کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو اضطراراً بے اختیار ہوتا ہے۔ جیسے سانپ کو دیکھ کر طبعاً ڈر جانا یا شیر سے ہیبت زدہ ہو جانا۔ مگر عقلاً یہ مضمون ہر دم پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ کہ بدون مشیت الٰہی کے کوئی چیز نفع یا ضرر نہیں دے سکتی۔

وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۚ

گر گزندت رسد ز خلق مرنج   کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا دان خلاف دشمن و دوست

کہ دلِ ہر دو در تصرف اوست   (۱۲ جامع)

اور یہ بڑا قیمتی مضمون ہے کہ جملِ خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ کوئی انشاء مقصود ہوتی ہے۔

اخبارِ رسول اور اعمال

ایک دوسری واضح مثال ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے۔ کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے۔ تو حق تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور اس نزول کی نسبت اجمالی

عقیدہ کافی ہے۔ کیونکہ ہم کو نہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی کنہ معلوم نہ صفات کی نہ ذات کی۔ بس جو حضورؐ نے فرمادیا ہے اس پہ ہمارا ایمان ہے۔

ہاں اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ عقائد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اخبارِ متواترہ یا قرآن سے ثابت ہوں۔ وہ تو قطعی ہیں۔ دوسرے وہ جو اخبارِ آحاد صحیحہ سے ثابت ہوں۔ وہ ظنی ہیں۔ قسم اول کا اعتقاد فرض اور ثانی کا واجب ہے۔ اول کا انکار کفر اور ثانی کا انکار فسق ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

اب غور کیجئے۔ کہ حضورؐ نے جو یہ خبر دی ہے۔ اس سے آپ کا مقصود کیا ہے۔ کیا صرف یہی مقصود ہے۔ کہ اس نزول کا اعتقاد رکھو یا کچھ اور بھی مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود یہ ہے کہ اس وقت کو ضائع نہ کرو۔ بلکہ اس وقت حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ نماز و استغفار میں مشغول ہونا چاہیئے۔ چنانچہ دوسری احادیث میں حضورؐ نے اس کی خود تصریح فرمادی ہے۔ قیام لیل اور تہجد کی آپ نے بہت ترغیب دی ہے۔

اور اس کی فضیلت میں بے شمار احادیث ہیں۔ اسی طرح دعائے نیم شبی کی فضیلت میں بکثرت احادیث ہیں اور بلکہ خود ایک ایسی ہی حدیث کے اخیر میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نزول فرما کر مخلوق کو خطاب فرماتے ہیں۔

هل من مسترزق فارزقه وهل من مستغفر فاغفرلهٗ او کما قال۔

کیا کوئی رزق کا طالب ہے کہ میں اس کو رزق دوں، کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے کہ میں اس کو بخش دوں۔ یہ صاف بتلا رہا ہے۔ کہ حضور کا اس سے ہم کو مطلع کرنا اسی لیئے ہے۔ تاکہ اس وقت میں ہم اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگ لیا کریں۔ پس اسی طرح تمام اخبار اعتقادیہ کو سمجھو۔ کہ ان

سے اشارات بھی مقصود ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ عقائد سے صرف اعتقاد ہی مطلوب ہے۔ بلکہ ان سے تکمیل اعمال بھی مطلوب ہے۔ کہ ان عقائد سے عمل میں کام لیا جائے۔ گویا بلفظ دیگر یوں کہیئے۔ کہ عقائد کو تکمیل اعمال کا آلہ بنایا گیا ہے۔

اور عقائد کا تکمیل اعمال میں دخیل ہونا اس طرح ہے۔ کہ مثلاً دو شخص فرض کیجیئے۔ جنہوں نے راستہ میں بادشاہ کو دیکھا۔ جن میں ایک تو بادشاہ کو پہچانتا ہے، ایک نہیں پہچانتا۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کو دیکھنے کے بعد دونوں کی حالت میں بین فرق ہو گا۔ جو شخص بادشاہ کو بادشاہ سمجھتا ہے۔ وہ تو فوراً آداب و تعظیم بجالائے گا اور پوری طرح خدمت و طاعت کے لیئے آمادہ ہو جائے گا اور جو اس کو معمولی آدمی سمجھتا ہے۔ وہ اس طرح آمادہ نہ ہو گا۔ پس شریعت نے جو عقائد ہم کو تعلیم کیئے ہیں۔ ان سے ایک تو مقصود یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اپنے دل میں جماؤ۔ دوسرا مقصود یہ ہے کہ اس عظمت کے مقتضائے عمل میں کام لو۔ تو اب اعمال کو غیر مہتم بالشان سمجھنا کتنا بڑا غضب ہے۔ جن کا مقدمہ اور آلہ تکمیل عقائد کو بنایا گیا ہے اور ظاہر ہے۔ کہ جس کے مقدمات اتنے معظم ہیں۔ وہ خود کتنا معظم ہو گا۔ گو من وجہ سہی۔

تخلیق انسان اور اعمال

دوسری بات یہ ہے۔ کہ انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے ابتلاء و امتحان کے لیئے۔ جیسا کہ آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ اس پر دال ہے۔ کیونکہ کلمات سے مراد احکام ہیں۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ احکام سے مقصود ابتلا ہے اور ابتلاء ہوتا ہے مخالفت نفس سے۔ کیونکہ اس میں مشقت ہوتی ہے اور بدون مشقت کے ابتلاء کا تحقق نہیں ہو سکتا معلوم

ہوا۔ کہ مقصود خلق انسان سے مجاہدہ و مشقت ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ صاف ارشاد ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ۔

اب خود سمجھ لیجئے کہ مشقت عقائد میں زیادہ ہے یا اعمال میں۔ تو ظاہر ہے کہ عقائد میں کیا مشقت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہاں پہلی بار عقائد باطلہ کو ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے۔ مگر یہ ابتداء میں تھوڑی دیر کے لیئے ہوتی ہے یہ نہیں کہ ہر وقت ایک آرہ سا چلتا ہو اور اعمال میں ہر وقت مشقت ہے ہر دم دل پر آرہ سا چلتا ہے۔ کہ اب یہ کرو، اب وہ کرو۔ یہی ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ کا مصداق۔

صاحبو! ایک شائق نمازی کو بھی بیماری اور سفر میں اول ہی دن جیسی مشقت ہوتی ہے۔ بارش اور اندھیری رات اور جاڑے اور سردی میں نماز کے لیئے گھر سے نکلنا اور وضو کرنا سہل نہیں۔ اسی لیئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباغ وضو علی المکارہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اندھیری میں نماز کے لیئے آنے والوں کو بشارت سنائی ہے۔ (کما فی الحدیث المشہور):۔

بشر المشائین فی الظلم الی المساجد بالنور التام یوم القیٰمۃ۔

تیسری بات (جو دوسری بات ہی سے متفرع ہے) یہ ہے کہ عقائد کو ایک بار اختیار کر لینے کے بعد ابقاء کی حاجت تو ہے۔ تجدید کی احتیاج نہیں۔ مثلاً اللہ واحد ایک بار سمجھ لیا۔ تو اب اس کے ابقاء کی ضرورت تو ہے کہ اس کے ضد کا اعتقاد نہ کیا جائے۔ باقی یہ ضروری نہیں کہ روزانہ اس کے امثال کی تجدید کی جائے بخلاف اعمال کے۔ کہ ان میں ہمیشہ تجدید کی ضرورت ہے۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے وقت۔ ایضاً کہہ دینا

کافی نہیں۔ بلکہ عملاً نماز کی تجدید لازم ہے۔ ایسے ہی روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ ہے۔ گو نماز روزہ کے سب افراد متماثل ہیں۔ مگر متحد تو نہیں ہیں۔ بلکہ ہر فرد کا وجود مستقل ہے اور اللہ واحد کہنے کے بعد اس کی ضرورت تو ہے۔ کہ اس کے خلاف کا عقیدہ نہ ہو۔ مگر تجدید لازم نہیں۔ گو افضل ضرور ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:۔

جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللہ۔

مگر یہ فرض نہیں۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو دن بھر اللہ واحد کا تصور نہ آوے۔ مگر اس کے خلاف کا بھی احتمال[1] نہ آوے تو یہ گنہگار نہ ہوگا۔ بس اللہ واحد کے تصور کی ضرورت صرف اول بار تھی۔ جب کہ اس کے ذہن میں شرک کا عقیدہ تھا یا شرک اور توحید دونوں سے خالی الذہن تھا۔ اس کے بعد نہ اس کا تصور فرض، نہ تجدید لسانی فرض، ہاں افضل و مستحب ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ایک بار اعتقاد کرلیا ہو۔ تو پھر اگر ساری عمر بھی اس کا استحضار نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز بھی نہ پڑھے۔ جس میں اشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ ہر قعدہ میں آتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کے اجزاء کو سمجھ کر نہ پڑھے۔ جیسا کہ عموماً نمازیوں کی حالت ہے اور ظاہر ہے کہ بے سمجھے نماز پڑھنے سے استحضار مضمون رسالت نہ ہوگا۔ تو اہل فتوے کا اتفاق ہے۔ کہ یہ شخص گنہگار نہیں۔ گو برکات عظیمہ سے محروم ضرور ہے۔ سو یہ اور بات ہے۔ بخلاف نماز کے کہ اس کی تجدیدات دن میں پانچ دفعہ فرض ہے۔

---

[1] وسوسہ غیر اختیاری مراد نہیں۔ کیونکہ وہ مُضر نہیں۔ بلکہ احتمال اختیاری مراد ہے ۱۲۔ ظ

خواہ سمجھ کر پڑھے یا بے سمجھے۔ ان وجوہ سے ثابت ہوا۔ کہ مجاہدہ نفس عمل میں زیادہ ہے۔ عقائد میں اتنا مجاہدہ نہیں اور مجاہدہ ہی مقصود ہے انسان کی پیدائش سے۔ تو جس کو اس مقصود میں زیادہ دخل ہوگا وہ اہمیت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ وجوہ ہیں اہمیت اعمال کی۔

خلاصہ یہ کہ بعض وجوہ سے عقائد زیادہ مہتم بالشان ہیں۔ مثلاً اس وجہ سے کہ وہ اصل ہیں اور صحت اعمال موقوف ہے عقائد پر، بدون صحت عقیدہ کے عمل ضائع و برباد ہے اور صحت عقائد وجودِ عمل پر موقوف نہیں اور بعض وجوہ سے عمل زیادہ مہتم بالشان ہے اور یہ ضرور ہے کہ اہمیت عقائد کے وجوہ زیادہ قوی ہیں۔ مگر میں نے اس وقت اہمیت اعمال پر زیادہ زور اس لئے دیا ہے۔ کہ ہم لوگوں کو ان کی اہمیت سے بالکل غفلت ہے۔ ہم ان کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب اعمال میں بھی وجوہ اہمیت موجود ہیں۔ تو یہ ہماری کوتاہی ہے۔ کہ ہم ان کے ساتھ اہتمام کا برتاؤ نہ کریں۔ میں آج کل عام طور پر اپنی جماعت کا حال دیکھ رہا ہوں۔ کہ وہ کسی کے عقائد اچھے دیکھ کر پھر اس کی عملی کوتاہی پر اصلاً نظر نہیں کرتے نہ اس کے اعمال سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ نہ دل سے کراہت و انکار کرتے ہیں اور یہ حالت خطرناک ہے۔ حدیث میں اس حالت پر وعید وارد ہے۔ یہ مضمون اہتمام عمل کا کل رات بیان نہ ہوا تھا۔ الحمدللہ کہ یہ آج بیان ہو گیا۔

تبلیغ میں قدرت کے باوجود کوتاہی

اب رہ گئی یہ بات کہ ہم اصلاح اعمال و تبلیغ احکام عملیہ میں کیا کوتاہی کر رہے ہیں۔ سو یہ کوئی طویل یا غامض مضمون نہیں۔ جب لوگ اعمال کی ضرورت اور اہمیت ہی سے غافل ہیں۔ تو ان کی اصلاح و تبلیغ سے غفلت بھی ظاہر

ہے۔ چنانچہ حالت ہماری یہ ہے۔ کہ ہفتے کے ہفتے گزر جاتے ہیں۔ کہ ہم کسی کو افعل کذا ولا تفعل کذا کبھی نہیں کہتے اور یہ کوتاہی اصلاح اعمال و تبلیغ احکام عملیہ میں اس درجہ بڑھ گئی ہے۔ کہ جن پر قدرت نہیں ہے ان کی تبلیغ کا تو کیا اہتمام ہوتا۔ جن پر قدرت بھی ہے۔ وہاں بھی اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ جن پر قدرت ہے وہ یہ لوگ ہیں۔ بیوی، بچے، نوکر، مرید، شاگرد اور جن پر قدرت نہیں وہ یہ لوگ ہیں۔ دوست، احباب، بھائی، برادری عزیز، قریب اور اجنبی لوگ۔

پھر جن پر قدرت نہیں۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کو تبلیغ کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ جیسے دشمن اور مخالف۔ اور بعض وہ ہیں جہاں ضرر کا کچھ اندیشہ نہیں۔ صرف ناگواری کا خطرہ ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی ہیں۔ چنانچہ دوست احباب بھائی اور عزیز سے ضرر جسمانی یا مالی کا کوئی خطرہ نہیں۔ بس ان کی تبلیغ سے محض اس واسطے پہلو تہی کی جاتی ہے۔ کہ ان کو ہماری روک ٹوک ناگوار ہوگی۔ سو اس کا علاج یہ ہے کہ نصیحت کا عنوان ایسا اختیار کرو۔ جس سے ناگواری نہ ہو۔ اور اس پر بھی کسی کو ناگواری ہو تو اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ مسلمان کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے۔ ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

اور جب وہ لوگ بھی جن کو بظاہر قدرت سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ زیادہ تر محل تبلیغ ہیں اور ان کی ترکِ تبلیغ میں بھی ہم معذور نہیں۔ تو بتلائیے جو لوگ ضابطے سے ہمارے ماتحت ہیں اور ظاہر میں اُن کی تبلیغ ہماری قدرت میں داخل ہے۔ وہاں ترکِ تبلیغ سے ہم کیوں کر معتوب و ماخوذ نہ ہوں گے، مگر حیرت ہے کہ ہم موقع قدرت میں بھی تبلیغ و نصیحت

سے طرح دیے جاتے ہیں۔

حقیقتِ بیعت

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جن پر قدرت ہے۔ وہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے التزام اطاعت کا ہم سے معاہدہ نہیں کیا۔ جیسے بیوی بچے کہ گو شرعاً ان پر ہماری اطاعت واجب ہے۔ مگر انہوں نے صراحۃً اس کا التزام نہیں کیا۔ کہ تم ہم کو تبلیغ کرو۔ ہم تمہاری تعلیم پر عمل کریں گے۔ مگر ایک تعلق ایسا ہے۔ جس میں دوسرا شخص معاہدہ صریحہ سے ہماری اطاعت کا التزام کرتا ہے اور وہ تعلق پیری مریدی کا ہے۔ کیونکہ پیری مریدی نام ہی ہے۔ معاہدۂ اطاعت من جانب المرید و معاہدۂ تعلیم و اصلاح من جانب الشیخ کا صرف ہاتھ میں ہاتھ لے کر سبق سا پڑھ دینے کا نام پیری مریدی نہیں۔ جیسا کہ آج کل عام طور سے اس میں غلطی ہو رہی ہے۔ کہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بیعت سمجھتے ہیں اور تعلیم و اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لیئے مجھے اس میں کلام ہے۔ کہ آج کل کسی طالب بیعت کو جلدی سے جلد بیعت کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں تقریر ہے۔ اس کی غلطی کی۔ اس طرح بیعت کر لینے سے وہ یہی سمجھے گا۔ کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی حقیقت ہے۔ نیز آج کل یہ بھی عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بدون بیعت کے نفع نہیں ہوتا۔ گویا لوگوں نے اصل مقصود کو اس فرع کے تابع کر دیا ہے۔ میرے نزدیک ان غلطیوں پر تنبیہ لازم ہے اور اس کی ضرورت ہے۔ کہ طالب کو اولاً اس پر متنبہ کیا جائے۔ کہ بیعت (یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا) نہ مقصود ہے، نہ کسی مقصود کا موقوف علیہ ہے۔ صرف رسم مشائخ ہے اور حقیقت بیعت کی یہ ہے کہ مرید کی طرف سے اتباع کا التزام ہو اور شیخ کی طرف سے تعلیم کا التزام ہو

اگر دو شخصوں میں ایسا معاہدہ ہو جائے۔ خواہ قولاً یا حالاً۔ کیونکہ معاہدہ کبھی حالیہ بھی ہوتا ہے۔ تو بس بیعت کا تحقق ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ بیعت کی حقیقت التزام ہے۔ یعنی شیخ اور طالب دونوں ایک امر کا التزام کرتے ہیں۔ طالب اطاعت واتباع کا شیخ تعلیم واصلاح کا۔

اب میری شکایت کا حاصل یہ ہے۔ کہ جہاں صریح التزام ومعاہدہ ہے اطاعت کا۔ غضب کی بات ہے کہ وہاں بھی آج کل تبلیغ نہیں کی جاتی، اور اگر بیعت کو صحیح التزام نہیں مانتے۔ تو اس کی کیا وجہ ہے کہ مرید کی جانب عملاً دونوں اس کو لازم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مرید اگر پیر کی کسی بات کو نہ مانے تو اس پر عتاب کیا جاتا اور دربار سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ عمل خود بتلا رہا ہے۔ کہ آپ بیعت کو صحیح التزام سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بے انصافی ہے۔ کہ ایک جانب التزام مانا جاوے، دوسری جانب نہ مانا جاوے۔ ایک جانب تو یہ شدت ہے کہ اگر مرید خدمت سے انکار کر دے یا کسی دنیوی کام میں شیخ کی مخالفت کرے تو فوراً معتوب ہو جاتا ہے اور دین کے معاملہ میں نہ شیخ اس کو کچھ کہتے ہیں۔ نہ وہ اس میں شیخ کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ جب مرید صراحۃً آپ کی اطاعت کا التزام کر چکا ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اب بھی شیوخ مریدین کی دینی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

صاحبو! تبلیغ سے ایک تو مانع عدم قدرت تھا اور ایک مانع عدم التزام تھا۔ گو عدم التزام واقع میں مانع نہیں۔ بلکہ قدرت کے بعد تبلیغ واجب ہے۔ گو دوسرے نے صراحۃً التزام نہ کیا ہو۔ مگر میں آپ کی خاطر سے تھوڑی دیر کے لیے عدم التزام کو بھی مانع مان کر کہتا ہوں۔ کہ جہاں قدرت بھی ہے اور التزام بھی ہے۔ وہاں حضرت شیخ کیسے خاموش ہیں جب میں ترک تبلیغ کے گناہ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے۔ کیونکہ جس طرح مرید نے

اطاعت کا وعدہ کیا ہے۔ ایسے ہی شیخ بھی تو اصلاح کا وعدہ کیے ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے۔ کہ مقتضی موجود ہے اور موانع سب مرتفع ہیں۔ پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں۔ کچھ روک ٹوک نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ شیوخ پیری مریدی کی حقیقت کو نہیں سمجھے یا عمداً جان بوجھ کر پہلو تہی کرتے ہیں۔

آج کل کی پیری مریدی

بس آج کل تو پیری مریدی کی حقیقت لوگوں نے یہ سمجھ رکھی ہے کہ پیر صاحب قیامت میں بخشوا لیں گے۔ لوگوں نے رسم بیعت کو مغفرت کا سبب سمجھ رکھا ہے۔ گو اس کے بعد کتنے ہی گناہ کر لیں۔ چنانچہ اس کے متعلق کچھ الہامات اور مکشوفات یاد کر لیئے ہیں۔ کہ فلاں بزرگ سے منقول ہے۔ کہ ان کو الہام ہوا تھا۔ کہ ہم تمہارے سب سلسلہ والوں کو بخش دیں گے۔ یہ تو وہ ہیں۔ جو دوسروں سے اسلم ہیں۔ ورنہ بعضے اس سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے۔ کہ بیعت اس واسطے ضروری ہے کہ اس سے ہمارے سر پر ایک بزرگ کا سایہ ہو جائے گا۔ تو دنیوی مقاصد میں ہم کو سہولت ہو گی۔ مقدمات میں دُعا اور تعویذ گنڈے کرالیں گے اور بیعت سے ہماری تنخواہ میں ترقی ہو جائے گی۔

چنانچہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں۔ کہ ہمارے سلسلہ میں ڈپٹی کلکٹری سے اس طرف کوئی رہتا ہی نہیں۔ ان کا مقصود بیعت سے محض دُنیا ہے اور ان کے نزدیک دین سے اس کو کچھ تعلق نہیں۔

یہ تو مریدوں کے خیالات تھے۔ اب پیروں کی سنیئے:۔

ان کے نزدیک بیعت سے مقصود یہ ہے۔ کہ مریدوں کے ذمہ ان کی ششماہی یا سالانہ مقرر ہو جائے گا۔ جیسے چار کمینوں کا فصلانہ مقرر

ہوتا ہے۔ پھر پیر صاحب کا کام کیا ہے۔ جس کے عوض یہ فصلانہ دیا جاتا ہے
ان کا کام وہ ہے جو بھنگی کرتا ہے۔ بھنگی نجاست ظاہرہ کا حامل ہے اور
پیر صاحب فصلانہ لے کر گناہوں کی نجاست کے حامل ہیں۔

چنانچہ بعض دیہات میں پیر کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو کمینوں
کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایک چودھری کے یہاں فصل پر اناج تیار ہوا اور گھر
والے چاروں کمینوں کا فصلانہ نکالنے لگے۔ تو چودھری کہتا ہے۔ کہ اس
سوہرے پیر کا بھی تو حق نکال دو۔ وہ بھی تو اپنا حق مانگنے آوے گا۔ واقعی
یہ عجیب راحت و آرام کا پیشہ ہے۔ کہ پیر صاحب گئے اور فصلانہ لے
آئے اور سال بھر آرام سے اپنے گھر بیٹھے رہے۔ اور پیشہ والے اگر فرض
منصبی کو انجام نہ دیں تو تنخواہ بند ہو جاتی ہے۔ مگر پیر کی تنخواہ بند ہی نہیں
ہوتی اور خواہ کچھ ہی کر لیں ان کی پیری بھی منسوخ نہیں ہوتی۔ چاہے شراب
پی لیں یا بدمعاشی کر لیں۔ کیوں کہ مشہور ہے کہ پیر کی پیری سے کام اس
کے فعلوں سے کیا کام۔ اگر پیر صاحب ڈھنگ کی باتیں بولیں تو حقائق و
معارف ہیں اور بے ڈھنگی بے تکی ہانکیں تو رموز ہیں اور خاموش رہیں تو
مراقب اور چپ شاہ ہیں۔ ان کی ہر حالت میں جیت ہے۔

افسوس! آجکل پیروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے۔ جو یہود و نصاریٰ
نے اپنے احبار و رہبان کے ساتھ کر رکھا تھا۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ۔

کہ خدا کے بیٹے اور اسکے محبوب بنتے تھے (نعوذ باللہ استغفر اللہ)
ان کو سب کچھ معاف ہے جو چاہیں کریں۔ اس طریقہ میں عمل کی ضرورت ہی
نہیں عمل سے کچھ سروکار ہی نہیں۔

یاد رکھو! کہ ایسی پیری مریدی کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں یہ
سراسر بے دینی ہے

ترکِ فرائض اور التزامِ وظائف

اور خیر بعضے ایسے تو نہیں ہیں۔ بلکہ بیعت کے بعد عمل کی بھی ضرورت سمجھتے ہیں۔ مگر کون سے اعمال کی فرائض و واجبات کی نہیں۔ بلکہ وظائف و اوراد کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ کچھ وظیفے پیر سے معلوم کر لیتے ہیں۔ ان میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا۔ چاہے فرائض ناغہ ہو جائیں۔ نماز کی پرواہ نہیں کہ وقت پر ہوتی ہے یا بے وقت۔ معاملات میں سے پیر تک گندے ہیں۔ سود لیتے ہیں اور دیتے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے اور اس کے ساتھ تہجد کے پابند ہیں۔ اشراق کے پابند ہیں۔ تسبیح بہت لمبی ہے۔ جو ہر وقت چلتی رہتی ہے اور پیر صاحب بھی ان مریدوں کی سود کی آمدنی سے ہدایا لیتے رہتے ہیں۔

چنانچہ اسی قسم کے ایک شخص نے خود مجھ سے فخراً کہا کہ نماز تو چاہے قضا ہو جائے۔ مگر پیر نے جو وظیفہ بتلا دیا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ جب قضا آئے گی۔ اس وقت اس کا نتیجہ معلوم ہوگا۔ کہ نماز زیادہ ضروری تھی یا وظیفہ؟ اور ان میں بھی اسلم وہ ہیں جو وظیفے ثواب کے لیئے پڑھتے ہیں۔ ورنہ اکثر تو دنیا ہی کے واسطے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ کوئی قصیدہ غوثیہ کا ورد کرتا ہے، کوئی حزب البحر کا۔ اگر ان کو ثواب مطلوب ہوتا۔ تو ادعیۂ ماثورہ میں ان سے زیادہ ثواب ہے۔ مگر دنیا مطلوب ہے۔ اس لیئے ادعیۂ ماثورہ سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ اس قسم کے وظائف سے دلچسپی ہے۔ جن سے دنیوی منافع بھی حاصل ہوتے ہیں۔

حقیقتِ مجاہدہ و ریاضت

ان سے بڑھ کر ایک طبقہ اور ہے۔ جو صوفیاء کہلاتے ہیں۔ وہ

اس لئے بیعت ہوتے ہیں۔ تاکہ کیفیات اور کشف و کرامات حاصل ہو جائیں۔ یہ لوگ کیفیات کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے ترک لذات کرتے ہیں۔ نیند کم کرتے ہیں۔ غذا کم کرتے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے مجاہدہ و ریاضت۔ حالانکہ مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ مخالفت نفس فی المعاصی۔ روٹی کھانے یا ٹھنڈا پانی پینے میں نفس کی مخالفت کرنا مجاہدہ نہیں۔ بلکہ مجاہدہ یہ ہے کہ نفس نے مثلاً تقاضا کیا کسی امرد یا عورت کے دیکھنے کا یا گانا سننے کا یا کسی کی غیبت کرنے کا۔ اس میں نفس کی مخالفت کی اسی طرح تمام معاصی میں غور کر لو۔ مگر یہ صوفی جو مجاہدہ کے مدعی ہیں۔ ان مواقع پر نفس کی مخالفت نہیں کرتے۔ بلکہ بہت سے لڑکوں اور عورتوں کے گھورنے میں مشغول ہیں۔

اور غضب یہ کہ گناہ کر کے تاویل یہ کی جاتی ہے۔ کہ ہم تو صنعت حق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مولانا محمد مظہر صاحب سہارنپوریؒ نے ایک ایسے ہی مسخرہ کو خوب جواب دیا تھا۔ کہ اپنی ماں کی شرمگاہ میں جا کر صنعت حق کو دیکھ۔ کہ ایسی ذرا سی تنگ جگہ سے تو اتنا بڑا آدمی پیدا ہو گیا۔ غرض ان لوگوں نے مجاہدہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھی۔

اور ریاضت کے معنی اہل لغت میں سدھانے کے ہیں۔ کیونکہ یہ ماخوذ ہے۔ روض الدابہ سے جس کے معنی ہیں گھوڑے وغیرہ کو سدھانا۔ اور اصطلاح میں ریاضت کے معنی ہیں۔ تحصیل اخلاق حمیدہ و ازالۂ اخلاق ذمیمہ۔ پس مجاہدہ تو یہ ہے کہ شہوت و غضب وغیرہ کا جب تقاضا ہو تو اس تقاضے کو روکا جائے اور ریاضت یہ ہے۔ کہ اس تقاضے سے منشاء کو زائل کر کے اس کے بجائے خلق حسن اور ملکۂ فاضلہ پیدا کیا جائے۔ کیونکہ جتنے معاصی ہیں۔ سب کے مناشی اخلاق ہیں اور ریاضت اسی مرتبۂ خلق کے ازالہ کا نام ہے اور زائل کرنے سے مطلب

یہ ہے کہ منشا مضمحل و ضعیف ہو جائے۔ کیونکہ اخلاق رذیلہ کا ازالہ ممکن نہیں یہ سب رذائل فطری ہیں۔ اور حدیث میں ہے۔

اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل زال عن جبلتہ فلا تصدقوہ۔

اور ان رذائل کے فطری ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے اور محققین کا قول ہے۔ کہ غضب کبر سے پیدا ہوتا ہے پھر غضب سے غیبت پیدا ہوتی ہے۔ جب بچوں میں غصہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ان میں تکبر بھی ہے تو بچوں کے اندر ان امور کے ہونے سے معلوم ہوا کہ یہ امور فطریہ ہیں اور امور فطریہ کا ازالہ کلیۃً نہیں ہو سکتا۔ تو جو سالک ان کو بالکل زائل کرنا چاہے وہ اس کا مصداق ع

دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

اور یہ میں نے اس لیئے ظاہر کر دیا۔ کہ سالکین اس حقیقت کے نہ جاننے سے بہت پریشان ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ مجاہدہ کر کے سالک یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھ سے کبر زائل ہو گیا۔ اس کے بعد کسی موقعہ پر وہ پھر ابھرا تو پریشکستہ دل ہو جاتا ہے اور ہمت پست ہو جاتی ہے کہ افسوس ساری محنت ہی برباد گئی۔ مجاہدہ ضائع ہو گیا۔ یہ بلا تو ہنوز موجود ہے۔ پھر اس غم میں بعض تو خودکشی کر لیتے ہیں اور بعض خودکشی کر لیتے ہیں۔ یعنی بعضوں نے جان دے دی اور بعض نے اپنے کو طریق سے الگ کر لیا۔ کہ اس راہ میں تو کامیابی دشوار ہے ممکن ہی نہیں۔

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ زوال سے مقصود اضمحلال ہے اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں۔ کہ بعد مجاہدہ کے ان اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی۔ ورنہ یاد رکھو کہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے۔ نہ بخیل کا بخل، نہ متکبر کا تکبر۔ ہاں اضمحلال ہو جاتا ہے۔ جس کا ثمرہ یہ ہے

کہ ان کے مقتضا پر عمل نہ ہو۔ کیوں کہ عمل اختیاری ہے۔ پس مقتضائے رذیلہ پر عمل نہ کرنا یہی بڑی کامیابی ہے اور مجاہدہ و ریاضت سے یہی سہل و آسان ہو جاتا ہے۔

غرض اس تقریر سے سمجھ میں آگیا ہوگا۔ کہ ایک درجہ تو ہے تقاضائے معصیت کا۔ اس کی مخالفت کرنا تو مجاہدہ ہے اور ایک اس تقاضے کا منشاء ہے۔ خلق رذیل اُس کے ازالہ یعنی اضمحلال کو ریاضت کہتے ہیں۔

مقصودِ مجاہدہ

یہ تو اُن کی حقیقت ہے جس میں ترک اکل و شرب کو کوئی دخل نہیں یہ اور بات ہے کہ اس حقیقت کی تحصیل میں ترک اکل و شرب وغیرہ سے سہولت ہو جاتی ہے تو وہ مقدمہ ہوا۔ مگر یہ کیا غضب ہے کہ مقدمہ کو مقصود بنا لیا گیا۔ کہ اصل مجاہدہ کا تو پتہ نہیں، نہ امردوں کا گھورنا چھوڑیں نہ عورتوں کا دیکھنا اور کھانا پینا سونا کم کر کے مجاہد بن گئے۔ یہ تو جہلاء صوفیہ کا حال ہے۔

اور جو ذرا لکھے پڑھے ہیں۔ وہ ترک معاصی کا بھی اہتمام کرتے ہیں مگر وہ اس مرض میں گرفتار ہیں۔ کہ احوال و کیفیات کو مقصود و مطلوب سمجھے ہوتے ہیں۔ کسی سے انہوں نے سُن لیا تھا۔

المجاھدۃ مفتاح المشاھدۃ۔

بس یہ لفظ تو یاد کر لیا۔ مگر تفسیر کسی محقق سے دریافت نہ کی۔ بلکہ اپنی رائے سے معنی گھڑ لیے۔ مجاہدہ کے معنی تو مرنا کھپنا لیے کہ کھانا بھی چھوڑ دے اور پینا بھی۔ اور مشاہدہ کی یہ تفسیر کی۔ کہ اللہ کی طرف خود بخود بدون ارادہ کے لَو لگی رہے۔ ذوق شوق ہو۔ کشف ہو۔ یکسوئی ہو۔ استغراق ہو۔

بس وہ اسی کے واسطے ساری کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی اثر ظاہر ہو گیا۔ کہ تھوڑی دیر کو وساوس کم ہو گئے۔ شوق و ذوق پیدا ہو گیا۔ تو خوش ہو گئے۔ کہ بس ہم کامیاب ہیں اور اگر کبھی ایسا نہ ہوا۔ تو اب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ شیخ سے شکایتیں کرتے ہیں۔ کہ مجھے تو ذکر سے نفع نہیں ہوتا، وساوس بند نہیں ہوتے، شوق و ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ شیخ اگر اناڑی ہے تو وہ ہر شکایت پر دل جمعی کے لیئے ایک وظیفہ اضافہ کر کے مرید کو مجموعۃ الوظائف بنا دے گا۔

جیسے علی حزین شاعر نے اپنے ہمسایہ کو تذکرۃ الاولیاء بنایا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ علی حزین جب دہلی آیا۔ تو اس کے لیئے ایک محل بہت عمدہ تجویز کیا گیا۔ وہ اس میں رہنے لگا۔ اس کے دہلیز میں ایک مداری فقیر رہتا تھا۔ وہ رات کو ایک لمبا شجرہ پڑھا کرتا تھا۔ چند روز میں مالک مکان علی حزین کی مزاج پرسی کے لیئے آئے۔ کہ اگر کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو۔ تو ظاہر فرمایا جائے۔ تاکہ اس کا بندوبست کیا جائے۔ علی حزین نے کہا اور تو کچھ تکلیف نہیں۔ مگر اس تذکرۃ الاولیاء کو کہیں اور کسی جگہ بسا دو۔ راتوں کا سونا ظالم نے تنگ کر دیا ہے۔ اس کا شجرہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ تو جیسے علی حزین نے اس فقیر کو تذکرۃ الاولیاء بنایا تھا۔ ایسا ہی میں کہتا ہوں۔ کہ اناڑی شیخ اپنے مریدوں کو مجموعۃ الوظائف بنا دیتا ہے۔ پھر بعضے تو ایسے وظائف بتلاتے ہیں جو شرع کے موافق ہیں اور بعضے تو بہت ہی بے تکے وظائف بتلاتے ہیں۔ جو خلاف شرع ہیں جیسے یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ۔ اور ایک وظیفہ مشہور ہے۔ اللہ الصمدی یا محمد مددی۔ اس میں صمد کی اضافت الی الیاء مع لام تعریف کے نامعلوم کیسی اضافت ہے۔ یہ تو لفظی غلطی ہے اور معنوی غلطی نداء غیر اللہ ہے۔

اسی طرح کلکتہ میں کرانہ کے ایک پیرزادے ہیں۔ ان کا رات دن وظیفہ یہ تھا۔ مدیا حی یا قیوم، کچھ دے نقدی کچھ دے ٹوم۔ پھر سنا ہے کہ ان کو کلکتہ پہنچ کر نقدی بہت ملی اور ایک وظیفہ بعضے لوگ یہ بتلاتے ہیں۔ کہ اُٹھ بھنبیری ساون آیا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ اجی بزرگوں کے کلام میں برکت ہوتی ہے۔ معنی سے کیا بحث۔

سبحان اللہ ہر کلام میں برکت کیوں کر تسلیم کر لی جائے۔ چاہے وہ کیسا ہی بے تکا کلام ہو۔ کوئی خدا اور رسول کا کلام تو نہیں جو ایمان لے آیا جائے اور خدا ورسول کا کلام بے تکا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو وظائف میں گڑبڑ ہے۔ بعض لوگ اشغال میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شغل یہ بتلایا جاتا ہے۔ کہ سانس آنکھ ناک کان کو بند کر لو اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اس پر غضب یہ کہ مولانا رومی کو اس شغل کا موجد بتلاتے ہیں اور دلیل میں یہ شعر پڑھتے ہیں ۔

چشم بند ولب بہ بند وگوش بند
گر نہ بینی نورِ حق بر من بخند

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم نے یہ شعر مثنوی میں دیکھا نہیں نہ ہم کو اس میں ہونا یاد ہے اور اگر ہو بھی تو میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی سے ان اعضاء کو بچاؤ۔ کیونکہ نورِ حق کا وعدہ طاعات کے امتثال ترکِ معاصی ہی پر ہو سکتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ۔

اور حدیث میں بھی ہے کہ جو شخص کسی نامحرم سے اپنی نگاہ کو روک یا ہٹائے گا۔ وہ ایک حلاوت اپنے دل میں پائے گا۔ دوسرے مولانا

کے زمانہ میں یہ اشغال نہ تھے۔ یہ تو جوگیوں سے لیئے گئے ہیں۔ اس لیئے کہ طبعی قاعدہ سے۔ حصول یکسوئی میں یہ اشغال مفید ہیں۔ باقی ثواب میں ان کو کچھ دخل نہیں۔

اہلِ سلوک کی پریشانی

غرض یہ لوگ اسی اُدھیڑبن میں لگے رہتے ہیں۔ کہ کیفیات وغیرہ کے لیئے وظائف پڑھیں یا اشغال کریں اور اس کو بڑا مجاہدہ اور ثواب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کو مقصود سے کچھ بھی مس نہیں اور جو شیخ اس حالت میں ان مریدوں کو وظیفے ہی بتلاتا جائے۔ اس کے متعلق محقق یُوں کہے گا ؎

بے خبر بودند از حالِ درون　　　استعیذ اللہ مما یفترون

اس کو اصل مرض کی خبر نہیں۔ جو اس شخص کی پریشانی کا سبب ہے اصل مرض صرف یہ ہے کہ اس نے یکسوئی اور کیفیت ذوق و شوق وغیرہ کو مقصود سمجھ رکھا ہے۔ اس لیئے پریشان ہے۔ اس مرض کا اصلی علاج یہ ہے۔ کہ اس کے ذہن نشین یہ مسئلہ کر دیا جائے۔ کہ یہ کیفیات مقصود نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ مامور بہا نہیں ہیں اور مقصود وہی ہے۔ جو مامور بہ ہے اور ظاہر ہے۔ کہ تحصیل استغراق وغیرہ کا نصوص میں کہیں امر نہیں کسی کو دعوےٰ ہو تو دکھلائے۔ ہاں شوق و خشیت[1] کے لیئے حدیث میں

---

[1] فان قلت قال تعالیٰ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ وھذا ھو الشوق وقال وایای فارھبون وھذا ھو الخشیۃ فکیف لا یکونان مامورین بھما قلت ان الما مور بہ درجۃ الشوق والخوف العقلی دون الطبعی۔ ۱۲۔ جامع

دعا آئی ہے۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوا۔ کہ بعض احوال محمود ہیں۔ مگر مقصود ہونا تو ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ یاد رکھو کہ شریعت نے انہی اشیاء کو مقصود بنایا ہے جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور جو شئے اختیارِ انسان سے باہر ہو وہ مامور بہ نہیں ہوتی، نہ مقصود ہوتی ہے۔

شاید اس پر آپ کہیں۔ کہ مغفرت و دخول جنت بھی تو غیر اختیاری ہے۔ یہ بھی مقصود نہ ہوئی۔ ورنہ اگر یہ مقصود ہیں۔ تو بتلاؤ قرآن میں ان کا کہاں امر ہے۔ میں کہتا ہوں قرآن میں تو ان کا امر جابجا صراحتہ مذکور ہے:۔

سَابِقُوٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔

اور اس کا امر اس لیئے ہے۔ کہ ان دونوں کا حصول انسان کے اختیار میں ہے۔

شاید آپ اس سے چونکیں گے۔ کہ حصول مغفرت و دخول جنت اختیار میں کہاں؟ تو میں کہتا ہوں۔ کہ امور اختیاریہ کا اختیاری ہونا جس درجہ میں ہے اور جو مبنیٰ اُن کے اختیاری ہونے کا ہے وہ مبنیٰ یہاں بھی موجود ہے اور اس کا بھی وہی درجہ ہے۔ کیونکہ تمام امور اختیاریہ کے اختیاری ہونے کا مبنیٰ یہ ہے۔ کہ اس کا سبب انسان کے اختیار میں ہے۔

باقی یہ کہ مسبب براہِ راست اختیار میں ہو۔ سو یہ کسی امر میں بھی نہیں۔ دیکھئے سیراب ہونا، پیٹ بھرنا، ملازمت زراعت سے روپیہ حاصل کرنا وغیرہ جو اختیاری کہلاتے ہیں۔ اسی معنی کے اعتبار سے کہ ان کے اسباب اختیار میں ہیں۔ ورنہ مسبب تو کسی کے بھی اختیار میں نہیں۔ عقلاء سب اس پر متفق ہیں اور جب یہ ہے تو بتلاؤ جنت و مغفرت اختیاری کیوں نہیں، جب کہ ان کے اسباب اختیاری ہیں۔ یعنی اعمال صالحہ۔ اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے جابجا اعمال پر مغفرت و دخول جنت کو

متفرع فرمایا ہے اور اعمال اختیاری ہیں تو یہ بھی اختیاری ہے. کیوں کہ سبب اختیار میں ہے اور سبب ہی کے اختیاری ہونے پر شئے کا اختیاری ہونا ہے مبنی. باقی ان احوال و کیفیات کی طلب و تحصیل کا امر تم بتلاؤ کہاں ہے یا کس عمل پر ان کے ترتب کا وعدہ کیا گیا ہے. بس سالکین کی زیادہ تر پریشانی کا راز یہ ہے کہ وہ غیر مقاصد کے درپے ہوتے ہیں۔

کیفیات میں اشتباہ

یہ حال تو محققین کا ہے کہ وہ کیفیات کے طالب ہیں اور ان کے انعدام سے پریشان ہوتے ہیں. وجہ یہ کہ یہ محق ہونے کے ساتھ غیر محقق ہیں اور ایک جماعت مبطلین کی ہے. جن کو غیر محققین بھی کہا جاتا ہے. ان کی یہ حالت ہے کہ احوال و کیفیات کی طلب میں ان لوگوں سے معاصی تک سرزد ہوتے ہیں. مثلاً بیوی بچوں سے ترک تعلق کر دیتے ہیں. تاکہ کیفیت میں فرق نہ آئے۔

میر محمد کا واقعہ ہے. کہ میں وہاں اپنے گھر میں کے علاج کے واسطے اُن کے ساتھ گیا ہوا تھا. اس وقت ایک مسماۃ نے بیعت کی درخواست کی. چند عورتوں نے اُس کو کہا. تو ان سے بیعت نہ ہو. بلکہ ہمارے پیر سے مرید ہو جنہوں نے پچاس سال سے بیوی کا منہ نہیں دیکھا اور یہ تو بیوی کو سفر میں لیئے پھرتے ہیں. اس مسماۃ نے اس قسم کا جواب دیا. کہ تمہارے پیر سے تو میں ہرگز بیعت نہ ہوں گی. وہ تو پچاس برس سے خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہے. کہ بیوی بچوں کے حقوق ادا نہیں کرتا. میں تو ان سے ہی مرید ہوں گی. ان کا طرز سنت کے موافق ہے. تو اس ظالم نے پچاس برس سے بیوی کو چھوڑ رکھا تھا. شاید اسی لیئے علیحدہ رہا ہوگا. تاکہ بیوی کے اختلاط سے یکسوئی وغیرہ کی کیفیت میں خلل نہ آجائے. مگر جو کیفیت

معصیت کے ساتھ بھی مجتمع رہے۔ ایسی کیفیت خود مردود ہے۔ یاد رکھو۔ کہ بعض دفعہ کیفیات محمودہ و کیفیات غیر محمودہ میں صورۃً اشتباہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً تذلل و تملق و تواضع کی صورت بعض دفعہ یکساں ہوتی ہے۔ اسی طرح استغناء من الخلق و کبر کی صورت متشابہ ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی نفسانی یکسوئی اور روحانی یکسوئی میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ بیوی بچوں سے الگ رہ کر جو یکسوئی حاصل ہوتی ہے وہ نفسانی یکسوئی ہے روحانی نہیں ہے۔ اس تشابہ و تشاکل کو مولانا رومیؒ اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　　درمیان شان برزخ لایبغیاں

کیفیات کے لئے معیار

جب کیفیات میں باہم تشابہ ہے۔ تو اب کسی معیار کی ضرورت ہوئی۔ جس سے معلوم ہو سکے۔ کہ کون سی کیفیت محمودہ ہے اور کون سی مذمومہ۔ سو اس کے لئے معیار صرف شریعت مقدسہ ہے۔ یعنی جو کیفیت کسی گناہ کا مقدمہ ہو جائے وہ مذموم ہے ورنہ محمود ہے۔ اگر یہ معیار سامنے نہ ہو تو پھر کیفیات تو جوگیوں کو بھی نصیب ہو جاتی ہیں۔ کیا ان کو بھی صوفی اور ولی کہو گے؟ اور آج کل اس کہہ دینے میں بھی استبعاد نہیں کیونکہ جب لوگوں نے کیفیات ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے اور تصوف انہی کا نام رکھ چھوڑا ہے۔ تو ان کے نزدیک ہر صاحب کیفیت صوفی ہے خواہ مسلم ہو یا کافر۔ چنانچہ آج کل ایک کافر صاحب ریاضت کے بہت سے مسلمان معتقد ہیں۔ اور مظفر نگر میں سنا تھا۔ کہ ایک ہندو بابو کے بہت سے مسلمان مرید ہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ ہندو کسی مسلمان پیر سے مرید ہونے آئے ہیں اور وہ مسلمان پیر صاحب اس کو مرید کر لیتے ہیں اور مرید صاحب ہندو کے ہندو ہی رہتے ہیں۔ یہ مصلحت سمجھتے ہیں۔ کہ شاید کبھی وقت مسلمان

ہوجاویں۔ مگر ہمارے اکابر نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔ گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کے پاس ایک ہندو مرید ہونے آیا اور تعجب یہ کہ وہ ایک بہت بڑے بزرگ زمانہ سے مرید تھا۔ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسلیئے مولانا کے پاس تجدید بیعت کے لیئے آیا اور ان مرحوم بزرگ کے ایک معتقد کا خط لایا۔ حضرت مولانا نے صاف فرمادیا کہ بیعت کرنے سے انکار نہیں، مگر ہمارے یہاں بیعت کی سب سے اول شرط اسلام ہے۔ مسلمان ہوجاؤ، ہم مرید کرلیں گے۔ اس نے یہ شرط قبول نہ کی۔ حضرت نے مرید نہ کیا۔ بعد میں بعضوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اس کو اسی حالت میں مرید کر لیا جاتا۔ تو اسلام سے قریب ہو جاتا۔ فرمایا ہرگز نہیں۔ بلکہ اور بعید ہو جاتا۔ کیونکہ ذکر و شغل میں خاصیت ہے۔ کہ اس سے کیفیات طاری ہوتی ہیں اور کیفیات میں خاص لذت بھی ہوتی ہے۔ جس کو یہ شخص قرب حق کی لذت سمجھتا اور اس کو کافر رہ کر بھی یہ کیفیات حاصل ہو جاتیں۔ تو اس کا یہ خیال پختہ ہو جاتا۔ کہ قرب الٰہی میں اسلام کو کچھ دخل نہیں نہ اسلام کی ضرورت ہے۔ بلکہ کافر رہ کر بھی قرب حق حاصل ہو سکتا ہے۔ تو پھر کسی وقت بھی اس کے اسلام لانے کی اُمید نہ رہتی اور اب جو کورا جواب دیا گیا ہے۔ کہ بدون اسلام کے خدا کا راستہ نہیں مل سکتا۔ اب اُمید تو ہے۔ کہ شاید کسی وقت اسلام کی ضرورت کا خیال اُس کے دل پر غالب ہو۔

تصوّف یا جوگ؟

اس قصہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کیفیات کافر کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جس چیز کے حصول میں اسلام بھی شرط نہ ہو۔ وہ کیوں کر مقصود اور قرب کا موقوف علیہ ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں خوب

عمر فاروق @ وین اردو

سمجھ لو۔ کہ ان کیفیات کو قرب میں کچھ دخل نہیں نہ یہ مقصود تصوف ہیں۔

اور ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کفار کو مرید کرنا اسلام سے اُن کو قریب کرنا نہیں ہے۔ بلکہ بعید کرنا ہے۔ آج کل ایک صاحب پیر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے ہندو بھی مرید ہیں اور ستم یہ کہ آپ نے ایک رسالہ میں یہ بھی شائع کیا ہے۔ کہ میرے بعض ہندو مرید مجھ سے کہتے ہیں۔ کہ اگر آپ کہیں تو ہم مسلمان ہو جائیں۔ میں نے ان کو لکھ دیا ہے۔ کہ نہیں۔ مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ ہندو رہ کر بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ (یا اسی کے قریب کچھ الفاظ تھے) بتلایئے جو شخص مسلمان ہونے والے کو اسلام سے روکے اور یہ کہے کہ اسلام کی ضرورت نہیں۔ اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کمبخت پھر بھی شیخ طریقت اور پیر ہونے کے مدعی ہیں۔ نہ معلوم یہ کیسا تصوف ہے۔ جس کے لئے اسلام کی بھی ضرورت نہیں۔ سلف کے نزدیک تو تصوف کے معنی تعمیر الظاہر والباطن تھے۔ کچھ عرصہ سے تعمیر ظاہر کو تو لوگوں نے تصوف سے نکال ہی ڈالا تھا۔ اب ایسے خلف پیدا ہوئے جنہوں نے تعمیر باطن کو بھی اس سے الگ کر دیا۔ کہ ایمان و اسلام سے بھی دل کو آباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب ایمان و عمل دونوں اجزاء جاتے رہے۔ تو فرمایئے وہ تصوف کیا خاک رہا۔ بلکہ محض جوگ رہ گیا۔ پھر یہ لوگ اپنے کو صوفی کس لئے کہتے ہیں، جوگی کہنا چاہیئے۔ انہی وجوہ سے بعض لوگ تصوف سے بداعتقاد ہو گئے۔ کہ یہ عجب گورکھ دھندا ہے۔ جس میں نہ اسلام کی ضرورت، نہ ایمان کی، نہ عمل کی، نہ معاصی سے بچنے کی اور ظاہر ہے کہ سب مسلمان تو ایسے جاہل نہیں کہ ان کو دین کی کچھ بھی عقل نہ ہو۔ وہ اس حالت کو یقینی بے دینی سمجھتے ہیں اور ان جوگیوں کی وجہ سے جنہوں نے شیخ اور صوفی کا لقب اختیار

کر رکھا ہے۔ اس فیصلہ پر مجبور ہوئے۔ کہ تصوف زندقہ اور بے دینی کا نام ہے۔

مگر میں کہتا ہوں۔ کہ کیا چند اناڑی عطائیوں کے غلط سلط نسخوں سے فنِ طب یا محقق اطباء سے بھی آپ بد اعتقاد ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ عطائی صوفیوں کی حرکات سے آپ تصوف کو چھوڑ دیں اور محقق صوفیاء سے بھی بد اعتقاد ہو جائیں۔ جس طرح آپ علمِ طب میں محقق طبیب کی تلاش کرتے ہیں۔ اسی طرح تصوف میں بھی محقق صوفی کو تلاش کرنا چاہیئے۔ سب سے بد اعتقادی کی کیا وجہ ہے۔ غرض میں کیفیات کے غیر مقصود ہونے کو بتلا رہا تھا۔ کہ ان کے حصول میں اسلام کی بھی ضرورت نہیں تو پھر یہ مدارِ قرب کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

کیفیاتِ محمودہ

اب ایک بات اور کہتا ہوں۔ کہ دین میں مقصود وہ ہوتا ہے۔ جو بدون تحصیل کے حاصل نہ ہو۔ جس کا حصول صرف اختیار پر موقوف ہو اور قرآن میں منصوص ہے۔ کہ بعضے احوال جیسے کشف مرتے ہی سب کو خود بخود حاصل ہو جائیں گے یہاں تک کہ کفار کو بھی۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ۔

اور فرماتے ہیں:۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۔

اور ارشاد ہے:۔

أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُوْنَنَا۔

باقی میرا یہ مطلب نہیں۔ کہ یہ محمود بھی نہیں۔ اگر کسی کو کیفیاتِ محمودہ حاصل ہوں دین کی محمودیت کا معیار آپ کو بھی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ

اس سے طاعت میں ترقی اور گناہوں میں کمی ہو، تو نور علیٰ نور ہے۔ خدا کی نعمت ہے۔ اس کی قدر کرے اور نہ حاصل ہوں۔ تو کچھ غم نہ کرے۔ اس وقت اس کو مولانا رومیؒ کا یہ شعر سنایا جائے گا۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی یہ کہتا۔ کہ اتنی لاکھ دفعہ ذکر کرتا ہوں۔ مگر نفع نہیں ہوتا۔ تو فرمایا کرتے۔ کیا یہ نفع تھوڑا ہے۔ کہ اتنی لاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہو گئی۔ ہمارے ایک دوست ہیں۔ وہ ذکر و شغل کے پابند ہیں۔ مگر طالبِ کیفیات ہیں اور کیفیات ان کو حاصل نہیں ہوتیں کیوں کہ کیفیات کا مدار یکسوئی پر ہے اور یکسوئی کم عقلوں کو زیادہ ہو جاتی ہے۔ عاقلوں کو خاص کر، صاحبِ ذکاوت مفرطہ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کا دماغ ہر وقت حرکتِ فکریہ میں رہتا ہے۔ اسی لیئے میں نے ان سے کہہ دیا تھا۔ کہ تم کو کیفیات کبھی حاصل نہ ہوں گے۔ تم صرف ذکر و شغل کو غنیمت سمجھ کر کیئے جاؤ۔ مگر وہ طلب سے باز نہ آئے۔ ایک صاحبِ توجہ و تصرف بزرگ کے پاس گئے۔ انہوں نے ان سے روزے رکھوائے اور درود و استغفار نامعلوم کتنا پڑھوایا۔ پھر اُن پر توجہ ڈالی۔ ایک دن ڈالی، پھر دوسرے دن، پھر تیسرے دن۔ مگر اُن پر اثر ہی نہ ہوا۔ ایک کیفیت بھی حاصل نہ ہوئی۔ اس وقت اُن کو میرے قول کی تصدیق ہوئی کہ واقعی میں کیفیات کے قابل نہیں ہوں۔ اس وقت طلب کیفیت دل سے نکلی۔

اور اس سے قبل ان ہی کا ایک واقعہ اور ہوا تھا۔ کہ اُن کو ایک ریاست میں جہاں عرصہ تک ملازم رہے تھے۔ کسی کام سے جانا پڑا۔ مجھ سے اجازت لی۔ میں نے اجازت دے دی۔ گو میں جانتا تھا۔ کہ اس سفر

عمر فاروق @ ورڈ پریس

سے معمولات ناغہ ہوں گے۔ مگر میں نے قصداً یہی سمجھ کر اجازت دی تھی۔ کہ ذرا ان کو ذکر و شغل کی قدر تو معلوم ہو۔ چنانچہ اس سفر میں معمولات کے ناغہ ہونے سے ان کو اپنے قلب میں ایک ظلمت سی محسوس ہوئی اور وہ جو ذکر اللہ سے خاص نور پیدا ہوا تھا۔ اس میں کمی ہوتی۔ تو وہ بڑے گھبرائے اور نہایت قلق ہوا۔ میرے پاس خط لکھا۔ جس میں اپنی تباہی اور بربادی کا رونا رویا تھا۔ میں نے لکھا کہ آج ان معمولات کے ناغہ ہونے کی فکر کیوں ہے۔ اس کا قلق اس قدر کس لئے ہے۔ یہ تو وہی ہے جس کی تم تحقیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بدون کیفیت کے معمولات لاشئے ہیں۔ ان واقعات کے بعد وہ چین سے بیٹھے اور سمجھ گئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہی بڑی دولت ہے۔ یہ دولت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔

دولتِ توفیق

اگر وہ تم سے توفیق سلب کر لیں اور تم ایک دفعہ بھی اللہ کا نام نہ لے سکو تو بتاؤ کیا کر لو گے۔

ع بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

سنبھلو کیا کیفیات لئے پھرتے ہو۔ تم اس غیر مقصود کی طلب میں مقصود کی بےقدری کر کے کہیں اس سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھنا۔ کیونکہ ایک صورت قہر نازل ہونے کی یہ بھی ہے کہ خدا کا نام لینے کی توفیق سلب ہو جائے۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے۔ کہ انہوں نے ایک دفعہ کلمہ توحید زبان سے نکالنا چاہا۔ مگر زبان نہ چلی اور سب باتوں میں زبان چلتی تھی مگر کلمہ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ یہ عارف تھے گھبرا گئے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا۔ کہ اس کا کیا سبب ہے۔ الہام ہوا کہ فلاں دن جس کو اتنے سال ہوئے۔ تم نے ایک بے جا کلمہ زبان سے نکالا تھا اور اب تک اس سے توبہ نہیں کی۔

آج اس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ کہ کلمہ کی توفیق سلب ہو گئی۔ اس گناہ سے توبہ کرو تو عذاب ٹلے۔ چنانچہ انہوں نے توبہ کی، توبہ قبول ہوئی اور یہ وبال رفع ہوا۔ حضرت! اس کو معمولی بات نہ سمجھئے۔ کہ آپ کو ذکر کی توفیق ہو گئی۔ واللہ یہ بڑی دولت ہے۔ ورنہ ہزاروں لاکھوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ جن کی زبان کو خدا نے توفیق ذکر سے بند کر دیا ہے۔

جیسے ایک حکایت ہے۔ کہ غلام اور آقا بازار کو گئے۔ راستہ میں مسجد آ گئی۔ غلام نمازی تھا، آقا بے نمازی۔ غلام نے نماز پڑھنے کے لیے آقا سے اجازت چاہی۔ اس نے اس کو اجازت دے دی اور خود مسجد کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ جب نماز ختم ہو گئی اور نمازی مسجد سے نکلنے لگے۔ تو آقا صاحب کو انتظار ہوا کہ اب غلام بھی آتا ہو گا۔ مگر وہ نہ آیا اور بہت دیر لگا دی۔ اس پر آقا نے جھلا کر پکارا۔ کہ میاں کہاں رہ گئے۔ آتے کیوں نہیں۔ غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتے۔ کہا کون نہیں آنے دیتا۔ کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا، وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔ صاحبو! یہ توفیق اور عدم توفیق ہی تو ہے۔ کہ غلام مسجد کے اندر نواب بنا بیٹھا ہے اور آقا صاحب باہر سیڑھیوں پر منتظر نوکر بنے بیٹھے ہیں۔

مگر آج کل ایسے مذاق کے بھی لوگ موجود ہیں جو بجائے اس کے کہ اس خذلان پر قلق کریں، فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کا بچھڑا ہاتھ سے چھوٹ کر مسجد میں گھس گیا۔ مؤذن جھلانے لگا کہ لوگ جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں۔ تو وہ بچھڑے والا جواب دیتا ہے کہ میاں جی کیوں بگڑتے ہو۔ جانور بے سمجھ تھا۔ مسجد میں آ گیا۔ بھلا کبھی تم نے ہمیں بھی یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کمبخت کے نزدیک مسجد میں جانا کہ مسجد لوگوں کا کام ہے۔ مگر ایسے نامعقولوں کو موت کے بعد اب معلوم

گا۔ یہاں وہ قابل خطاب نہیں ہیں۔

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ذکر اللہ بڑی دولت ہے۔ اس کی قدر کرو اور کیفیات کے درپے ہو کر اس کی بے قدری نہ کرو۔ مولانا رومیؒ نے اس پر ایک حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک سالک کو شیطان نے دھوکہ دیا کہ تم برسوں سے ذکر و شغل تہجد وغیرہ کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کوئی پیام ہے نہ سلام ہے۔ تو پھر تم ہی کیوں سر مارتے ہو۔ جب وہ پوچھتے تک بھی نہیں۔ اس دھوکہ کا اس کے ذہن میں کچھ جواب نہ آیا۔ تو اس رات اس نے ذکر و شغل و تہجد سب ترک کر دیا۔ سوتے ہوئے کوئی لطیفہ غیبیہ خواب میں آیا اور اس نے حق تعالیٰ کی طرف سے پوچھا۔ کہ کیوں صاحب آج ہم کو چھوڑ کر کیوں سو گئے۔ نہ ذکر کیا، نہ تہجد میں اُٹھے۔ اس نے وہی جواب دیا۔ جو شیطان نے دھوکہ میں پڑھایا تھا۔ کہ اُدھر سے تو کچھ پیام و سلام ہے ہی نہیں۔ پھر میں ہی کیوں سر ماروں۔ وہاں سے جواب ارشاد ہوا۔ ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست
واں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

کہ یہ اللہ اللہ کہنا خاص کر ایک دفعہ اللہ کہہ کر دوبارہ زبان سے اللہ نکلنا یہ ہمارا جواب ہی تو ہے۔ کہ ہاں ہم نے پہلا قبول کر لیا ہے۔ اگر پہلا قبول نہ ہوتا، بلکہ ناگوار ہوتا تو زبان بند کر دیتے اور ذکر کی توفیق سلب کر لیتے۔ کیوں کہ جس شخص کا دربار میں آنا بادشاہ کو ناگوار ہو اور بادشاہ صاحب قدرت بھی ہو تو وہ پہلی ہی دفعہ کان پکڑ کر اس کو نکال دیتا ہے۔

علامت قبول

حاجی صاحبؒ نے اس سے ایک مسئلہ مستنبط فرمایا ہے۔ کہ

جس طاعت کے ایک دفعہ کرنے کے بعد دوبارہ اس کی توفیق ہو جائے۔ تو سمجھو کہ پہلی طاعت قبول ہو چکی۔ یہ علامت قبول کی ہے اور گو یہ استنباط قطعی نہیں۔ مگر ظاہر عادۃ اللہ اور وسعت رحمت اسی کو مقتضی ہے۔ پس تغلیب رجا میں یہ بہت نافع ہے۔ جو کہ شرعاً مامور بہ ہے۔

لا یموتن احدکم الا و ھو یحسن الظن بربہٖ۔

مقصودِ بیعت

الغرض آج کل بیعت کی حقیقت و غایت میں عام طور سے غلطی ہو رہی ہے۔ لوگ مقاصد و غیر مقاصد میں فرق نہیں کرتے۔ نہ اعمال کا اہتمام کرتے ہیں۔ نہ اعمال پر روک ٹوک ہے۔ حالانکہ تعلق بیعت میں طرفین سے التزام بھی ہے۔ اطاعت کا اور معاہدہ ہے۔ اصلاح کا پھر بھی وہاں روک ٹوک نہیں۔ صرف وظائف کی بھرمار ہے اور اگر کچھ روک ٹوک ہے بھی تو صرف دو چار اعمال پر۔ جن کا ضروری ہونا سب کو معلوم ہے حالانکہ وہ باتیں زیادہ بتلانی چاہئیں۔ جن کی مخاطب کو ضرورت ہی معلوم نہیں۔ مگر ایسی باتیں کیوں کر بتلائیں۔ اُن کی ضرورت سے خود شیخ ہی منکر ہیں اور منکر اس لئے ہیں۔ کہ اُن سے خود کورے ہیں۔ اس لئے امام غزالی رح فرماتے ہیں۔ کہ اے عزیز! تمہاری اصلاح کی کیا اُمید ہو جب کہ تمہارے طبیب ہی مریض ہیں۔ صاحبو! بیعت ہونے کے بعد جن چیزوں پر روک ٹوک زیادہ ضروری ہے وہ اس قسم کی ہیں۔ کبر و عجب اضاعت حقوق العباد، حسد و بغض، فساد ذات البین وغیرہ۔ مگر آج کل ان امور پر مطلق روک ٹوک نہیں۔ حالانکہ پہلے زمانہ میں مشائخ کو اول اسی کا زیادہ اہتمام تھا۔ وظائف تو سال ہا سال کے بعد تعلیم کرتے تھے اور یہی نہیں کہ محض زبان سے ان امور پر روک ٹوک کریں۔ بلکہ

عمر فاروق@ون اردو

تدبیروں سے ان امراض کو قلب سے نکال لیتے تھے۔ مثلاً کسی کو زینت پرستی میں مبتلا دیکھا۔ تو اسے سڑکوں پر یا خانقاہ میں جھاڑو کرنا، جھاڑ و دینا بتلا دیا اور جس میں تکبر دیکھا۔ اس کو نمازیوں کے جوتے سیدھا کرنا تعلیم کر دیا۔ جن میں ایک جولاہے کے بھی جوتے تھے۔ جو اس متکبر کی رعیت کا جولاہا ہے۔ اس کے جوتے سیدھے کرتے ہوئے بس جگر ہی تو کٹ گیا اور دل پر آرہ ہی تو چل پڑا۔ مگر یہ حالت ایک دو دفعہ میں ہوتی ہے پھر افعال تواضع میں خاصیت ہے کہ ان سے قلب میں بھی تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ کرتے کرتے ہر قسم کی عادت ہو جاتی ہے۔

حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی رح کا قصہ میں نے بارہا بیان کیا ہے۔ غالباً سامعین اکثر اس سے واقف ہوں گے۔ کہ سلطان نظام الدین بلخی رح نے ان کے عجب کا کس طرح علاج فرمایا تھا۔ کہ اول ان کو حمام جھونکنے کی خدمت سپرد کی۔ پھر سال بھر کے بعد بھنگن سے کہا کہ ان کے سر پر ذرا سی اپنے ٹوکرے کی مٹی جھاڑ دے۔ جب وہ اس پر جھلائے۔ تو ایک مدت تک پھر یہی خدمت اور لی اور اس کے بعد مدت تک پھر یہی خدمت لی۔ پھر شکاری کتوں کی خدمت سپرد کی اور یہ کام اس شخص سے لیئے۔ جو گنگوہ کے پیرزادے بھی تھے اور قطب زادے بھی تھے۔ اس قسم کی خدمتیں لے کر پھر کہیں ذکر شغل بتلاتے تھے۔

اصلاحِ اخلاق

اے صاحب! اس قسم کی تعلیم کا تو آج کل کہیں پتہ بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اسی کی ہے۔ کیونکہ شیخ کو طبیب کی طرح ہونا چاہیئے۔ کہ ہر مریض کو ایک ہی نسخہ نہ دے۔ بلکہ نسخے بدلتا رہے۔ جیسا مریض دیکھے، ویسا ہی نسخہ بتلائے اور ایک مریض کو بھی ایک نسخہ نہ دے۔ بلکہ اس کے

لیئے بھی حسب ضرورت تبدل و تغیر کرتا رہے۔ مگر آج کل شیوخ کے یہاں بس ایک ہی طریقہ سب کے لیئے ہے۔ یہ طرز ٹھیک نہیں۔ بلکہ ہر شخص کے مناسب اس کے امراض کی تشخیص کے بعد جدا جدا تعلیم ہونا چاہیئے اور ان کو رات دن اعمال و اخلاق پر ٹوکنا چاہیئے اور جن اعمال کا دین ہونا عام طور سے معلوم ہے۔ اس کا اہتمام اس قدر زیادہ ضروری نہیں۔ بلکہ جن باتوں کا دینی ہونا لوگوں کو معلوم نہیں ان کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے۔ مثلاً اصلاح اخلاق کو آج کل دنیوی امور سے سمجھتے ہیں۔ اصلاح اخلاق کو دین نہیں سمجھتے مثلاً لوگوں کو اس کا اہتمام ہی نہیں۔ کہ ہمارے فعل یا قول سے کسی کو ایذا نہ پہنچے، نہ اس کو دین کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اتنا بڑا کام ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں،

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔

کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں حضور نے اس پر اسلام ہی کو موقوف فرمایا ہے۔ گو علماء نے اس میں تاویل کرلی۔ کہ مراد کمال اسلام کا موقوف ہونا ہے۔ مگر حضور کے الفاظ تو یہی ہیں۔ کہ مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں یعنی جو ایسا نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں۔ کیا ان الفاظ کا اطلاق کچھ اثر نہیں رکھتا۔ گو مراد وہی ہو۔ جو علماء نے فرمائی ہے۔

اخلاقِ نبویؐ

اب میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا کس درجہ اہتمام تھا۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک رات آپ حضرت عائشہؓ کے گھر تھے۔ کیونکہ ان کی باری تھی اور وہ رات شب برات کی تھی۔ حضورؐ کو نصف شب کے وقت حکم

ہوا کہ جنۃ البقیع کے مسلمانوں کے لیئے جا کر دُعا کریں. تو آدھی رات کو آپ اُٹھے۔ جس کی کیفیت حضرت عائشہؓ یُوں بیان فرماتی ہیں:۔

قام رویدا وفتح الباب رویدا ثم خرج رویدا ثم اغلقه رویدا۔

حضورؐ آہستہ سے اُٹھے۔ آہستہ آہستہ چلے۔ آہستہ ہی دروازہ کھولا۔ آہستہ ہی باہر تشریف لے گئے۔ آہستہ ہی اس کو بند کیا۔ ہر کام آہستہ کیا۔ تاکہ حضرت عائشہؓ کی آنکھ نہ کھل جائے۔ ان کو تکلیف نہ ہو۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ کون تھیں. حضورؐ کی عاشق تھیں۔ جن کا محبوب کے لیئے بزبانِ حال یہ قول تھا۔ ے

گر بر سر و چشم من نشینی ‏ ‏ ‏ ‏ نازت بکشم کہ نازنینی

اوّل تو عموماً بیوی کو شوہر سے ایسا تعلق ہوتا ہے۔ کہ اگر خاوند سوتی ہوتی کو جھنجھوڑ بھی دے۔ تب بھی اس کو ایذا نہ ہو۔ بلکہ راحت ہو۔ اور خصوص حضرات ازواج مطہرات تو حضورؐ کی سب سے زیادہ عاشق تھیں۔ اور بالخصوص اُن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ مگر اس تعلق پر بھی حضورؐ نے اُن کی نیند کا اس قدر خیال فرمایا۔ کہ سب کام آہستہ کیئے۔

مگر یہ تو عاشق تھیں۔ ان کو خبر کیسے نہ ہوتی۔ گو حضورؐ نے سامان ایسا کیا تھا۔ کہ ان کو خبر نہ ہو۔ مگر جب مکان حضورؐ سے خالی ہوا۔ تو حضرت عائشہؓ کے قلب نے حالتِ نوم ہی میں اس کا احساس کیا اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کُھلنے کے بعد جب حضورؐ کو نہ پایا تو بڑی پریشانی ہوئی۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا۔ کہ شاید آپ کسی بیوی یا باندی کے پاس چلے گئے۔ بالآخر پریشانی میں گھر سے نکلیں اور آپ کو جاتے ہوئے دیکھ کر بقیع کی طرف چلیں۔ دیکھا کہ حضور امت کے لیئے دعا فرما رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر اطمینان ہوا اور یہ واپس ہوئیں اور پیچھے پیچھے حضورؐ بھی واپس ہوتے اور راستہ میں

حضرت عائشہؓ کے قریب ہی آپ بھی پہنچ گئے۔ حضرت عائشہؓ نے اس خیال سے کہ حضورؐ کو معلوم نہ ہو، تیز تیز چلنا شروع کیا۔ حضورؐ کو خیال ہوا کہ یہ آگے آگے کون ہے۔ آپ نے بھی تیز چلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ بھاگنے لگیں اور حضورؐ سے پہلے اپنے گھر میں داخل ہو کر بستر پر لیٹ گئیں۔ مگر سانس پھولا ہوا تھا۔ اس کو کیونکر دباتیں۔ حضورؐ جو گھر میں تشریف لائے۔ تو آپ کو حضرت عائشہؓ کا سانس پھولا ہوا معلوم ہوا۔ فرمایا:۔

یا عائشة مالك حشيا رابية۔

یہ لمبا لمبا پھولا ہوا سانس کیوں آرہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے آگے آگے تم ہی بھاگی ہوئی آرہی تھیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ ہنس پڑیں تو حضورؐ نے فرمایا:۔

اتخافين ان يحيف الله عليك ورسوله۔

اسی طرح حضرت مقداد بن الاسود صحابیؓ فرماتے ہیں۔ کہ ہم چند آدمی بھوک کے پیاسے مدینہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اپنے ذمہ کر لیا۔ حضورؐ کے یہاں چند بکریاں پلی ہوئی تھیں۔ ان کا دودھ آپ نے ہم کو بتلا دیا۔ ہم سب بھی پی لیتے اور حضورؐ کے لئے بھی رکھ دیتے۔ حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں۔ کہ ایک رات حضورؐ کو مکان پر تشریف لانے میں ذرا دیر ہوئی۔ میں یہ سمجھا کہ شاید کسی نے آپ کی دعوت کر دی ہو گی۔ اس خیال سے میں نے آپ کے حصہ کا بھی دودھ پی لیا۔ پی تو لیا۔ مگر بعد میں خیال ہوا کہ اگر حضورؐ کی دعوت نہ ہوئی ہو اور حضورؐ بھوکے پیاسے رہے تو کیونکر ہو گی۔ بس یہ خیال آتا تھا اور مجھے بے چینی لگی۔ اب ہر چند کروٹیں بدلتا ہوں۔ مگر چین نہیں آتا۔ یہاں تک کہ حضورؐ بہت دیر میں تشریف لائے اور آہستہ کواڑ کھولے اور ایسا آہستہ سلام کیا جس

کو جاگنے والا سُن لے اور سونے والا نہ جاگے۔ اللہ اکبر کیسا عدل جامع بین حق اللہ وحقوق العباد تھا۔ کہ نہ تو سونے والوں کی اتنی رعایت کہ سلام ہی نہ کریں۔ کیونکہ احتمال اس کا بھی ہے۔ کہ شاید کسی عارض سے کوئی جاگ رہا ہو اور نہ اتنا غلو کہ زور سے اس طرح سلام کریں۔ کہ سب کی آنکھ کھل جائے۔

چنانچہ آج کل صُوفی اور سالکین بھی ان امور کی رعایت نہیں کرتے رات کو اُٹھتے ہیں تو زور کے ساتھ کھٹ پٹ چلتے ہیں۔ استنجا کے لیئے ڈھیلے بھی زور سے پھوڑتے ہیں۔ پانی بھی زور سے بھرتے ہیں۔ کلی بھی زور سے کرتے ہیں۔ آخر یہ کیا طریقہ ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا اُسوہ حسنہ کسی دوسری قوم کے لیئے ہے۔ کہ وہ اس پر عمل کریں اور تم عمل نہ کرو۔

پورا قصہ یہ ہے۔ کہ پھر حضورؐ اس برتن کی طرف چلے جس میں دودھ رکھا جاتا تھا۔ اس کو خالی پایا۔ تو آپؐ نماز میں مشغول ہو گئے اور نماز کے بعد حق تعالیٰ سے دُعا کی۔ کہ اے اللہ اس وقت جو مجھے کھانا کھلائے اس کو آپ بھی روزی دیجئے۔ اس وقت حضرت مقدادؓ سے نہ رہا گیا۔ اور اللہ کا نام لے کر بکریوں کے نیچے جا بیٹھے۔ تو دیکھا کہ حضورؐ کی دعا کی برکت سے سب کے تھن خوب بھرے ہوئے ہیں۔ تب بہت سا دودھ لے کر آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ نے پی لیا۔ تو ان سے کہا کہ تم بھی پیو۔ اس پر یہ بہت ہنسے۔ حضورؐ نے سبب پُوچھا تو سارا واقعہ سنایا۔ غرض حضورؐ کا تو یہ طریقہ تھا۔ مگر ہم کو اتباع نبوی کا ذرا اہتمام نہیں اور ایک مرض ہم میں یہ ہے۔ کہ کسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائیں گے۔ تو اس کو بے جگہ رکھ دیں گے۔ جس سے دوسروں کو تلاش میں پریشانی ہوتی ہے۔ چارپائی بچھائیں گے۔ تو بالکل راستہ میں۔ پھر اس کو وہیں چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے۔

چاہے رات کو کوئی اُلجھ کر ہی گر پڑے اور ہاتھ پاؤں یا سر ہی پھوٹ جائے اسی طرح جماعت کے بعد نفلوں کی نیت ایسی جگہ باندھیں گے۔ جس سے لوگوں کو چلنے پھرنے میں تکلیف ہو۔ کسی جگہ سے برتن میں کھانا آیا تو اب یہ نہیں ہوتا کہ اس کا برتن جلدی خالی کر دیں۔ بلکہ اسی میں کھانا شروع کر دیں گے۔ بلکہ کبھی روز تک اس کو محبوس رکھیں گے اور دوسرا شخص برتن مانگے تو کہتے ہیں کیا ہم رکھ لیں گے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ دیر کرنے میں یہ بھی اندیشہ ہے۔ کہ تم رکھ لو۔ یعنی رکھ کر بھول جاؤ۔ چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی کے برتن جلدی واپس نہ کیئے اور رکھ کر بھول گئے۔ پھر مہینوں تک وہ اپنے ہی گھر پڑے رہے۔ اگر مالک کو خود ہی یاد آ گئے تو وہ خود بلا سے لے جائے۔ ورنہ بس یہیں رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ باتیں کلفت کی ہیں یا نہیں؟ پھر اُن سے احتراز کیوں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح مریدوں کی عادت ہے کہ پیر کے ساتھ کسی جگہ جائیں گے۔ تو جماعت کی جماعت بیس پچیس آدمیوں کی ساتھ جائے گی اور وہ پیر بھی حضرت ہیں۔ جو اس لشکر کو ساتھ لیئے جا رہے ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے۔ کہ تم نے مرید کیا ہے یا لام بندی کی ہے کسی پہ چڑھائی کرو گے۔ اب میں کہتا ہوں۔ کہ جس شخص کے یہاں یہ بیس پچیس آدمی جا کر مہمان ہوں گے۔ کیا اس کو گرانی نہ ہو گی۔ پیر کی دعوت اور خدمت کو تو وہ فخر سمجھے گا۔ مگر اس لشکر کی خدمت وضیافت ضرور اس کو گراں ہو گی۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی ان تکالیف کی پرواہ نہیں ہوتی اور اُن کو جان جان کر ایذا دی جاتی ہے اور ذرا دل پہ چوٹ نہیں لگتی۔ اب اگر کوئی ان باتوں پر روک ٹوک کرے۔ تو وہ بدنام ہوتا ہے۔ کہ بڑے قانونی ہیں۔ ہر بات کے لیئے ان کے یہاں قانون ہے کہ یوں بولو۔ یوں اٹھو۔ یوں کھڑے ہو۔

مشائخ کا طرزِ تعلیم

اے صاحب! تم بزرگوں کا تذکرہ دیکھو تو معلوم ہو گا۔ کہ مشائخ کے یہاں زمانِ سابق میں اسی قسم کی تعلیم تھی اور ایسی ہی باتوں پر روک ٹوک تھی۔ میرے استاد فرماتے تھے۔ کہ ایک بزرگ کا معمول تھا۔ کہ جو شخص ان کے یہاں مہمان ہوتا۔ اس کے لیئے اندازے سے کچھ زائد روٹی سالن بھیجتے۔ پھر جب سالن روٹی بچ کر آتا تو دیکھتے۔ اگر تناسب سے بچا ہوتا۔ تب تو وہ اس کو اپنے سلسلہ میں داخل فرماتے۔ ورنہ صاف کہہ دیتے۔ کہ تمہاری طبیعت میں بے ڈھنگا پن ہے۔ ہم سے تم سے نبھاؤ نہ ہو گا۔

ایک حکایت اور سُنی گئی ہے کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء دہلوی کے یہاں دو شخص مرید ہونے آئے۔ وہ آپس میں مسجد کا حوض دیکھ کر کہنے لگے۔ کہ ہماری مسجد کا حوض اس سے بہت بڑا ہے۔ سلطان جی نے یہ گفتگو سُن لی۔ بُلایا اور پُوچھا کہ تمہارا حوض اس سے کتنا بڑا ہے کہا۔ حضرت! پیمائش تو معلوم نہیں۔ فرمایا اچھا جاؤ۔ اس حوض کی پیمائش کر کے لے جاؤ اور اس کو پیمائش کر کے آؤ۔ چنانچہ وہ گئے اور پیمائش کر کے واپس ہوتے اور عرض کیا کہ حضرت! ہمارا حوض ایک بالشت بڑا ہے۔ فرمایا تم تو کہتے تھے بہت بڑا ہے۔ ایک بالشت زیادہ کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے۔ جاؤ ہم تم کو بیعت نہ کریں گے۔ یہ مت سمجھنا کہ حضرت سلطان جی نے ان کو محروم واپس کر دیا۔ نہیں بلکہ اتنی بڑی دولت دے کر واپس کیا۔ جو تمام عمر کام آئے گی۔

وہ کیا؟ احتیاط فی الکلام کا سبق ایسا پڑھایا۔ جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔

عمر فاروق@ون اردو

محقق و غیر محقق کا فرق

یہی تو فرق ہے محقق و غیر محقق میں۔ کہ محقق دھتکارتا بھی ہے تو کچھ دے کر اور غیر محقق عمر بھر چپکارتا ہے۔ مگر محروم کا محروم رکھتا ہے۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ہے اور ان کا واقعہ سنا ہے کہ اُن کے پاس ایک بڑھیا آئی اور آکر فقر وغیرہ کی شکایت کی۔ آپ نے خادم سے فرمایا کہ اس سے کہہ دو خدا فضل کرے۔ مرید نے یوں کہا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ بس یہ بزرگ اس خادم کے سر ہو گئے کہ میں نے گا کب کہا تھا۔ تم نے یہ گا اپنی طرف سے کیوں لگایا۔ حضرت عذر کیا جائے تو یہ بات ٹوکنے کی ضرور تھی۔ کیوں کہ اس تغیر سے کلام کے معنی بدل گئے۔ صورتِ اولیٰ میں دعا تھی کہ اللہ فضل کرے اور اِس صورت میں پیشین گوئی ہو گی۔ کہ بے فکر رہو خدا فضل کر دے گا۔ اسی لئے اُن بزرگ نے سخت تنبیہ کی۔ کہ تم نے میری بات کو کیوں بدلا مجھے غیب کی کیا خبر۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑنا ظلم ہے۔ تو میں کہتا ہوں۔ کہ یہ ظلم نہیں بلکہ عدل ہے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ڈاکٹر و طبیب بیمار کی بد پرہیزی پر روک ٹوک کرتا ہے۔ یقیناً اس کو کوئی ظلم نہیں کہہ سکتا۔ ایسے ہی یہ بھی ظلم نہیں۔

ایک طبیب میرے دوست ہیں۔ وہ کہتے تھے۔ کہ میرے زیرِ علاج ایک بمبئی کا سیٹھ تھا۔ اس نے کوئی بد پرہیزی کی۔ مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے نبض دیکھنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا۔ کہ جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو علاج کیسے کروں۔ اس نے خوشامد شروع کی۔ میں نے کہا کہ اب تو میں دس ہزار روپیہ لے کر نبض دیکھوں گا۔ دوسرے تیسرے

دن وہ شخص دس ہزار روپے کے نوٹ لے کر آیا۔ کہ یہ تو نبض دیکھنے کے لیئے فیس ہے اور علاج کی فیس اس سے الگ دوں گا۔ مگر اُن دوست نے ہمت کی کہ یہ رقم واپس کر دی اور کہہ دیا۔ کہ مجھے تو تیرا علاج ہی منظور نہیں، دس ہزار کا ذکر محض تعبیر کے لیئے تھا، ستدید کے لیئے نہ تھا۔ تو حضرت اطباء جسمانی ہیں جو صاحبِ کمال طبیب ہیں۔ وہ بھی مریض کی بدعنوانیوں پہ ایسی سخت دارو گیر کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اطباء روحانی اُن کی خوشامد کریں، ہرگز نہیں۔ بلکہ اُن کو سب سے زیادہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان سے تعلق ہی محض اس واسطے ہوا ہے۔ کہ مرید اُن کی اطاعت کرے اور یہ اس کی اصلاح کریں۔

حضرت ذوالنون مصری ؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ کہ حضرت کا فلاں مرید شراب پی کر فلاں جگہ بدمست پڑا ہے۔ آپ کو محسوس ہوا۔ کہ یہ اس کو حقیر اور اپنے کو افضل سمجھتا ہے۔ اس کا یہ علاج کیا۔ کہ فرمایا جاؤ اس کو اُٹھا لاؤ۔ وہ جب تک وہاں رہے گا سلسلہ کی بدنامی ہے۔ اس میں اس کے تکبر کی اصلاح تھی۔ کہ جس کو اس نے حقیر سمجھا تھا۔ اسی کی خدمت اس کے سپرد کی۔ جب وہ اس کو لے کر چلا۔ رستہ میں جو ملتا تھا کہتا تھا۔ کہ یہ صوفیوں کا حال ہے۔ دونوں نے شراب پی ہے۔ دوسرا ابھی ہوش میں ہے۔ یہ اخفاء حالت کے لیئے اس کو لے کر چلا ہے۔

تو یہ طریقہ تھا پہلے بزرگوں کا۔ وہ اس طرح مریدوں کی اصلاح کرتے تھے۔ وجہ یہ کہ ان کو امر بالمعروف اور تبلیغ کی اہمیت کا علم تھا۔ آج کل افسوس ہے کہ ہم لوگ اس فریضہ کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے قلوب مخلوق کی ہیبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس لیئے ہم کو تبلیغ سے رکاوٹ ہے اور ہر شخص کو تبلیغ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ خواہ ہم کو کیسی ہی قدرت ہو اور دوسرا ہمارا ماتحت ہی کیوں نہ

ہو۔ رہا یہ کہ امر بالمعروف اور تبلیغ کسی عذر سے بھی معاف ہو جاتی ہے یا نہیں۔ سو اس کو عمل شروع کرنے کے بعد بتلاؤں گا۔ پہلے تم عمل شروع کر دو۔ اب دعا کیجئے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب سے مخلوق کی ہیبت نکال دے اور ہم کو تبلیغ و امر بالمعروف کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین۔ و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اشرف علی

۱۲ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ

ضرورت تبلیغ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغ و اشاعت اسلام کے بارے میں یہ وعظ ۲۰ رجب المرجب ۱۳۳۲ھ بروز جمعہ بعد از نماز مغرب تین گھنٹہ تک جناب دلدار خان صاحب کے مکان اشرف منزل کرنیل گنج کانپور میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

سامعین کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی۔ جناب مولوی احمد عبدالحلیم صاحب نے قلمبند فرمایا۔ مستورات کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔

تبلیغ میں کامیابی پر اضطراری خوشی کا مضائقہ نہیں۔ باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا۔ کہ ہم نے یوں کیا، تو کیا اچھا اثر ہوا، یہ مذموم ہے۔

بہرحال ہم کو کوشش کرنی چاہیئے اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کرنا چاہیئے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہیئے اور کامیابی پر اترانا نہ چاہیئے۔ کام شروع کر دو، اس کے سب راستے خود کھل جائیں گے۔ بقول مولانا رومیؒ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

(از حضرت حکیم الامتؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ و علیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد: فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

محرکِ بیان

ہر چند کہ یہ مضمون جو ان آیات میں مذکور ہے۔ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہر وقت میں اس کی ضرورت ہے۔ مگر اس وقت ایک خاص محرک اس کے بیان کا پایا گیا ہے۔ اس لئے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہ محرک یہ ہے۔ کہ اس وقت ایک دار (یعنی مکان) کی بنا مکمل ہوئی ہے اور اس آیت میں جو مضمون ہے۔ وہ بھی ایک دار ہی کے متعلق ہے اور اس پر تنبیہ کی اس لئے ضرورت ہوئی۔ کہ تنبیہ ہمیشہ ایسے ہی امور پر کی جاتی ہے جن کی حاجت ہوتی ہے اور حاجت کا مدار حالت پر ہوتا ہے۔ یعنی جیسی حالت ہوگی ویسی ہی حاجت ہوگی اور حالت مشاہدہ سے معلوم ہو سکتی ہے

ترکِ مُضر

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ ہماری وہ حالت کیا ہے۔ جس کی اصلاح اور علاج پر تنبیہ کی ضرورت ہے۔ سو وہ حالت یہ ہے کہ ہم کو غیر ضروری امور میں اشتغال غالب ہے اور اس حالت کا نہایت مضر ہونا ظاہر ہے کیونکہ جب غیر ضروری امور میں اشتغال ہوگا۔ تو لازم ہے کہ ضروری امور میں لاپروائی ہوگی اور ضروری امور میں لاپروائی کا انجام بجز خسارہ کے اور کیا ہوگا

اس آیت میں ہم کو یہی تعلیم کی گئی ہے کہ ضروری امُور کی طرف رغبت کرو اور غیر ضروری امور سے زیادہ دل نہ لگاؤ۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کی ہم پر کیا رحمت و رأفت ہے۔ کہ اُن کو ہر وقت ہماری اصلاح کی طرف توجہ ہے۔ چنانچہ ان آیات میں ہماری اس مرض کا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے علاج کا ذکر کیا گیا ہے اور سبحان اللہ یہ کیسی رحمت ہے کہ صرف غیر ضروری امور پر تنبیہ فرما کر محض ان سے بچنے ہی کا امر نہیں فرمادیا۔ بلکہ وہ امُور بھی بتا دیتے ہیں جن کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی چیز سے بچانا ایک تو یہ ہے۔ کہ مخاطب کو اس کی ضد کی طرف متوجہ کردیا جاوے۔ اور ایک یہ ہے کہ اس فعل کی صرف بُرائی بیان کردی جاوے۔ مثلاً ایک طبیب کسی بد پرہیزی کرنے والے کو جو سنکھیا کھاتا ہے یا افیون کھاتا ہے یہ بتادے کہ سنکھیا نہ کھایا کرو اور یہ نہ بتاوے کہ پھر اُس کے چھوڑنے کے بعد یہ مریض کیا کھاوے۔ تو یہ تعلیم ناقص ہے۔ کامل طبیب وہ ہے۔ جو سنکھیا و افیون سے ممانعت کر کے کوئی ایسی شئے بتلادے جس میں ضرر تو کچھ نہ ہو اور سنکھیا و افیون کے منافع موجود ہوں۔

چنانچہ یہاں حق تعالیٰ کی یہ رحمت نمایاں ہے۔ کہ اس بد پرہیزی

کی مضرت بتانے کے ساتھ وہ ضروری چیز بھی بتلا دی جسے اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ مصلح کا فرض ہے۔ کہ مضر پر توجہ دلا کر اس کے بعد نافع پر بھی تنبیہ کر دے۔ اس واسطے کہ انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا کرتا۔ وہ کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنے واسطے ضرور تلاش کر لیتا ہے اور وہ مشغلہ نافع ہوتا ہے یا مضر یا نہ نافع ہوتا ہے نہ مضر۔ بلکہ عبث ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ عبث اس کو کہتے ہیں۔ جو نہ نافع ہو نہ مضر یعنی لغو اور مالایعنی تو اگر اصلاح میں صرف اسی پر اکتفا کیا جاوے کہ یہ کام نہ کرو یا نہ کھاؤ۔ اور نافع پر تنبیہ نہ کی جاوے۔ یعنی یہ نہ بتایا جاوے کہ پھر کیا کرو اور کیا کھاؤ تو اس صورت میں بھی ممکن ہے۔ کہ مخاطب اس طبعی عادت کے سبب اس مضر چیز کے ترک کے ساتھ کسی لغو میں مبتلا ہو جاوے۔ پھر اس حالت کا یہ انجام ہوگا۔ کہ پہلے تو وہ عبث و مالایعنی میں مبتلا ہوگا اور تجربہ کی بنا پر پھر شدہ شدہ کسی مضر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس لیئے کہ ابتلاء بما لا یعنی کا اکثر انجام ابتلا بما یضرہٗ ہی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مالایعنی شدہ شدہ امر مضر تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی واسطے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔

(یعنی لایعنی امور کا ترک کر دینا آدمی کے حسن اسلام سے ہے) اور لایعنی کے معنی ابھی مذکور ہوتے ہیں۔ کہ عبث و لغو کو لایعنی کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز نہ نافع ہو نہ مضر، وہ لایعنی ہے۔ اسی کے ترک کو حضور نے حسن اسلام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا:۔

من حسن اسلام المرء ترك ما یضرہٗ۔

کہ مضر کا ترک کر دینا حسن اسلام سے ہے۔ حالانکہ مضر کا ترک کر دینا یقیناً حسن اسلام ہے۔ مگر حضور نے بجائے ما یضرہٗ کے مالایعنی فرما کر یہ بتلایا

کر جو عبث ہے۔ وہ واقع میں مضر ہی ہے۔ تو گویا ترکِ نافع کی دو صورتیں ہوئیں۔ ایک ارتکابِ مضر اور ایک خلو عن الشغل المفید۔ اور یہ دوسری قسم اپنے مآل کے اعتبار سے پہلی ہی قسم میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فقط مضر کا ترک کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ نافع میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مشغلہ ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو دوسرے مشغلہ سے روک سکتا ہے۔ ورنہ بغیر مشغلہ کے مضر سے رکا رہنا ناپائیدار ہو گا۔ کیونکہ چند روز تک تو نفس صبر کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر کسی نہ کسی مشغلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور وہ اکثر مضر ہی ہوتا ہے۔ "چنانچہ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ تم نفس کو مشغول کر لو۔ قبل اس کے کہ وہ تم کو مشغول کر لے۔"

یعنی اگر تم نے نفس کو کسی کام میں نہ لگایا۔ تو وہ خود تمہارے لیئے کوئی دھندا نکال لے گا۔ وہ دھندا کیا ہے۔ اولاً وساوس و خطرات، پھر ثانیاً معاصی و منکرات اور نفس کی یہ اُدھیڑ بُن اسی وقت تک ہوتی ہے، جب تک وہ کچھ نہیں کرتا۔ ورنہ کام میں لگ جانے کے بعد خطرات نہیں آتے۔ دیکھئے ایک کارڈ لکھتے وقت کیا حال ہوتا ہے۔ اُس وقت تک ایک بھی خطرہ نہیں آوے گا۔ تو اس کا راز کیا ہے۔ راز یہ ہے کہ نفس کسی وقت بیکار نہیں رہنے پاتا۔ اگر اس کے لیئے کوئی مشغلہ نہ تجویز کیا جاوے۔ تو وہ خود اپنے لیئے کوئی شغل تجویز کر لیتا ہے۔ پس کارڈ لکھتے وقت چونکہ اپنے نفس کو ایک شغل میں لگا دیا ہے۔ اس لیئے کسی اور چیز کی طرف اس کو توجہ نہیں ہوتی اور نماز وغیرہ میں جو وساوس آتے ہیں۔ تو اکثر اس کا سبب یہی ہے کہ ہم لوگ نفس کو شغل صلوٰۃ میں نہیں لگاتے۔ ورنہ وساوس ہرگز نہ آئیں یا بہت کم آئیں۔ غرض جب یہ نفس بدون کسی شغل کے چھوڑا جاتا ہے تو یہ خود اپنا کوئی شغل تجویز کر لیتا ہے۔

شرارت نفس

اور یہ ظاہر ہے کہ نفس جو مشغلہ اپنے لیئے خود تجویز کرے گا۔ وہ شر ہی ہوگا۔ کیونکہ نفس کا اصلی میلان شر ہی کی جانب ہے۔ دلیل اس کی قرآن مجید کی آیت ہے:

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

اس میں حضرت یوسف علی نبینا و علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے۔ دیکھیئے انہوں نے یوں نہیں فرمایا

ان النفس لامارۃ بالسوء و امارۃ بالخیر۔

یعنی نفس کی دو قسمیں نہیں بتائیں۔ ایک امارہ بالسوء اور ایک امارہ بالخیر بلکہ یہ بتایا کہ نفس کی ایک ہی قسم ہے۔ کہ وہ امارہ بالسوء ہے۔ یعنی نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم کرنے والا ہے۔ مگر جب خدا تعالیٰ رحم فرمائیں۔ یعنی جب خدا کی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ تو اس وقت اس عارض قوی کی وجہ سے نفس برائی کا حکم نہیں کرتا اور جب یہ رحمت متوجہ نہیں ہوتی۔ تو پھر بدستور اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ یعنی برائی کا امر کرنے لگتا ہے۔ بہر حال استثناء سے نفس کی کوئی جداگانہ قسم بتلانا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ امر بالسوء کے اوقات میں سے ایک وقت کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے۔ حاصل یہ ہوا۔ کہ ان النفس لامارۃ فی کل وقت الا ما رحم ربی و ما مصدریۃ ای وقت رحمۃ تعالیٰ علیہا۔

شاید کسی کے ذہن میں یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے۔ کہ ان النفس لامارۃ بالخیر الا ما امر بالسوء۔ تو کیا حرج تھا۔ جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ معنیٰ نہ پیدا ہوتے، جواب ہوتے۔ کیونکہ محاورہ یہ ہے

کہ مغلوب حالت کو غالب حالت سے استثناء کیا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر زیادہ جماعت نے کھانا کھالیا۔ تو یُوں کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے کھانا کھالیا۔ مگر زید و عمرو نے اس جملہ سے یہ سمجھا گیا۔ کہ جماعت کثیر کھانا کھا چکی اور قلیل یعنی دو شخص باقی رہ گئے اور اگر اسی کو یُوں تعبیر کریں۔ کہ فلاں فلاں نے کھانا نہیں کھایا۔ مگر سب نے تو محاورہ کے اعتبار سے یہ صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ مستثنیٰ مغلوب نہ تھا۔ بلکہ مستثنیٰ منہ پر غالب تھا۔ تو معلوم ہوگیا کہ غالب حالت سے مغلوب حالت کو استثناء کیا جاتا ہے۔ اگر کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے اور اگر نہ کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے۔ بہر حال غالب حالت کا اعتبار استثناء میں ضروری ہے۔

جب یہ سمجھ میں آگیا۔ تو اب سمجھیئے۔ کہ لامارۃ بالسوء یہاں یہ مستثنیٰ منہ ہے اور الا مارحم ربی مستثنیٰ ہے۔ اس لیئے بقاعدہ مذکورہ غالب حالت یعنی اُمر بالسوء کو مستثنیٰ منہ اور مغلوب یعنی عدم امر بالسوء کو مستثنیٰ بنانا چاہیئے سو قرآن میں ایسا ہی ہے۔ کیونکہ غالب صفت نفس کی امارۃ بالسوء ہی ہے۔ واقعی قرآن کے سمجھنے کے لیئے ضرورت ہے۔ کہ زبان کا بھی ذوق ہو اور عادات و محاورات میں بھی کامل دخل ہو۔ محض علوم عقلیہ سے قرآن حل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ عرف و عادات کو حکم بنا کر تب قرآن کو دیکھنا چاہیئے۔ ورنہ غلطی ہو جانے کا قوی احتمال بلکہ یقین ہے۔ کیونکہ قرآن کا نزول عرف و محاورات کی رعایت کے ساتھ ہوا ہے۔

بہر حال نفس کی حالت غالبہ امر بالسوء ہے۔ اس لیئے جب اس کو کسی کام میں نہ لگایا جاوے گا۔ تو یہ اپنے لیئے خود مشغلہ تجویز کرلے گا اور جو مشغلہ یہ خود اپنے لیئے تجویز کرے گا۔ چونکہ اس میں غلبہ ہے شر کا۔ اس لیئے وہ اکثر بُرا ہی ہوگا اور مضر ہی کو تجویز کرے گا۔ اسی واسطے مالایعنی کے ترک کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن اسلام فرمایا۔

کیونکہ مضر کو تو ہر شخص مضر سمجھتا ہی ہے۔ خفا صرف لالعینی میں ہے۔ پس مقصود حضورؐ کا یہ ہے۔ کہ مضر کو چھوڑنے کے بعد لالعینی سے بھی بچے اور وہ تجربہ سے موقوف ہے۔ اس پر کہ مالعینی میں نفس کو لگا دے۔ پس اس ترک کے لیئے یہ فعل بھی لازم ہے۔ بہر حال نفس کا میلان الی الشر تو قرآن سے ثابت ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے۔ کہ نفس جب خالی ہوگا۔ تو معصیت ہی تجویز کرے گا اور جب یہ بے کار ہو گا۔ تو کسی نہ کسی بلا ہی میں مبتلا ہو گا۔ تو ان دونوں مقدموں سے اس کی ضرورت ثابت ہو گئی۔ کہ ترکِ مضر کے بعد اشتغال بالنافع ضروری ہے۔ سو قرآن مجید کی تعلیم کا یہی حاصل ہے۔

اشتغال بالنّافع

اب سوال یہ رہ گیا کہ نفس کو کسی خیر میں ہر وقت کیسے مشغول رکھا جا سکتا ہے۔ جو وہ اس بلا لالعینی یا مضر سے بچے اور وہ کون سا دھندا ہے۔ جس میں ہر وقت لگایا جا سکے۔ کیونکہ جتنے دھندے ہیں۔ ان میں ہر کام موقت ہے۔ مثلاً کھانا، پینا، سونا اور نماز اور دوسری عبادات سب موقت ہی ہیں۔ جو کام بھی ہے وہ خاص وقت میں ہے۔ تمام اوقات کو کوئی شغل محیط نہیں اور نفس کو بچانے کے لیئے ضرورت ہے شغل غیر موقت کی۔ جو ہر دم ہو سکے۔ کیوں کہ اس کا خاصہ یہ ہے۔ کہ جہاں ذرا بھی خالی ہوا اور بے ہودگی میں مبتلا ہوا۔ تو وہ کام کون سا ہے۔ جو ہر وقت کیا جا سکے؟

صاحب! شریعت میں ایسا شغل بھی ہے اور وہ بہت ہی سہل کام ہے اور بحمد اللہ قرآن میں اسے بھی بتلا دیا گیا ہے۔ وہ کیا ہے وہ ذکر ہے۔ سو نماز، روزہ، حج سب کو تو موقت بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں تو

توقیت صلوٰۃ کی تصریح ہے خمس صلوٰت اور قرآن میں گو تصریح نہیں، مگر اشارہ ہے اور روزہ کو تو قرآن ہی میں موقت کر دیا گیا ہے۔ ایاماً معدودات اور اسی طرح حج میں بھی اشہر معلومات فرمایا گیا ہے۔ مگر ذکر کو کہیں موقت نہیں کیا گیا۔ نہ قرآن میں نہ حدیث میں۔ بلکہ ارشاد ہے :۔

اذکروا اللہ ذکراً کثیراً۔

اور ارشاد ہے۔ واذکر اسم ربک۔ اگر کوئی کہے کہ ذکر بھی تو موقت ہے۔ دیکھیئے قرآن مجید میں اس کا بھی وقت بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اذکروا اللہ کے بعد ارشاد ہے :۔

سبحوہ بکرۃ واصیلا۔

یعنی صبح و شام تسبیح کرو۔

جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض بھی محاورہ نہ جاننے ہی سے پیدا ہوا۔ محاورہ یہ ہے۔ کہ جب ایک جنس کی دو نوعوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ تو مراد اس سے احاطہ و استیعاب اس جنس کا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہیں کہ میں نے تلخ و شیریں چکھا ہے اور ابتدا و انتہا دیکھی ہے اور چھوٹا بڑا مجھے جانتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو اس سے بالبداہتہ استیعاب ہی مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں صبح و شام سے بھی یہی مراد ہے۔ کہ رات دن برابر ذکر کرو۔ یعنی کوئی وقت بھی ذکر سے خالی نہ ہو۔ تو بکرۃ واصیلا کے معنی فی کل وقت ہوتے۔

اقسام ذکر

اب یہ بات رہ گئی۔ کہ ہر وقت کیسے ذکر ہو۔ تو ہر وقت ذکر ہونے کی صورت یہ ہے۔ کہ محل ذکر میں تعمیم لی جاوے۔ یعنی خواہ قلب سے ہو خواہ زبان سے ہو۔ سو تعمیم محل کے بعد دوام ممکن ہو گیا۔

اور پھر اگر کوئی کہے۔ کہ قلب سے ذکر کے کیا معنی اور کیا اس کا شریعت میں کچھ ثبوت ہے۔ تو میں کہتا ہوں۔ کہ حدیث نے اس اشکال کو بھی صاف کر دیا ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ :۔

کان صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ فی کل احیانہ۔

کہ آپ ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور کل احیان میں اوقاتِ بول و براز و قضائے حاجات بھی شامل ہیں اور ظاہر ہے۔ کہ بول و براز کے موقع پر زبان سے ذکر و تلاوت مکروہ ہے۔ بس کل احیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضورؐ ایسے احوال اور ایسے مواقع میں قلب سے ذکر کیا کرتے تھے۔

دوسرے یہ اذکر واللہ میں واذکر اسم ربک میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے۔ خواہ لسانی ہو یا اور کچھ۔ نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے۔ ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ ذکر کے اصل معنی ذکرِ قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے وہاں قرائن سے اس پر محمول کیا گیا ہے۔ کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یاد۔ اب دیکھ لیجئے کہ یاد کس کا فعل ہے زبان کا یا قلب کا؟ پس اب ذکر قلبی کے لئے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ ذکر کا لسانی ہونا محتاج دلیل ہو گیا۔

اور میں نے یہ مضمون خصوصیت سے اس لئے بیان کر دیا کہ بعض خشک لوگوں کو ذکر قلبی میں کلام ہے۔ بہرحال یہ ہے وہ کام جو ہر وقت کے کرنے کا ہے۔ اگر زبان تھک جائے تو قلب سے ذکر کرو اور اگر زبان سے بھی برکت حاصل کرنا ہو تو زبان سے بھی کرو۔ بس ان کی یاد ہونی چاہیئے پھر خواہ الفاظ کے واسطے سے خواہ مذکور کے تصور سے۔ مقصود تو یہ ہے کہ غفلت نہ ہو۔ جو طریق تمہیں سہل معلوم ہو اس طریق سے کرو۔

اور ذکر کے متعلق بعض اہل علم کو ایک اور شبہ ہو گیا ہے۔ وہ

یہ کہ انہوں نے واذکر اسم ربک میں لفظ اسم کو زائد کہا ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کی سہل توجیہ یہ ہے۔ کہ ذاکر دو قسم کے ہیں۔ ایک مبتدی اور ایک منتہی۔ تو اسم ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور۔ اس لیئے یوں کیوں نہ کہا جاوے۔ کہ مبتدی کے لئے تو اذکر اسم ربک ہے اور منتہی کے لیئے وتبتل الیہ تبتیلا ہے۔ کیوں کہ مبتدی کے لیئے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے۔ کہ محبوب کا نام اس کی زبان پر آجائے یا قلب میں یہ نام آجائے۔ ذکر لفظی کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک ذکر لفظی زبان سے، ایک قلب سے۔ ایک ذکر منطوق ہے اور ایک ذکر متصور۔ منطوق تو ظاہر ہے۔ متصور مثال سے سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص الحمد للہ رب العلمین کے معنی نہ جانتا ہو اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کا دل میں خیال کرے اور زبان سے نہ ادا کرے۔ تو یہ محض الفاظ کا تصور ہوگا اور معنی سے اسے کچھ بھی علاقہ نہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ معنی ہی نہیں جانتا۔ اس درجہ کو حدیث النفس اور کلام قلب کہتے ہیں۔ شاعر اسی کو کہتا ہے ؎

ان الکلام لفی الفؤاد وانما
جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

سو الفاظ متخیلہ کا درجہ بھی کلام لفظی ہی کا درجہ ہے۔ کیوں کہ ان میں ترکیب و تعاقب سب کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال ذکر ہونا چاہیئے۔ اب ذکر کی اقسام چند ہو گئیں۔ ایک لسانی، ایک قلبی۔ اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی۔ اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقت نہیں۔ بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقت ہے۔ کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول و براز و جماع و مواقع قاذورات میں زبان سے

ذکر کرنے کی ممانعت ہے۔ البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں۔ ہر وقت اجازت ہے۔ یہ بیشک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقت ہے۔

پس ذکر قلبی ہی اپنی دو نوں قسموں کے ساتھ ایک ایسا شغلہ ہے۔ جو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ سونے کے وقت بھی ہو سکتا ہے گو سونے کے بعد نہ ہو۔ سو اس حالت میں انسان مکلف ہی نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ کھانے کے وقت بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ بعض وقت یہ ذکر لسانی سے بڑھا ہوا ہے۔ مثلاً جہاں ریا ر کا شبہ ہو یا ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے۔ مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا۔ تو اس کے لیئے یہ بہتر ہے۔ کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے ذکر کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل ہے۔ مگر مہربانی کر کے اس مسئلہ کو نماز کی قرآت میں متعدی نہ کر لیجیئے۔ کیونکہ نماز کی قرآت و تکبیرات و تسبیح و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان سے ادا نہ کرے۔ تو نماز نہ ہو گی۔ ہاں گونگا البتہ معذور ہے۔ اس کی نماز محض تصور ہی سے ہو جاوے گی۔

تین چار سال کی بات ہے۔ کہ ایک بزرگ (صورۃً بزرگ نہ معنیً) قنوج میں تشریف لائے تھے۔ بے چارے بڑے جاہل جو لوگ اُن کے مرید ہونے آتے، اول تعلیم اُن کی یہ ہوتی تھی۔ کہ نماز میں قرآت دل ہی دل میں پڑھا کرو اور یہ بھی ہدایت کر دیتے تھے۔ کہ یہ بات کسی پہ ظاہر نہ کرنا۔ چنانچہ بہت سے لوگ اُن کے بہکانے میں آ گئے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اس سے تو وہ نماز نہ پڑھتے تو بہتر ہوتا۔ کیونکہ اپنے کو بے نمازی سمجھتے اور شاید کبھی قضا کر لیتے اور اب تو بے چاروں نے محنت بھی کی اور پھر نماز نہ ہوئی اور نہ قضا کی طرف التفات۔ بڑی مدت کے بعد کسی ترکیب سے بعضے لوگوں کو اس کا پتہ لگا تو ان کی غلطی پر عام لوگوں کو متنبہ کیا گیا اور اُن

کو وہاں سے نکالا گیا۔ اسی لئے طریق باطن میں بہت ضرورت ہے شریعت کی۔ ورنہ ممکن ہے کسی کو کوئی یہ رائے دے دے۔ کہ جب ذکر قلبی افضل ہے۔ ذکر لسانی سے تو پھر نماز کو بھی دل میں کیوں نہ پڑھ لیا کریں۔ یاد رکھو اس طرح سے نماز نہ ہو گی۔

غرض ذکر قلبی کی فضیلت سے وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جہاں احکام دینیہ مثلاً نماز وغیرہ یا احکام دنیویہ۔ مثلاً طلاق نکاح عتاق وغیرہ کا تعلق ہے کہ یہ امور ذکر قلب سے صحیح نہیں ہو سکتے۔ مثلاً دل ہی دل میں نکاح کر لے تو نکاح نہیں ہو گا۔ ایسے ہی دل ہی دل میں طلاق دے تو طلاق بھی پڑے گی اور مراد اس سے وہ صورت نہیں۔ کہ چپکے چپکے زبان پر طلاق آ گیا، اور اس سے زبان کو حرکت بھی ہوئی۔ تو گو کسی نے نہ سنا ہو۔ اس صورت میں تو طلاق پڑ جاوے گی۔ کیونکہ یہ تو تلفظ باللسان ہی ہے۔ گو بالجہر نہ سہی۔ باقی اگر فقط دل میں طلاق کو سوچ لیا، زبان بالکل نہیں ہلی۔ تو اس سے طلاق نہیں پڑے گی۔ کیونکہ یہ عقود تکلم باللسان کے ساتھ متعلق ہیں۔ پس اس کی استثناء کے بعد جو اور امور رہ گئے ہیں جن میں تکلم شرط نہیں ہے۔ ان کے متعلق یہ قاعدہ عام ہے کہ وہاں ذکر قلب بھی معتبر ہے۔ بلکہ بعض کے لیئے اور بعض جہات سے یہ افضل ہے۔

افضل الاذکار

اور سب سے افضل یہ ہے۔ کہ ذکر قلب اور ذکر لسانی دونوں کو جمع کیا جائے۔ اس اعتبار سے ذکر کے تین درجے ہوئے۔ ایک تو وہ جس میں صرف زبان کو حرکت دی جائے اور قلب متوجہ نہ ہو۔ یہ درجہ سب سے کم ہے۔ دوسرا درجہ وہ جس میں زبان کو حرکت نہ دی جائے صرف قلب سے ذکر کیا جائے۔ یہ پہلے درجہ سے بڑھ کر ہے تیسرا درجہ

یہ ہے کہ زبان کو بھی حرکت دی جائے اور قلب کو بھی متوجہ کیا جائے۔ یہ سب سے بڑھ کر اور افضل ہے۔

لیکن میں یہ پھر کہتا ہوں کہ بعض حالتوں میں دوسرا درجہ تیسرے درجہ سے بھی افضل ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی وقت وہ ذکر جو محض قلب سے ہو، افضل ہوتا ہے اس ذکر سے جو قلب و زبان دونوں سے ہو وہ کیسے؟ وہ اس طرح جیسے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے۔ جن کے ہم غلام ہیں اور جن کے ارشاد ہی سے سید ھا راستہ نظر آتا ہے۔ سو یہ مسئلہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے۔ جیسا کہ عنقریب آتا ہے۔

اور مسئلہ بتلانے کے ساتھ خود حضورؐ ہی نے اس کی حکمت بھی بتا دی ہے۔ گو حکمت یا علت بتانا حضورؐ کا فرضِ منصبی نہ تھا۔ آپؐ کا منصب صرف حکم کا بتلانا ہے۔ مگر آپ کا تبرع و احسان ہے۔ کہ کہیں کہیں حکمت بھی نمونہ کے طور پر بتا دیتے ہیں جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو کوئی کام بتا دے اور نوکر کا تمیز دیکھ کر اس تجویز کی حکمت بھی بتا دے۔ تو گو یہ آقا کا فرض نہ تھا کہ وہ حکمتیں بتا دے۔ کیونکہ نوکر کو حکمت سے کیا واسطہ۔ اس کے ذمہ تو تعمیلِ حکم ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ نوکر کس بات کا ہے۔ مگر یہ اس کا تبرع و احسان ہے۔ کہ کسی کام کی اسے حکمت بھی بتا دے۔ اسی طرح حضورؐ کے ذمہ بھی بیان حکمت لازم نہیں۔ اسی لئے جہاں کہیں آپؐ نے حکمت بتائی ہے۔ وہ بطور نمونہ کے ہے۔ جس سے مقصود یہ بتلانا ہے۔ کہ ہمارے احکام میں حکمتیں ضرور ہیں۔ چنانچہ دیکھو۔ بعض بعض نمونہ کے طور پر تم کو بتا دی گئی ہیں۔ مگر سب حکمتیں تم کو نہیں بتلائی گئیں۔ پس جہاں کوئی حکمت حکم شرعی میں تمہیں نہیں معلوم ہوئی۔ وہاں بھی سمجھ لو کہ حکمت ضرور ہے۔ چنانچہ جن احکام کی حکمتیں حضورؐ نے نہیں بتلائیں۔ ان کو اہل اللہ نے بڑی مقدار تک حل کر دیا

ہے۔ غرض احکام کا دار و مدار حضورؐ کے ارشاد پر ہے۔ چاہے حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔

بہر حال سرسری نظر میں یہ ایک نیا دعوٰی ہے۔ کہ ذکر قلب بعض اوقات مطلوبیت و افضلیت میں مجموعہ ذکر لسانی وقلبی سے بھی بڑھ کر ہے۔ مگر اس کا مدلول نص ہونا بھی ظاہر ہوا جاتا ہے۔ سنیئے! حدیث شریف میں ہے:۔

اذا غلب احدکم النعاس وھو یذکر اللہ فلیرقد او کما قال۔

یعنی حضورؐ فرماتے ہیں۔ کہ جس وقت تک نیند نہ آوے۔ اس وقت تک تو نفلیں، تسبیح اور ذکر وغیرہ سب کچھ کرو اور جب نیند کا غلبہ ہونے لگے تو سو رہو فلیرقد امر کا صیغہ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ اس حالت میں ذکر لسانی بند کر دینا ضروری ہے۔ آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں:۔

لعلہ یستغفر فیسب نفسہ،

یعنی ممکن ہے کہ وہ قصد تو استغفار کا کرے اور بجائے استغفار کے اپنے آپ کو کوسنے لگے۔ کیونکہ اس وقت مارے نیند کے ہوش ودرست نہیں رہتا۔ لامحالہ کہے گا کچھ اور نکلے گا کچھ۔ تو شاید دعا کے بدلے بددعا نکلے۔

چنانچہ علماء نے اس کی تفسیر میں مثال کے طور پر کہا بھی ہے۔ کہ مثلاً وہ کہنا چاہتا ہے۔ اللّٰھم اغفرلی۔ کہ اے اللہ! مجھے بخش دیجئے۔ تو ممکن ہے کہ بجائے اس کے اللّٰھم اعفرلی عین مہملہ سے زبان سے نکلے۔ یعنی اے اللہ! مجھے تباہ کر دیجئے، برباد کر دیجئے، مٹی میں ملا دیجئے۔ صرف ایک نقطہ کے گھٹنے بڑھنے سے معنی کس قدر بدل گئے۔ تو یہ حدیث اس سے کہ جب نیند کا غلبہ ہو تو زبان سے ذکر نہ کرے۔ پس اس وقت زبان

سے ذکر ممنوع ہے۔

اور اس سے پہلے یہ نقل گزر چکی ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ فی کل احیانہ۔

کہ آپ ہر وقت ذکر کرتے تھے اور ہر وقت میں نیند کا وقت بھی داخل ہے اور ظاہر ہے۔ کہ نیند کی حالت میں اس سنت پر ذکر لسانی کے طریق پر عمل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیئے دونوں روایتوں کو یوں جمع کریں گے۔ کہ غلبۂ نیند کے وقت ذکر لسانی کی تو ممانعت ہے۔ خواہ محض ہو یا قلبی کے ساتھ اور ذکر قلبی کی اجازت ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ بعض وقت ذکر قلبی محض افضل ہے جمع بین ذکر اللسان والقلب سے کیونکہ جب ذکر لسانی سے ممانعت ہو گئی۔ تو اب یا تو بالکل ہی ذکر سے محروم رہو یا محض دل دل سے یاد کرتے رہو۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت یقیناً بہتر ہے۔ کیونکہ صورت اولیٰ میں پوری محرومی ہے ذکر سے اور اس صورت میں کچھ تو ذکر ہوتا رہے گا اور قطعی محرومی سے یقیناً وہ صورت بہتر ہے۔ جس میں فی الجملہ ذکر باقی ہے اور ایسے وقت میں یہ بقا ذکر قلبی محض سے ممکن ہے۔ اب اس ذکر کو ذکر نہ کہنا حرمان عن البرکۃ کا مشورہ دینا ہے۔

تو بہر حال جہاں ذکر لسانی نہ ہو سکے۔ وہاں ذکر قلبی جاری رکھے۔ یعنی تصور رکھے، توجہ رکھے اور یاد رکھے، دھیان رکھے۔ پس ذکر ہر حالت میں مطلوب ہے۔ تو جس حالت میں جو بھی ممکن ہو کرتا رہے۔ اب وہ شبہ جاتا رہا۔ کہ وہ کون سا کام ہے۔ جس سے وساوس بند ہو جاویں اور نفس ہر دم کسی شغل میں لگا رہے۔ کیوں کہ نفس کو بے کار چھوڑیں گے۔ تو یہ خود اپنے لیئے کوئی مضر مشغلہ تجویز کر لے گا۔ اب معلوم ہو گیا۔ کہ وہ کام ذکر قلب ہے۔ جو ہر وقت ممکن ہے۔ بس نفس کو اس شغل میں لگا دو۔ تو پھر

وہ کوئی مضر شغل خود تجویز نہ کرے گا نہ غفلت میں مبتلا ہوگا۔

شغل قلب

اور علاوہ مشاہدہ کے حدیث شریف میں اس کی تصریح بھی ہے :۔

الشیطان جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر اللہ خنس و اذا غفل وسوس۔

یعنی ابن آدم کے قلب پر شیطان چڑھا ہوا بیٹھا ہے جب وہ ذکر اللہ کرتا ہے۔ اس وقت ہٹ جاتا ہے اور جب خالی رہتا ہے۔ تو وسوسے ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا۔ کہ اگر نفس کو مشغول نہ کرو گے۔ تو یہ خود مشغلہ تجویز کرلے گا۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے۔ کہ نماز کا تو کوئی رکن بھی ذکر سے خالی نہیں۔ قرأت، تسبیح، تکبیر، تشہد غرض سب ہی ذکر ہی ذکر ہے۔ مگر باوجود اس کثرت کے ساتھ اس کے مشتمل علی الذکر ہونے کے سب سے زیادہ وسوسے نماز ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ تو ہم یہ کیسے مان لیں۔ کہ جب کسی کام میں مشغول ہوں تو وسوسہ نہیں آتا۔ اس مادہ جزئیہ سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قاعدہ صحیح نہیں۔ کہ جب نفس کو کسی کام میں مشغول نہ کرو گے۔ تب ہی وہ کسی کام میں لگ جائے گا۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمبخت تو کام کے اندر بھی اپنا کام چلاتا رہتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ذکر کہتے ہیں یاد کو خواہ وہ تنہا قلب سے ہو، خواہ زبان بھی اس میں شریک ہو، مگر محض زبان سے نہ ہو۔ اگر محض زبان سے یاد ہے تو وہ واقع میں ذکر نہیں۔ بلکہ وہ تو صورت ذکر ہے۔ اب شبہ جاتا رہا۔ کیونکہ دیکھ لیجئے کہ جہاں اور جس شخص کو وساوس آتے ہیں۔ وہاں واقع میں ذکر کا وجود نہیں۔ بلکہ محض ذکر کی صورت ہی صورت ہوتی ہے قلب

اس کی طرف مشغول نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس نماز میں وساوس آتے ہیں۔ اس میں قلب نماز میں پورا مشغول نہیں ہوتا۔ ورنہ النفس لا توجہ الی شیئین فی آن واحد کے قاعدہ سے پوری مشغولی کے ساتھ وساوس آ نہیں سکتے۔

اب اس پر ایک اور شبہ رہا۔ وہ یہ کہ جب قلب متوجہ نہیں ہوتا۔ تو پھر ادا کیسے ہوتا ہے۔ کیونکہ فعل اختیاری تو بدوں ارادہ قلب کے ہو ہی نہیں سکتا اور ارادہ کے لیئے توجہ لازم ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ صحیح ہے۔ مگر اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب بالکل توجہ نہ ہو تو فعل نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ شروع توجہ سے کیا ہو۔ مگر استمرار میں توجہ نہ رہی ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیئے کہ جیسے دو آدمی ساتھ ساتھ چلیں اور باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کریں۔ تو باتیں کرتے وقت توجہ فقط باتوں کی طرف رہے گی چلنے کی طرف نہ رہے گی۔ مگر مشی پھر بھی واقع ہوتی ہے جیسے گھڑی کی کوک کہ ابتداء میں حرکت چابی کو دینی پڑتی ہے۔ پھر اس کی رفتار کے استمرار و بقا کے لیئے کوکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح مشی ممتد کے ساتھ قصد متجدد کی ضرورت نہیں۔ وہی پہلا قصد کافی ہے اور وہی ساری مشی میں مؤثر ہے۔ یا جیسے ہارمونیم باجہ کہ جب ایک دفعہ کوئی اسے بجانے بیٹھ گیا۔ تو ہر قرعہ پر جدید قصد کی حاجت نہیں۔ بلکہ ابتداءً ایک دفعہ قصد کر لیا اور بجانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد خود بخود ہاتھ وہیں پڑتا ہے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ ارادہ تو کیا کرتا۔ اسے بعض دفعہ ایسی محویت ہوتی ہے کہ ہاتھ چلنے کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ اور جیسے قاری ہے کہ قرأت میں اگر ہر ہر لفظ پر نیا قصد کرے تو اس کا لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بارہا تجربہ ہوا ہوگا۔ کہ جب کسی نے بنا کر پڑھا۔ وہیں اس کا لہجہ بگڑ گیا۔ بلکہ بے ساختہ اور بے ارادہ پڑھتے

۵۰عمر فاروق@ون اردو

سے نہایت اچھا پڑھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی فعل اختیاری کی جب عادت اور مشق ہو جائے۔ تو پھر ابتداء کے لیئے تو قصد کی ضرورت ہوتی ہے۔ استمرار کے لیئے قصد متجدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان تمام مثالوں سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ فعل اختیاری کے صدور کے لیئے یہ ضروری نہیں۔ کہ ہر ہر آن میں اس پر توجہ ہو۔ بس ابتداء کے لیئے توجہ ضروری ہے بس اب نماز اور وساوس کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں رہا۔ کیونکہ ابتدائی توجہ سے نماز شروع ہو گئی اور وہ ہو رہی ہے اور درمیان میں وساوس کی طرف توجہ مبذول ہو گئی۔

اس لیئے وساوس بھی آ رہے ہیں۔ کیونکہ توجہ نماز کے ہر جزو کے ساتھ متعلق نہیں ہے۔ وہاں تو تکبیر تحریمہ سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کسی توجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں اس کام کے لیئے اس قدر منجھے ہوتے ہیں۔ کہ جب موقع رکوع کا آتا ہے، خود رکوع کر لیتے ہیں اور جب سجدہ کا وقت ہوتا ہے خود ہی سجدہ کر لیتے ہیں۔ پس یہ شبہ حل ہو گیا۔ کہ نماز جس میں سب سے زیادہ ذکر ہے۔ یہ کیوں مانع نہیں ہوتی ہے وساوس کو۔

حاصل جواب کا یہ ہوا۔ کہ یہ مانع کیسے ہو۔ وہاں تو یاد اور توجہ ہی نہیں۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ توجہ کامل ہو اور پھر وساوس آویں۔ جب چاہو آزما لو۔ صاحب! تم ذرا ایک خط لکھنے بیٹھو۔ پھر دیکھو کیسے وساوس آتے ہیں؟ میں نے بعض دفعہ ایسا کیا ہے۔ کہ قرآن پڑھنے بیٹھا ہوں اور یہ چاہا کہ پڑھنے میں خط بھی لکھ لوں۔ تو نہیں ہو سکا۔ شاید الحمد اور قل ہو اللہ کی دوسری بات ہو۔ کیونکہ وہ تو خوب یاد ہے۔ وہاں شاید توجہ کی ضرورت نہ ہو باقی اور جگہ یا تو پڑھنے میں اٹکے گا، یا لکھنے میں بھٹکے گا۔ اب تمام شبہات دور ہو کر وہ دعوےٰ اچھی طرح ثابت ہو گیا۔ کہ نفس بے شغل بھی

نہیں رہ سکتا۔ اور دوسرے شغل میں بھی نہیں لگ سکتا۔ اس لیئے فقط مضر سے بچنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ نافع میں مشغول ہونے کی ضرورت ہے۔

غیر ضروری کے ترک کی دو صورتیں

حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں یہی رعایت کی ہے۔ کہ پہلے تو یہ مرض بیان فرمایا۔ کہ انسان غیر ضروری امور میں مشغول ہے اور غیر ضروری امور کی سب سے بڑی فرد یہ ہے۔ کہ دنیا میں اس کو انہماک ہے۔ اس لیئے سب سے پہلے اس کی مذمت بیان فرمادی اور اس کے بعد امر ضروری یعنی آخرۃ کا ذکر کر دیا۔ کہ ذکر آخرت میں مشغول ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس انہماک کا ازالہ ہو۔ سو غیر ضروری کے ترک کرانے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی مذمت کر دی جاوے اور اس سے ہٹایا جاوے۔ مگر ابھی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ اس سے نفع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مشغلہ ضروری بتانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ یہ شخص اس غیر ضروری کو چھوڑ کے دوسرے غیر ضروری میں مبتلا ہو گا۔ دوسری صورت یہ ہے۔ کہ غیر ضروری سے ہٹایا جاوے اور ضروری کی طرف متوجہ کیا جاوے۔ یہی دوسرا طریقہ جو اسلم واحسن ہے۔ یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

مذمّتِ دُنیا

چنانچہ ارشاد ہے

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ۔

کہ نہیں ہے حیوٰۃ دنیا۔ مگر لہو و لعب۔ یعنی فضول وبیکار ہے۔

دیکھیئے! صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ حیاتِ دنیا کی مذمت کردیں۔ آگے فرماتے ہیں:۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ۔

اور بے شک دارِ آخرت ہی حیات ہے۔ یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے، دنیا کی کیا زندگی۔ یہ تو اس کے سامنے بالکل ہیچ ہے۔ تو مذمتِ دنیا کے بعد آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اس اسلوب ہی سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ مرض ایسا ہے۔ جس کا مریض دائم المرض ہے۔ جس کو آج کل کے جاہلانہ محاورہ میں دائم المریض کہتے ہیں۔

آج کل یہ بھی فیشن ہو گیا ہے۔ کہ جس لفظ پر دیکھو الف لام داخل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قریب المرگ ایک مولوی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ اب تک تو الف لام چار ہی قسم کا تھا۔ یعنی استغراقی، جنسی، عہد ذہنی، عہد خارجی۔ مگر آج کل ایک پانچویں قسم الف لام تجربیت کی ایجاد ہوئی ہے یعنی نئے فیشن کے لوگ کتاب کا نام بھی رکھیں گے۔ تو الف لام ضرور داخل کریں گے۔ مثلاً المامون، الفاروق۔ اگر فقط مامونؔ و فاروق نام رکھ دیتے تو کیا حرج تھا۔ ایسے ہی الجزائر، الجبرا۔ غرض ہر چیز میں الف لام۔ ایسے ہی قریب المرگ، دائم المریض کا الف لام کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اور الف لام سے قطع نظر کر کے دائم المریض کی تو ترکیب ہی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمیشہ کے بیمار کو دائم المرض کہہ سکتے ہیں نہ کہ دائم المریض اگر مریض ہی کا لفظ لانا ضروری تھا۔ تو دائمی مریض کہہ لیتے۔ البتہ دائم المریض کے معنی یہ تو ہو سکتے ہیں۔ کہ جس کے پاس ہمیشہ مریض رہیں۔ جس طرح دائم المرض کے معنی یہ ہیں۔ کہ جس کو ہمیشہ مرض رہے۔ پس اس معنی کر دائم المریض حکیم یا ڈاکٹر کو کہہ سکتے ہیں نہ کہ مریض کو۔ بہر حال جو دائم المرض ہوگا اس کو دوا بھی دائمی ہی دی جائے گی۔

ضرورتِ شیخ

تو جب یہ مرض جب دنیا ہمیشہ کا ہے۔ تو ہمیشہ اس کی دوا استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ اگر اتفاق سے بزرگ بھی ہو جاویں تو اس وقت بھی اس مرض سے اور اس کے علاج سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اپنے نزدیک بزرگ بن جانے سے واقع میں بزرگ نہیں ہو سکتا۔ مگر اب تو یہ حالت ہے۔ کہ جہاں ذرا بھی کوئی درجہ مقصود کا حاصل ہو گیا۔ مثلاً معصیت سے نفرت ہو گئی یا نفل میں دل لگنے لگا یا وساوس و خطرات بند ہو گئے۔ تو بس گمان ہو گیا۔ کہ اب میں کامل ہو گیا ہوں۔ پھر کیا تھا، سب مجاہدے اور ریاضات چھوڑ بیٹھا۔ اسی لئے ضرورت ہے ہر وقت شیخ کی۔ ؎

ہمانا تے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

یعنی کسی کامل سے تشخیص کراؤ کہ یہ حالت کمال کی ہے یا نہیں۔ ورنہ وہ حالت ہو گی جیسے دق والے کو اگر ایک دن بخار نہیں آیا۔ تو وہ یہ سمجھے کہ میں اچھا ہو گیا اور علاج چھوڑ بیٹھے۔ یاد رکھو مرض کا نکس (یعنی لوٹنا) بداء سے (یعنی شروع ہونے سے) بھی اشد ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے احتیاطی سے مرض پھر لوٹے اور علاج مشکل ہو جائے۔ تو جس طرح بعض مریض ظاہری ذرا بخار نہ آنے کو صحت سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح بعض اہل طریق بھی جہاں تھوڑی سی سنسناہٹ بدن میں پیدا ہوئی اور سمجھ گئے۔ کہ بس ہم کامل ہو گئے۔ پھر تسبیح بھی چھوٹ گئی اور مجاہدہ بھی گیا اور یہ گمان ہو گیا کہ بس اب تو ہم منتہی ہو گئے ہیں اب کسی ریاضت کی حاجت نہیں رہی اور ہم اس کے مصداق ہو گئے۔

ع خلوت و چلّہ بر و لازم نماند

حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اجی! تم تو جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے بلکہ اس سے بھی بدتر ہو گئے۔ کیونکہ جیسے ابتدائے مرض سے عود مرض سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح تمہاری یہ حالت اشد ہے پہلی محجوبی کی حالت سے۔ جس پر یہ حالت پیش آئے۔ وہ خود غور کرکے دیکھ لے کہ اس وقت بہ نسبت پہلے کے طبیعت کی کیا کیفیت ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ طاعت سے دل گھبرانے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے وحشت سی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے اباء و اعراض و انکار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حالت یہاں تک ترقی کرتی ہے۔ کہ اس کے بعد شدہ شدہ حق تعالیٰ سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کو اپنے سے اور اپنے کو خدا سے ناخوش پاتا ہے۔ پس یہ سرحد ہے کفر کی (نعوذ باللہ منہ)

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فوائد الفوائد میں لکھا ہے۔ کہ حجابات کے سات درجے ہیں۔ ان میں ایک درجہ عداوت ہے۔ اولاً طبعی اور عداوت طبعی کے بعد پھر آخری درجہ کفر ہے اختیاری اور ادنیٰ درجہ حجاب کا معمولات کا اختلال ہے کہ خدا کے ساتھ جو برتاؤ اور تعلق چلا آ رہا ہے اس میں کمی کر دے۔ یہ ادنیٰ حجاب ہے اور اسی سے بڑھتے بڑھتے حجابات کثیرہ پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے اس ادنیٰ سے بھی بچنا چاہیئے۔

اسی واسطے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

یا عبد اللہ لا تکن مثل فلان کان یصلی من اللیل ثم ترکہا۔

کہ اے عبد اللہ! ایسے مت ہو جانا جیسے فلاں شخص تھے۔ کہ اول شب کی نماز پڑھتا تھا، پھر چھوڑ دی۔

نفس کا دھوکہ

باقی یہ سمجھنا کہ مجھے کمال حاصل ہوگیا یہ تو صاف اعجاب اور کبر کا شعبہ ہے۔

صاحب: تھوڑی سی سفناہٹ پیدا ہو جانے سے کمال حاصل نہیں ہو جاتا۔ اسے کسی شیخ کی تشخیص پہ چھوڑ دو۔ اپنی رائے سے کچھ مت سمجھو۔

؎ صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے:

صوفی کے صاف ہونے کے لیئے ایک جام کی اور خام کی پختگی کے لیئے بہت سفر کی ضرورت ہے۔ بڑی مدت میں خام کے اندر پختگی آتی ہے۔ یہ نفس کا دھوکہ ہے کہ اپنے کو کامل سمجھ کر سب کام چھوڑ بیٹھے۔ اس دھوکے میں نہ پڑنا چاہیئے اور اپنی حالت پر کبھی اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ جو تجویز کسی مبصر نے کردی ہے۔ عمر بھر اسی میں مشغول رہنا چاہیئے۔ کیوں کہ اس کے ترک میں یہ ہوتا ہے۔ کہ بتدریج کمی ہوتی رہتی ہے۔ جس کا ادراک بھی مشکل ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھیئے۔ کہ کسی نے ایک پھول کا درخت لگایا۔ اسے خوب پانی دیا اور بڑھ گیا۔ اب کثرت سے پھول بھی لگنے لگے۔ اب یہ سمجھ کر پانی دینا چھوڑ دیا۔ کہ اب تو یہ مکمل ہوگیا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ پہلے تو پھول چھدرا پڑ جاوے گا۔ پھر پھول لگنا بند ہوجائے گا اور اس کے بعد درخت مرجھا کر خشک ہو جائے گا۔

ہاں اتنا تو کر سکتا ہے۔ کہ پہلے کثرت سے مجاہدے کرتا تھا۔ اب کبھی کبھی کرلے۔ جیسے ابتداء میں درخت کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، بڑھ جانے کے بعد اتنی ضرورت نہیں رہتی۔

منتہی کی طاعت

اسی طرح مبتدی و منتہی کی طاعت میں بڑا فرق ہے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ جتنے مجاہدے ریاضات مبتدی کرتا تھا۔ اتنے ہی منتہی بھی کرے۔ مگر یہ تو ضرور ہے۔ کہ منتہی بھی کچھ کرے۔ اس کے تھوڑے مجاہدے بھی مبتدی کے بیسیوں مجاہدوں سے افضل ہیں اور صورت بھی دونوں مجاہدوں کی جدا جدا ہوتی ہے اور مولانا نے جو منتہی کی نسبت فرمایا ہے۔

ع خلوت و چلہ برو لازم نماند

سو یہ نہیں فرمایا۔ کہ طاعت و احکامِ دین لازم نماند۔ بس اس کی شان عوام الناس کی سی ہو جاتی ہے۔ اس کی عبادت بھی ایسی لطیف ہوتی ہے۔ کہ دوسرا ادراک نہیں کر سکتا۔ نہ وہ نفلیں بہت پڑھتا ہے۔ نہ تلاوت بہت کرتا ہے۔ بلکہ وہ خلق اللہ کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے۔ جس کو دیکھ کر بظاہر لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ اس کو وعظ و تقریر میں خوب حظِ نفس ہوتا ہے۔ حالانکہ جو کچھ بات چیت منتہی کر رہا ہے۔ وہ محض خدمت کے خیال سے کر رہا ہے اس میں اسے کچھ حظ نہیں ہوتا۔ بلکہ زبان سے تو بات چیت کر رہا ہے اور دل منقبض ہو رہا ہے۔ مگر دوسرے کی مصلحت کے واسطے سب کچھ برداشت کر رہا ہے۔ اس آیت سے اس کیفیت کا پتہ چلتا ہے:۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ الخ

یعنی اپنے نفس کو ضبط کر کے اور گھونٹ کر بیٹھیے۔

یہاں حق تعالیٰ نے صبر کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ اور صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ما تکرہہ یعنی نفس کو ایسی بات کا پابند کرنا جو اس کو ناگوار ہو اور اس سے معلوم ہوا کہ آپ مجمع سے گھبراتے تھے۔ مگر لوگوں کی مصلحت

کے لیئے مجبوراً بیٹھتے تھے۔ صاحبو! ہمیں تو دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے مگر اہل اللہ کو پریشانی ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان کی نظر تو ادرہی طرف ہے جس کو جامی فرماتے ہیں۔ ؎

خوشا وقتے وخرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

اوران کی یہ شان ہوتی ہے۔ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث شنیدن ندہم

اُن کو تو خود اپنا نفس بھی حجاب معلوم ہوتا ہے۔ تو دوست تو کیوں نہ موجب پریشانی ہوں گے۔ لوگ ان کو تعظیم وتکریم کی شان میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں۔ کہ بڑے چین میں ہیں۔ مگر کوئی اُنہیں کے دل سے پُوچھے کہ اُن پر کیا گذرتی ہے۔ ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

کسی کو کیا خبر ہے کہ وہ کس طرح ان مصائب کو یعنی مخلوق کی مجانست ومخالطت کو برداشت کرتے ہیں۔ ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

غرض ان کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ کہ جس طرح تمہیں دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے۔ اسی طرح انہیں بھی آتا ہوگا۔ ؎

کار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر وشیر

انہیں بے حد انقباض ہوتا ہے دوستوں سے اور وہ اس سے

اس قدر پریشان ہوتے ہیں۔ کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مگر باوجود اس کے وہ ظاہر میں سب سے بول بھی رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں۔

منتہی کا مجاہدہ

اس پریشانی اور ضحک کے اجتماع پر ایک قصہ یاد آیا۔ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہنستے بہت تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام روتے بہت تھے۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ معلوم ہوتا ہے آپ رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں، جو اس قدر روتے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ شاید آپ عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ جو اس قدر ہنستے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ فیصلہ کے لیئے آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ اے یحییٰ! آپ خلوت میں تو ایسے رہیئے۔ جیسے اس وقت ہیں اور جلوت میں ایسے رہیئے جیسے عیسیٰ ہیں اور اے عیسیٰ! آپ جلوت میں تو ایسے ہی رہیئے جیسے اس وقت ہیں اور خلوت میں ایسے رہیئے جیسے یحییٰ ہیں۔ آپ کو خلوت میں ہنسنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو نڈر اور بے خوف کا کام ہے اور اے یحییٰ! اگر آپ جلوت میں بھی ایسے ہی روتے رہیں گے تو میرے بندے ناامید ہو جائیں گے۔

تو وہ اس لیے ہنستے ہیں۔ تاکہ مخلوق ناامید نہ ہو جائے۔ ان کی ہنسی لوگوں کی مصلحت کے لیئے ہوتی ہے۔ کہ انہیں نفع پہنچے اور تاکہ وہ دل شکستہ نہ ہوں۔

تو صاحبو! ان کی عبادت اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ لوگ اسے لذت اور حظِ نفس سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ مجاہدات ہیں۔

یہی وجہ ہے۔ کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم سے زیادہ ضحک کبھی نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جس کے دل پر چوٹ لگی ہوتی ہے اور غم کا اثر ہوتا ہے۔ وہ جب بھی ہنسے گا۔ کوشش اور قصد سے ہنسے گا۔ اور قصد کی ہنسی قابو میں ہوتی ہے۔ اس لیئے آپ کی ہنسی تبسم سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ شب و روز دیکھ لو۔ اگر کسی کو ذرا رنج ہوتا ہے۔ تو یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ جہاں کسی نے اس سے ہنسی کی بات کی فوراً غصہ آجاتا ہے۔ لیکن اگر رنج کا سبب قابل اخفار ہوتا ہے۔ تو اس کو اس خیال سے ہنسی کی ضرورت بنانی پڑتی ہے۔ کہ اگر نہ ہنسوں گا۔ تو راز کھل جاتے گا۔ اس لیئے زبردستی منہ چڑانا پڑتا ہے۔ غرض بڑی مصیبت سے ہنسی آتی ہے۔ بس یہی حال اہل فکر کا ہوتا ہے اور ایک ہم بے فکرے ہیں۔ کہ ذرا سے اشارہ میں محلہ کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ معمولی سی ہنسی کی بات پر لوٹ جاتے ہیں اور ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا ہے۔ کہ فقط تبسم فرماتے تھے اور وہ بھی اُمت کی مصلحت کے لیئے۔

اور آپ ہنستے بھی کیسے؟ آپ تو امت کے لیئے طویل الاحزان دائم الفکر رہتے تھے۔ جو ہر وقت فکر میں ہو گا۔ اسے کیوں کر ہنسی آئے گی۔ ؎

چوں چنیں کارے است اندر راہ ترا
خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

اعتقادِ کمال

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے۔ کہ ان کے سامنے سے ایک جماعت بے فکروں کی نکلی۔ ہنستے ہوئے جا

رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم کو پل صراط پر چڑھنا تو معلوم ہے اور اترنے کی خبر نہیں۔ پھر کیسے ہنسی آتی ہے؟ (مطلب یہ تھا کہ بفحوائے اِنْ مِنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔ ہر شخص کو جہنم کے اوپر سے گزرنا ضرور ہے اور یہ خبر نہیں کہ پھر پار ہوں گے یا دوچار ہوں گے۔ اس حالت میں تمہارا ہنسنا حیرت انگیز ہے۔ واقعی خوب کہا)، ایسی بے ساختہ ہنسی تو اسی کو آتی ہے جس کے قلب میں بے فکری ہو۔ غرض ہمیں ہر وقت اپنی حالت کو سوچتے رہنا چاہیئے اور کبھی اپنے متعلق کمال کا گمان نہ ہونا چاہیئے۔ جس سے عبادت میں کمی کر دی جاوے۔

اور بالفرض اگر کمال کو حاصل بھی فرض کر لیا جاوے تب بھی بیفکری کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر خلوت وچلہ لازم نہیں رہا۔ تو عبادت سے تو خالی نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ اس درجہ پر پہنچ کر تو عبادت زیادہ دقیق ولطیف ہوجاتی ہے۔ جس کی رعایت میں خاص اہتمام کی حاجت ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عبادت کا ترک ہر وقت مضر ہے اور کمال کا اعتقاد بھی مضر ہے۔ کہ یہ عبادات ترک کرا دیتا ہے۔ اسی واسطے یہ مضمون یعنی فکر اصلاح وتکمیل دین ہر وقت کی ضرورت کا ہے۔

آداب مکان

اور ہر چند کہ اس کا بیان ضرورت کی قدر بھی کافی تھا۔ کیونکہ سب کے نزدیک مسلم ہے۔ زیادہ تطویل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس کے متعلق زیادہ بیان کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔ کہ جس مکان میں اس وقت بیان ہو رہا ہے۔ اس وقت اس کی تکمیل ہوچکی ہے اور اس کے مالک کا سکونت کے لیئے اس میں آجانے کا ارادہ ہے اور یہ حالت مظنہ تھا۔ اس کے ساتھ زیادہ شغل قلب کا جو ایک قسم کا انہماک ہے

دارِ دنیا کے ساتھ اس لیے ضرورت تھی۔ کہ اس انہماک کی مذمت اور شغلِ آخرت کی ضرورت کا کسی قدر خاص اہتمام سے بیان کیا جاوے۔ یہ وجہ ہوگئی کسی قدر تطویل کی۔ بہرحال اس آیت میں دارِ دنیا اور دارِ آخرت کے ساتھ جو معاملہ کیا جاوے اس کا ذکر ہے۔ جس کے عموم میں خاص مکان بھی آ گیا۔

اور ایک آیت میں خاص مکان یعنی مساکن کا معاملہ بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دنیوی مساکن کے ساتھ اتنا محظوظ ہونا کہ آخرت سے غافل کر دے نیز مذموم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ۔

یعنی فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے والے اور وہ مال جس کو تم نے محنت سے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ زیادہ محبوب ہیں تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے۔ تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنے حکم کو لاوے۔

یہ محل وعید میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں یہ سب چیزیں جو مذکور ہوئی ہیں۔ خدا سے اور اس کے احکام سے زیادہ محبوب ہیں۔ تو حکم ثانی کا انتظار کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حق تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ محض حبِ مساکن پر وعید نہیں ہے اور نہ رضا بالمساکن پر وعید ہے۔ یعنی مکان کو پسند کرنے پر بھی وعید نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا

کہ اچھا اور پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت ہے۔

اب وعید کا ہے پر ہے۔ صرف احب الیکو پر۔ کہ وہ خدا سے زیادہ محبوب ہوں تب محل وعید ہیں۔ اس میں بھی مطلق محبوب ہونے پر وعید نہیں۔ تو مکان کا نہ مرضی ہونا محل وعید ہے نہ محبوب ہونا۔ بلکہ احب من اللہ ہونا محل وعید ہے۔ اب، اگر کوئی شخص بقدرِ ضرورت مکان بنوا لے جس میں اسراف و تفاخر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

اور یہ ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے۔ کہ اس کو کتنا مکان ضروری ہے۔ کیونکہ لوگوں کے درجات مختلف ہیں اور انہیں درجات کے لحاظ سے ضروریات بھی مختلف ہیں۔ کسی کو ایک حجرہ آسائش وراحت کے لیئے کافی ہو جاتا ہے اور کسی کو ایک بڑا مکان بھی مشکل سے کافی ہوتا ہے۔ بہرحال عمدہ، پختہ اور بڑا مکان بنانا شرعاً ماذون فیہ ہے۔ چنانچہ اس کے عدم جواز کا کسی کا بھی مذہب نہیں ہے۔ ایک شخص کو زیادہ سردی لگتی ہے۔ وہ لحاف اوڑھتا ہے اور ایک شخص کا جاڑا ہلکی رضائی میں چلا جاتا ہے۔ دونوں کا اسراف الگ الگ ہے۔ بہرحال ہر شخص اپنی ضرورت کو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہاں ضرورت سے آگے ایک درجہ آرائش کا ہے وہ بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ اس میں اسراف اور حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو اور نہ قصد فخر و عجب کا اختلاط ہو۔ کیونکہ یہ درجہ نمائش کا ہے جو ناجائز ہے۔

اور اسراف کے معنی یہ ہیں۔ کہ منہی عنہ کا ارتکاب نہ ہو اور جو خرچ بھی ہو وہ معصیت میں خرچ نہ ہو۔ اس میں بھی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی شئے ایک شخص کے اعتبار سے اسراف ہو سکتی ہے اور دوسرے شخص کے اعتبار سے اسراف نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص کو دس روپے گز کا کپڑا پہننے کی وسعت ہے اور ایک شخص کو ایک

روپیہ گز کے کپڑے کی بھی وسعت نہیں۔ یہ اگر دس روپے گز کا کپڑا خریدے گا۔ تو ضرور قرض دار ہوگا۔ اب دونوں نے یہ کپڑا خریدا۔ تو جس کو وسعت ہے۔ اس کے لیئے تو کچھ حرج نہیں، نہ اس پر اسراف کا الزام اور جس نے قرض لیا۔ وہ بے ضرورت گردن پھنسانے سے گنہگار ہوگا۔ مُسرف شمار ہوگا۔ کیونکہ بلاضرورت مقروض ہونا گناہ ہے۔ دیکھئے! دس روپے گز کا کپڑا خریدنا ایک ہی فعل ہے۔ مگر ایک کے لیئے گناہ نہیں ہے اور ایک کے لیئے گناہ ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ واقع میں تو وہ فعل مباح ہے۔ مگر ایک عارض کی وجہ سے اس کے لیئے موجب گناہ بن گیا اور وہ عارض کیا تھا۔ بلاضرورت قرض لینا۔ اگر یہ اس قدر قیمتی لباس نہ پہنتا تو بے ضرورت قرض کی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا۔ اس لیئے اس کے لیئے اتنا اچھا اور قیمتی پہننا بھی گناہ ہے۔ کیونکہ مقدمہ گناہ بھی گناہ ہی ہوتا ہے۔

تو بہر حال ہر چیز میں تین درجے ہیں۔ ایک آسائش اور ایک آرائش ایک نمائش۔ تو آسائش تو ہر ایک کے لیئے مستحب ہے اور آرائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلا ضرورت قرض وغیرہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے۔ گو اس کا ترک اولیٰ ہے اور نمائش جس میں ریا و کبر و عجب اور فخر ہوتا ہے۔ یہ حرام ہے۔ اب اس کا فیصلہ ہر شخص کے تدین پر ہے۔ کہ اس کی نیت کیا ہے۔ اگر دل میں غور کر کے یہ دیکھے۔ کہ یہ کام میں نے نمائش کے لیئے کیا ہے۔ تو تاویل کر کے اس کو آرائش میں داخل نہ کرے۔ مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ معصیت میں داخل نہ کرے۔ کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے۔ بلکہ حسن ظن رکھے۔ تو خلاصہ یہ ہوا۔ کہ مساکن مرضیہ اگر احب من اللہ ہوں۔ تب محل وعید ہیں، ورنہ نہیں۔ سو مدار وعید مساکن مرضیہ نہیں بس

قید ترجنو بیان فرما کر پھر اس پر وعید کا مدار نہ رکھ کر اپنی پسند کا مکان نہ بنانے کی اجازت مستنبط ہوتی ہے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پھر اس سے محبت کرنے کی بھی اجازت ہے۔ یعنی اس کی جانب میلان قلب کی بھی اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہ محبت خدا و رسول کی محبت سے بڑھ کر نہ ہو۔ اگر زیادہ ہوگی۔ تو گنہگار ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ مساکن کے متعلق یہ آداب ہیں۔ جنہیں میں بقدرِ ضرورت اس کے قبل کے وعظ میں جو اسی مکان کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا۔ بیان کر چکا ہوں۔

ضرورتِ فکرِ آخرت

حق تعالیٰ نے اس آیت مقصود بالبیان میں بھی دار آخرت کے مقابلہ میں حیاتِ دنیا کو بیان کیا ہے اور مقصود یہ ہے۔ کہ دار آخرت پر حیاتِ دنیا کو ترجیح نہ ہونی چاہیئے۔ تو لفظی مناسبت تو اس مضمون کے اختیار کرنے کی ظاہر ہی ہے۔ کہ افتتاحِ دار کے لیئے یہ وعظ ہوا ہے اور ان آیات میں بھی دار آخرت کا تذکرہ ہے۔ مگر معنی کے اعتبار سے ان میں سے ایک عام مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ آخرت سے بے فکری نہ ہونی چاہیئے اور گو اس کے لیئے یُوں بھی فرما سکتے تھے کہ:

اطلبوا الآخرۃ واترکوا الدنیا۔

کہ آخرت کی جستجو کرو اور دنیا کو چھوڑ دو۔ مگر اس طرح نہیں بیان کیا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو اس مضمون کے ساتھ ساتھ دونوں کی حالت کا دکھلانا بھی مقصود ہے۔ جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی کرنا ہے۔ کہ اس حالت کے بعد ہر شخص خود ہی فیصلہ کر لے۔ کہ دونوں میں کون توجہ

کے قابل ہے اور کون ترک کے قابل۔ اسی لیئے امر و نہی کے صیغہ سے نہیں بیان کیا۔ بلکہ بصورت اخبار یوں فرمایا ہے:۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ۔

اور نہیں ہے حیات دنیا مگر لہو اور لعب۔

یہاں حق تعالیٰ نے دنیا کے لیئے دو لفظ اختیار کیئے ہیں۔ ایک لہو اور ایک لعب۔ اور دونوں کے مفہوم میں لغتہً کچھ فرق ہے۔ وہ یہ کہ لہو کہتے ہیں شغل کو اور لعب کہتے ہیں عبث کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا ایسی چیز ہے۔ کہ اس میں دو صفتیں ہیں۔ ایک تو لہو ہونے کی۔ کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف لبھاتی اور مشغول کرتی ہے اور دوسرے لعب یعنی عبث ہونے کی۔ کہ اس میں مشغول ہونا عبث یعنی بے نتیجہ ہے۔ اس پر کوئی معتدبہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ جیسے بچوں کا کھیل۔ کہ اس پر بھی کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

اصلاحِ زاہدِ خشک

اس سے ایک اور دقیق علم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ تمام حیات دنیا مذموم نہیں۔ بلکہ وہ حیات دنیا مذموم ہے۔ جس میں محض لہو و لعب ہو۔ یعنی جو بے نتیجہ ہو اور اس کا کوئی معتدبہ ثمرہ نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ دنیائے صوری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب ہو اور ایک وہ کہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو۔ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو وہ مذموم ہے اور جس پر ثمرہ مرتب ہو وہ واقع میں دنیا ہی نہیں۔

یہاں سے اصلاح ہے غالی فی الزہد اور زاہد خشک کی۔ کہ وہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے۔ عمدہ کپڑا، اچھا کھانا، ٹھنڈا پانی سب مذموم ہے۔ بعض لوگ اسی خیال سے نکاح بھی نہیں کرتے۔ کہ

عورت بھی دنیا ہے اور بعض کر بھی لیتے ہیں۔ تو نان و نفقہ نہیں دیتے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ بیوی کی طرف التفات کرنے کو التفات الی الدنیا سمجھتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ گھر میں کے معالجہ کے لیئے میرٹھ گیا۔ تو وہاں ایک عورت نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی۔ تو ایک دوسری عورت نے اس عورت کو یہ رائے دی۔ کہ تو ہمارے پیر سے بیعت کرنا جو ایسے بزرگ ہیں۔ کہ پچاس برس سے بیوی سے بولے بھی نہیں اور جس مولوی سے تو مرید ہونا چاہتی ہے۔ وہ تو بیوی کو علاج کے لئے ساتھ لیئے لیئے پھرتے ہیں اور جاہل نے یہ نہ خیال کیا۔ کہ یہ پیر صاحب تو پچاس برس سے حقوق العباد تلف کرنے کی وجہ سے خدا کی نافرمانی میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ یہ بزرگ کیسے ہو سکتے ہیں۔

غرض اس آیت سے ایسے زاہدانِ خشک کی بھی اصلاح ہو گئی۔ کہ دنیا اسے ہی نہیں کہتے۔ جسے تم دنیا سمجھے ہو۔ یعنی روپیہ پیسہ وغیرہ۔ بلکہ دنیا تو درحقیقت لہو و لعب کا نام ہے۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں دنیا بھی نہ ہو گی۔ اور جہاں یہ ہو، وہاں دنیا ہو گی۔ گو ظاہری سامان کچھ نہ ہو۔

دُنیائے مذموم

اور اصل بات یہ ہے۔ کہ یہاں دنیا مقابل آخرت کے ہے اور دنیا کا اطلاق دو معنی پر آتا ہے۔ ایک تو دین کے مقابلہ میں دُنیا بولی جاتی ہے۔ جس کے معنی بے دینی کے ہوتے ہیں۔ اور ایک آخرت کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے۔ جس کے معنی حیاتِ دنیا کے ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث میں دنیا کا استعمال دونوں معنی میں آیا ہے۔ سو آیت میں تو دنیا مقابلہ میں آخرت کے ہے۔ اس میں دو قسمیں ہیں۔ مذموم یعنی لہو و لعب وغیرہ مذموم

یعنی اموال امتاع وغیرہ۔ پس وہ علی الاطلاق مذموم نہیں اور مذموم وہ ہے جو دین کے مقابلہ میں ہو۔ جیسے :۔

حب الدنیا رأس کل خطیئۃ۔

کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ یہاں دنیا مقابلہ میں دین کے بولی گئی ہے اور مطلب یہ ہے۔ کہ بے دینی کی باتوں سے محبت نہ کرنا چاہیئے اور یہ معنی نہیں۔ کہ بیوی بچوں سے بھی محبت نہ کرے۔ کیونکہ یہ بے دینی کی چیزیں تھوڑا ہی ہیں۔ بلکہ یہ تو نکاح کا نتیجہ ہیں جو دین ہے۔ غرض دُنیا وہ مذموم ہے جو دین میں مضر ہو۔ ؎

چیست دنیا از خُدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

یعنی دنیا کسے کہتے ہیں۔ خدا سے غافل ہونے کو نہ کہ مال و دولت اور بیوی بچوں کو۔ آگے ایسی ہی دنیا والوں کو کہتے ہیں۔ ؎

اہل دنیا چہ کہیں و چہ مہیں
لعنۃ اللہ علیھم اجمعین

یہاں پر ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ سب اہل دنیا پر لعنت کیسے کر دی۔ جواب یہ ہے۔ کہ اصل میں یہ ترجمہ ہے۔ ایک حدیث کا۔ جس میں حضورؐ فرماتے ہیں :۔

الدنیا ملعونۃ وملعون ما فیھا الا ذکر اللہ وما والاہ او عالم او متعلم۔

یعنی دنیا خدا کی رحمت سے دُور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے۔ مگر خدا کا ذکر اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز اور عالم یا متعلم یعنی ذکر اللہ اور اس کے مقدمات ومتعلقات اور عالم ومتعلم کو تو خدا کی رحمت سے بُعد نہیں ہے۔ باقی سب رحمت سے

بعید ہیں اور واقع میں یہ استثناء منقطع ہے متصل نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم و متعلم پہلے ہی سے داخل نہیں۔ تو لعنت یعنی بعد عن الرحمۃ کا حکم خاص ان پر کرتے ہیں۔ جن کو دین سے تعلق نہ ہو۔ چنانچہ قرینہ اس کا وہ شعر ہے۔ جو بعد میں کہتے ہیں ؎

اہلِ دنیا کافران مطلق اند

روز و شب در زق زق و در بق بق اند

اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے۔ کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے کہ یہاں سب اہلِ دنیا کو کافر ہی کہہ دیا۔ مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہ فرمائی۔ جس کے بعد یہ قرینہ ہو گیا بعد عن الرحمۃ کے محل کا وہ توجیہ یہ فرمائی۔ کہ اہلِ دنیا مبتداء اور کافران مطلق خبر نہیں ہے۔ بلکہ اہلِ دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے مؤخر ہے۔ یعنی جو کافران مطلق ہیں وہی اہلِ دنیا ہیں۔ مومن اہلِ دنیا ہے ہی نہیں۔ کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے ملعون نہیں ہیں۔ تو کون مومن ایسا ہو گا۔ جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ نہ رکھتا ہو گا۔ غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت یعنی دین کے مقابلہ میں ہو۔

اسبابِ دنیا

باقی اسبابِ دنیا تو اس میں حدیث نے دو قسمیں کر دی ہیں ایک وہ جو آخرت میں کچھ دخل اور اس سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک وہ جو آخرت میں اصلاً دخل نہ رکھتی ہوں تو جو دنیا آخرت میں دخل نہیں رکھتی یہ حقیقت میں دنیا ہے محض اور مذموم ہے اور اسی کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے۔ تو حق تعالیٰ نے اس مقام پہ فیصلہ فرما دیا ہے۔ کہ ایسی دنیا متوجہ

ہونے کے قابل نہیں۔ بلکہ توجہ کے قابل تو آخرت ہے۔ اسی کو ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ۔

کہ حیات آخرت ہی سراپا حیات ہے۔ جس میں حصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ مرض تھا ہمارے اندر۔ جس کا حق تعالیٰ نے کس خوبی سے فیصلہ فرمادیا ہے۔ کہ دنیا و آخرت دونوں کے حالات یعنی لہو ولعب ہونا اور حیات کاملہ ہونا بتا دے۔ تا کہ دونوں کے حالات سننے کے بعد عاقل نہایت آسانی سے خود ہی فیصلہ کر سکے۔ کہ ان میں سے کون توجہ کے قابل ہے اور کون عدم توجہ کے قابل۔

ضرورتِ اخلاص

اور یہ حالت بتلا کر یہ بھی بتلا دیا۔ کہ جس طرح بعض کام جن کی صورت دنیا ہے اور وہ دخل رکھتی ہیں آخرت میں۔ واقع میں دنیا نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ لہو ولعب نہیں۔ اسی طرح اس کے مقابل وہ آخرت کا کام جو صورت میں آخرت کے ہیں اور واقع میں دنیا کے لیئے ہیں۔ وہ آخرت نہیں ہیں۔ ؎

کلیدِ درِ دوزخ است آن نماز
کہ در چشمِ مردم گذاری دراز

یعنی وہ نماز دوزخ کی کنجی ہے جس سے دوزخ کا دروازہ کھل جائے گا۔ جو ریا اور شہرت کے واسطے پڑھی جاوے۔ کیونکہ لہو ولعب کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں۔ کہ لعب وہ شغل ہے۔ جو ثمرہ سے خالی ہو۔ اور یہ نماز بھی فی الواقع ثمرہ سے خالی ہے۔ تو یہ دنیا ہوئی آخرت۔ یعنی دین نہیں ہوئی۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ

ایک شہید کو بلائیں گے۔

فیسئل عنه ماذا قدمت فیقول قاتلت فی سبیلك حتیٰ استشهدت فیقال لا بل انما قاتلت لیقال انك لجرئ فقد قیل فیؤمر به فیلقی فی النار او کما قال۔

اس سے پوچھیں گے۔ کہ تم نے ہمارے لیئے کیا کام کیا وہ کہے گا لیے رب میرے میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا تھا۔ یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ ارشاد ہوگا۔ نہیں تم نے جہاد اس لیئے نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس لیئے کیا۔ تاکہ لوگ یوں کہیں کہ بھئی بڑا ہی بہادر ہے۔ تو یہ کہہ دیا گیا یعنی جس کے لیئے تم نے جہاد کیا۔ وہ تم کو حاصل ہو چکا۔ پس اس کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اسی طرح ایک سخی کو بلائیں گے اور اس کا بھی یہی حشر ہو گا۔ کہ ہمارے لیئے تم نے سخاوت نہیں کی۔ بلکہ اس لیئے تم نے سخاوت کی تھی۔ لیقال انك جواد فقد قیل۔ تاکہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا سخی ہے۔ تو بہت تعریف ہو چکی۔

اسی طرح ایک عالم کو بلائیں گے۔ سوال ہو گا۔ تم نے کیا کیا۔ عرض کرے گا۔ میں نے آپ کی رضا کے لیئے وعظ کہا اور یہ کیا وہ کیا۔ ارشاد ہو گا نہیں۔ اس لیئے یہ کام نہیں کیا۔ بلکہ اس لئے لیقال انك لقادی۔ کہ یہ کہا جاوے۔ کہ یہ بڑے عالم ہیں۔ تو آپ کی بھی بہت تعریف ہو چکی۔ اب یہاں کیا رکھا ہے۔ تو دیکھیئے! شہادت، سخاوت، علم دین کی خدمت جو اس طریقہ مذکورہ فی الحدیث سے ہو۔ وہ بھی دنیا ہی ہے۔ اگرچہ صورت اس کی آخرت کی ہے۔ چنانچہ ایک خرچ کرنا کفار کا تھا۔ کہ اپنے نزدیک نیک کام سمجھ کر کرتے تھے۔ مگر پھر بھی ان کی مذمت کی گئی۔ کیونکہ وہ محض صورت دین تھی اور حقیقت میں وہ انفاق دین نہ تھا۔

چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔

یعنی کفار اپنے اموال اس لیے خرچ کرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو خدا کے راستہ سے باز رکھیں اور ایک خرچ اہل ایمان کا تھا۔ کہ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا۔ تاکہ خدا ہی کا نام بلند ہو۔ جیسے ارشاد ہے:۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ۔

کہ جو لوگ خدا کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خرچ کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک دانہ (زمین میں ڈالا گیا) ہو۔ جس سے سات بالیاں اگی ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ گویا ایک سے سات سو ہو گئے۔ دیکھئے حالانکہ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں خرچ کرتے ہیں اور دونوں کا انفاق بھی حیات دنیا ہی میں ہوتا ہے اور دونوں کا مقصد بھی بزعم منفق اعانت دین ہی ہوتا ہے۔ جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں فعل میں اشتراک ہے۔ مگر چونکہ یہ دین مقبول ہے۔ اس لیئے اس کے لیئے انفاق بھی دین ہے اور وہ دین باطل ہے۔ اس کے لیئے انفاق دنیا ہوا۔ گو صورۃً اتحاد و اشتراک ہے۔ مگر حقیقۃً دونوں میں بڑا فرق ہے اور اسی فرق کی وجہ سے ایک دنیا ہے اور ایک دین۔

اسی طرح ہر عمل کی یہی کیفیت ہے۔ کہ محض صورۃً دین ہونے سے وہ دین نہیں بن سکتا اور نہ صورۃً دنیا ہونے سے دنیا بنتا ہے۔ پس اس کی بڑی ضرورت ہے۔ کہ نظر و غور کر کے دیکھا جائے۔ کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ آیا وہ دین کے لیئے خلوص اور خوش نیتی سے کر رہے ہیں۔ یا ایسا نہیں۔ اگر خلوص سے کر رہے ہیں تو وہ مقبول ہے۔ ورنہ کچھ بھی نہیں۔

اقسامِ عامل

اب اس کے بعد دو قسم کی طبیعت کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں۔ جو دین کو دنیا کے واسطے کرتے ہیں۔ جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے۔ اور ایک وہ ہیں۔ جو دین کا کام اس لیئے بالکل چھوڑے بیٹھے ہیں۔ کہ نیت تو آخرت کی ہے ہی نہیں۔ پھر جانیت کے کر کے کیا کریں۔ چنانچہ یہی سمجھ کر بہت سے جاہل لوگوں نے نماز چھوڑ دی۔ کہ جیسی مطلوب ہے ویسی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ تو پڑھنے سے کیا فائدہ۔ بعض نے روزہ چھوڑ دیا۔ کہ جیسا ہونا چاہیئے ویسا تو ہو نہیں سکتا۔ پھر رکھنے سے کیا فائدہ۔ اے صاحبو! یہ بڑی غلطی ہے۔ روزہ و نماز حقیقی کے حاصل کرنے کی تدبیر بھی یہی ہے۔ کہ پہلے روزہ و نماز صوری کو اختیار کرو۔ گو خلوص نہ ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کی ضد بھی نہ ہو۔ خلو کا درجہ ہو۔ اسی سے خلوص ہو جاتا ہے اور کرتے کرتے نیت بھی درست ہو جاتی ہے اور یہ نفس کا حیلہ و بہانہ ہے۔ کہ جب کامل عمل نہیں ہوتا، تو ناقص کیوں کریں۔ سبحان اللہ کیا دنیا کے جتنے کام کامل ہوتے ہیں۔ وہ اول ہی دن سے کامل ہو جاتے ہیں۔

ہرگز نہیں۔ بلکہ مدت کے بعد کام کرنا آتا ہے۔ یہی حال اعمالِ آخرت میں بھی ہے۔ کہ کرتے کرتے ہی کمال حاصل ہو جائے گا۔ پس ناقص عمل بھی بیکار نہیں۔ بلکہ یہ ذریعہ ہے کامل کا۔ پس اعمال صالحہ میں خلوص کا قصد تو کرو لیکن اگر آج حاصل نہ ہو۔ تو عمل نہ چھوڑ بیٹھو۔ بلکہ کیئے جاؤ اور قصد بھی برابر رکھو۔ انشاء اللہ ایک دن ضرور حاصل ہو جائے گا۔

فضیلۂ امتِ محمدیہ

اس کے بعد کوتاہی اعمال کے اعتبار سے ایک اور تقسیم ہے۔ وہ یہ کہ ایک کوتاہی تو یہ تھی۔ کہ اعمال میں نفس کے حیلہ و بہانہ سے خود ہی مشغول نہیں ہوتے۔ اور دوسری کوتاہی یہ ہے۔ کہ جو لوگ خود اعمال میں مشغول بھی ہیں۔ انہیں دوسروں کی فکر نہیں ہے۔ وہ اپنے نوکروں کو، اپنے متعلقین کو بلکہ اپنے بچوں تک کو نماز پر مجبور نہیں کرتے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا باب ہی آج کل مفقود ہے۔

یاد رکھو! جیسے طاعت خود واجب ہے۔ ویسے ہی دوسروں کی طاعت کے لئے سعی بھی واجب ہے۔ مگر یہ سعی بقدر استطاعت واجب ہے۔ جہاں زبان کی استطاعت ہو، وہاں زبان سے کرے جہاں ہاتھ پاؤں سے کر سکے۔ ہاتھ پاؤں سے کرے۔ روپے پیسے سے کرے۔ خلاصہ یہ کہ محض اپنا عمل درست کر لینا کافی نہیں۔

دیکھئے! قرآن میں جہاں اس امت کے فضائل بیان کیئے گئے ہیں۔ ان میں بطور خصوصیت کے اصلاح غیر کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

اس آیت میں اس امت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں فضیلت ایمان باللہ کی تو ہر شخص کے پاس اپنے لیئے ہے اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی۔ یہ دوسروں کے نفع کے لیئے ہیں کیونکہ اس سے دوسرے پر نفع کا اثر پہنچتا ہے اور مقتضا قواعد کا یہ تھا۔ کہ یہاں تؤمنون باللہ کو مقدم فرماتے۔ کیونکہ وہ اساس اعمال

ہے۔ مگر مؤخر کرنے میں غالبا یہ نکتہ ہے۔ کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح غیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے۔ کیوں کہ اپنے ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کرلے گا۔ ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے۔

اصلاح میں عملی ترتیب

مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں۔ کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی بھی اصلاح واجب نہیں۔ بلکہ یہ تو محض عملی ترتیب ہے۔ کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیئے۔ پھر دوسرے کی کرے۔ یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر کو بھی نہ کرے۔ کیوں کہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں۔ ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو بھی ترک کرے گا۔ تو اس ایک کے ترک کا گناہ ہوگا۔ اور دوسرے کو ترک کرے گا۔ تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا۔ اور دونوں کو ترک کرے گا۔ تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔ تو یہ غلطی ہے۔ کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی ہو تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کرے۔

بعضے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ.

وہ اس سے یہی سمجھے۔ کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے۔ کیونکہ ہمزہ اتامرون پر انکار کے لیئے داخل ہوا ہے۔ تو امر بالبر منکر ہوا۔ یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو۔ لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو۔ مگر یہ محض غلط ہے۔ بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے۔ کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیئے۔ اس آیت کا

تو یہ جواب ہوگیا۔

وجوبِ اصلاحِ غیر

اب ایک دوسری آیت کا مطلب بھی سنیئے۔ جس سے ان لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے۔ کہ بے عمل کو وعظ و نصیحت نہ چاہیئے۔ وہ یہ ہے۔ کہ :۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

کہ تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو۔ جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے۔ کہ جو کام خود نہ کرو اسے کہو۔

دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑگئے۔ ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے۔ کہ جو کام خود نہ کرے۔ وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ تفسیر میں اسباب نزول سے آیات کے صحیح مطلب کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعوے کیا۔ کہ اگر ہمیں معلوم ہو جائے۔ کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے۔ تو ہم دل وجان سے اس کو خوب بجالائیں۔

اس پر ارشاد ہوا۔ کہ جہاد فی سبیل اللہ خدا کو بہت پسند ہے۔ بس یہ یہ سن کر بعضوں کا خون خشک ہوگیا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ کہ ایسی باتوں کا دعوے یا وعدہ کیوں کرتے ہو۔ جنہیں تم پورا نہیں کرسکتے۔ تو یہاں پر لم تقولون سے لم تعصون غیر کم یا قول امری وانشائی مراد نہیں ہے۔ بلکہ قول خبری وادعائی مراد ہے۔ حاصل یہ کہ یہ آیت دعوے کے باب میں ہے، دعوت کے باب میں نہیں۔ اس

کے شان نزول معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ میں آ گیا ہو گا۔ کہ اس آیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ممانعت سے کچھ بھی مس نہیں۔

غرض واجب تو دوسرے کی بھی اصلاح ہے۔ مگر اپنی اصلاح اس پر ضرورت میں متقدم ہے اور باوجود اس کے حق تعالیٰ نے اصلاح غیر کو مہمل نہیں چھوڑا۔ بلکہ جا بجا نہایت اہتمام سے بلا قید تقدیم اصلاح خود کے اس کا امر فرمایا ہے۔

اور وجہ اس کے اہتمام کی یہ ہے۔ کہ اپنی اصلاح کو تو ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور دوسرے کی اصلاح کا کچھ ایسا اہتمام نہیں کرتا۔ اس لئے دوسرے کی اصلاح کے لیئے زیادہ اس کے اہتمام کی ضرورت ہوئی اور اسی لیئے آیت کنتم خیر امۃ میں اس کو اصلاح نفس سے پہلے ذکر کیا۔ تاکہ اپنی اصلاح کے بعد دوسرے کی اصلاح سے بےفکر نہ ہو جاویں۔

مدارج اصلاح

البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک درجہ یہ ہے۔ کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے۔

افسوس! اس باب میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہو رہی ہے۔ خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں۔ مگر کبھی بیوی بچوں کو، نوکروں کو اور متعلقین کو نہیں کہتے۔ بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے۔ مگر نماز قضا کر دیں تو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے۔ کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے کو اگر کہنے

سے نہ پڑھے تو مار کے پڑھاؤ۔ اگر کوئی دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت سے بے نمازی ہوگا۔ تو اس کا سرپرست گنہگار ہوگا۔ تو اگر اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی۔ تو قوا انفسکم و اھلیکم میں اھلیکم کے کیا معنی ہوں گے۔

اور دوسرا درجہ یہ ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے۔ جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے۔ کہ:۔

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

اس میں بھی تخصیص نہیں اہل وعیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امر ونہی کی تاکید ہے۔

اسی طرح حدیث میں تاکید ہے۔ ارشاد ہے:۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک سے تم میں سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جاوے گا۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے۔ تو پھر آخر ان آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں۔ غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے۔ کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے۔

مسلمانوں کی بے حسی

مگر کیا کروں۔ اس وقت ایک واقعہ ایسا پیش آیا ہے۔ جس کی

خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں۔ کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دوسری قومیں مرتد بنا رہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی۔
وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کر کے آپ کو عبرت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے۔ کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں۔ کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔ تاکہ سب برابر ہو جاویں۔ جیسے ایک کیڑے سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کا برا ہونا۔ کہنے لگا کہ دوسروں کا برا ہونا۔ تاکہ میں بھی تو دوسروں کو اس نظر سے دیکھ لوں۔ جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔ تو کفار تو یہ چاہتے ہیں۔ کہ تم سب انہیں کے برابر ہو جاؤ۔

آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے۔ کہ :۔
فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ۔

ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ کیوں کہ جب ان کی یہ حالت ہے۔ کہ وہ دل سے تمہارا کافر بننا پسند کرتے ہیں۔ تو لامحالہ وہ تم سے مل کے اسی کی کوشش کریں گے۔ افسوس! مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ کہ ان کو مسلمان بنا دیں اور وہ دل میں ہر وقت یہی خیال رکھتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو کافر بنا دیں۔

صاحبو! برائے خدا تم ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ ہاں تھوڑی سی اتنی رعایت کر دیا کرو۔ کہ وہ تمہارے اخلاق کے گرویدہ ہو کر اسلام کا اثر قبول کریں۔ مگر افسوس کہ وہ تو رات دن اس کوشش میں منہمک ہیں۔ کہ پرائے مسلمانوں کو بھی کافر بنا دیں اور ہمیں اس کی بھی پرواہ نہیں۔ کہ ہمارے جو بھائی پہلے سے مسلمان ہیں۔ ان کو ہی اسلام کے اندر رکھنے

کی کوشش کریں۔

صحابہؓ کی جانفشانی

صحابہؓ نے تو کس جانفشانی سے اسلام پھیلایا تھا۔ آج ہم اپنی غفلت سے اُسے مٹا رہے ہیں۔ بعض اہل کفر کا مسلمانوں پر یہ بھی اعتراض ہے۔ کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ اب ہمارا زور ہے۔ ہم اس زور سے کام لے رہے ہیں۔ مگر یہ بالکل ہی غلط ہے۔ دراصل شمشیر کا استعمال مزاحمت کے روکنے اور مدافعت کے واسطے تھا۔ یعنی حفاظت اسلام کے لیئے تھا نہ کہ اشاعتِ اسلام کے لیئے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اس کا خوب ہی جواب دیا ہے۔ کہ بزور شمشیر اسلام پھیلانے کے لیئے شمشیر زنوں کی بھی تو ضرورت ہے۔ تو وہ شمشیر زن کس شمشیر کے زور سے جمع ہوئے۔ جنہوں نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا۔

دراصل اسلام پھیلا ہے اخلاق سے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اخلاق سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے۔ چنانچہ سیر و تواریخ اس پر شاہد ہیں۔ اگر ہم بھی ویسے ہی پکے مسلمان ہو جاویں۔ تو سچ جانیئے کفار ہمیں بھی دیکھ دیکھ کر مسلمان ہونے لگیں۔ مگر اب تو ہمارے اخلاق اس درجہ گر گئے ہیں۔ کہ انہیں مثال میں پیش کر کے کفار کو نفرت دلائی جاتی ہے۔

ایک شخص نے کسی کافر سے کہا تھا۔ کہ مسلمان ہو جا۔ اُس نے کہا کہ میں ایسا مسلمان تو ہو نہیں سکتا۔ جیسے بایزید ہیں۔ کیونکہ اس پہ قدرت نہیں اور ایسا مسلمان ہونا جیسے تم ہو۔ میں پسند نہیں کرتا۔ اس سے تو میں کافر ہی اچھا۔

ہماری اخلاقی پستی

صاحبو! اس کافر کا یہ کہنا تو بالکل ہی لغو ہے۔ کافر تو کسی طرح مسلمان سے اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ظالم مسلمان رحم دل کافر سے بھی بدرجہا یقیناً بہتر ہے اور رحمدل کافر کو ظالم مسلمان سے بہتر وہی کہے گا۔ جسے دنیا کا بھی قانون معلوم نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ فرض کرو۔ ایک شخص اعلیٰ درجہ کا ڈگری یافتہ ہے اور نہایت مہذب ہے۔ مگر ہے حکومت کا باغی۔ اور ایک جاہل جرائم پیشہ اور چور ہے۔ کہ سزا بھی پاتا ہے اور پکڑا بھی جاتا ہے مگر حکومت کا باغی نہیں۔ بلکہ مطیع و فرمانبردار ہے۔ میں اہلِ تمدن سے پوچھتا ہوں۔ کہ بتلائیں قانون کے اعتبار سے اور گورنمنٹ کی نظر میں کون شخص بڑھا ہوا ہے اور کون گھٹا ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ جاہل گو اس میں سارے عیب ہیں۔ مگر ایک وصف فرمانبرداری اس میں ایسا ہے۔ کہ تھوڑے دنوں میں وہ سزا کے بعد پھر ویسا کا ویسا ہی مقبول و مقرب ہو جاوے گا۔ جیسا کہ جرم سے پہلے تھا اور یہ تعلیم یافتہ جس میں ہزاروں خوبیاں ہیں۔ بغاوت کی وجہ سے ہیچ در ہیچ ہے۔ کیونکہ یہ ایسا عیب ہے۔ کہ سب خوبیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اسی لیئے یہ ہمیشہ مبغوض اور معتوب رہے گا۔ پس یہی فرق ظالم مسلمان اور رحمدل کافر میں خدا کے نزدیک ہے۔ تو اب اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر ایسا کہے۔ کہ ظالم مسلمان سے رحمدل کافر اچھا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے وہ اسلام کو حق نہیں سمجھتا۔ حیرت کی بات ہے۔ کہ اسلام کو حق سمجھنے کے بعد یہ شبہ کرے۔ کہ مسلمان سے کافر افضل ہو سکتا ہے۔ بہرحال جب یہ مسلمان خدا کے نزدیک افضل ہے۔ تو اس کافر کی یہ غلطی تھی۔ جو اس نے اپنے کفر کو اس کے اسلام پر ترجیح دی۔ مگر میں یہ کہتا ہوں۔ کہ ہماری حالت ایسی کیوں ہے

کہ دوسرا شخص ہمارے متعلق زبان پر یہ حرف لا سکے۔ غرض ہماری حالت ایسی گری ہوئی ہے کہ کفار بھی ہم پر طعن کرتے ہیں۔

تقلیدِ یورپ

چنانچہ اس حالت کا حاصل یہ ہے۔ کہ اگر اخلاق بھی سیکھیں گے۔ تو وہ بھی کفار سے لیئے ہوئے۔ جیسے حریت۔ مساوات۔ ایثار۔ ہمدردی یہ سب الفاظ یورپ ہی سے سیکھے ہیں۔ باقی جو دراصل ہمارے اخلاق ہیں۔ ان کی تو گویا ضرورت ہی نہیں۔ کہ داڑھی رکھیں، نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، استطاعت ہو تو زکوٰۃ دیں اور حج کریں اور معاملات و معاشرات کو درست کریں۔

اس پر مجھے اکبر الہ آبادی کا ایک شعر یاد آیا۔ جو اس واقعہ پر کہا گیا ہے۔ کہ جب انگریزی پڑھنے کو منع کیا گیا تھا۔ تو جواب میں یہ کہا گیا تھا۔ کہ واہ اس میں تو اسلام کی شان بڑھے گی۔ کہ مسجد کے دروازے پر جج اور کلکٹر دکھائی دیں گے۔ حالانکہ یہ سب حساب شیخ چلی کا سا تھا۔ جس کو ایک بقال نے مزدوری پر گھی کا گھڑا اسپرد کیا۔ اب وہ گھڑا سر پر رکھ کر اس کے ساتھ ہو لیئے اور یہ سوچنے لگے۔ کہ مزدوری کا پیسہ ملے گا۔ تو اس سے ایک انڈا خریدوں گا اور کسی کی مرغی کے نیچے رکھ دوں گا۔ اُس سے بچہ نکلے گا۔ پھر اس سے انڈے حاصل ہوں گے۔ پھر اُس کو ان انڈوں پر بٹھا دوں گا۔ تو بہت سے بچے نکلیں گے۔ تین چار بار ایسا ہی کروں گا۔ جب زیادہ ہو جاویں گے۔ تو سب کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا۔ پھر گھوڑا پھر ہاتھی لوں گا اور پھر شادی کروں گا اور بچے ہوں گے۔ جب بچہ پیسہ مانگے گا۔ تو میں کہوں گا ہشت۔ آخر کا قصہ آپ نے اتنے زور سے سو چا کہ گردن کو جھٹکا لگا اور گھی کا گھڑا سر سے

گر گیا۔

مالک نے کہا یہ کیا کیا؟

آپ کہتے ہیں۔ میاں جاؤ بھی میرا تو سارا کنبہ تباہ ہو گیا۔ تمہیں اتنے سے گھی کی پڑی ہے۔ تو بہرحال اسی طرح انگریزی سے انہوں نے حساب لگایا تھا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اسلام سے اور بُعد ہو گیا۔ سو اس معنی میں انہوں نے یہ شعر کہا ہے۔ ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنت کوئی جج ہے

غرض یہ سب یورپ کی تقلید ہے کہ ایثار۔ ہمدردی۔ مساوات وغیرہ الفاظ یاد کر لیے اور وہ بھی محض نقل ہی نقل ہے۔ ان جیسے وہ بھی نہیں۔ اور نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور داڑھی کی تو کچھ فکر ہی نہیں ہے۔

اے صاحب: اسلام پر اسلام کے طور سے نظر کرو۔ واللہ اگر ہم ویسے ہی مسلمان ہوتے۔ جیسا اسلام چاہتا ہے۔ تو ہمارے اقوال، افعال اور احوال ہی کفار کے لیے ہادی ہو جاتے اور اگر ہادی نہ بھی ہوتے۔ تو کم از کم ان کی عداوت تو ہم سے کم ہو جاتی۔ ہمارے اسلاف کے تو یہ کارنامے تھے۔ کہ غیر قومیں اُن میں خود بخود جذب ہوتی تھیں۔ اگر تم غیر قوموں کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم اپنے بھائیوں کو تو اُن میں جذب ہونے اور گرنے سے تھام لو۔ بس اب تو وہ حالت ہے۔ کہ ؎

اے آنکہ باقبال تو در عالم نیست
گیرم کہ غمت نیست غم ما ہم نیست

ہم نے مانا کہ تمہیں غیر قوموں سے خود اپنا اندیشہ نہیں۔ مگر اپنے

بھائیوں کا تو غم ہونا چاہیئے۔ کہ غیر قومیں ان کو تباہ کر رہی ہیں۔

تبلیغ میں کوتاہی

اس معاملہ میں ایک بڑی کوتاہی یہ بھی معلوم ہوئی۔ کہ ہم سے حق بات اپنے بھائیوں تک پہنچائی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ سننے میں آیا ہے۔ کہ جب مبلغین محلِ ارتداد میں پہنچے۔ تو ان لوگوں نے یہ کہا۔ کہ ہم نے دس بارہ برس میں آج عالم کی صورت دیکھی ہے۔ اگرچہ ہم نے ساری دُنیا کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ہمیں چاہیئے کہ جتنا ہم سے ہو سکے کوشش تو کریں۔ کیوں کہ اس کی ہم سے پوچھ گچھ ہو گی۔

اور کامیابی یا ناکامی پر ہمیں توجہ نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم سے اُس کی پُوچھ نہیں ہو گی۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی چاہتے تھے۔ کہ دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہے اور حق تعالیٰ نے آپ کو خاص طور پر اسی کام کے لیئے بھیجا بھی تھا:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا۔

مگر باوجود اس کے صاف فرما دیا گیا۔ کہ آپ سے یہ سوال نہیں ہو گا۔ کہ تمہارے زمانہ کے کچھ لوگ دوزخی کیوں ہوئے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔ کہ:۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ۔

شاید آپ (ان کفار کے پیچھے) اپنی جان کھپا دیں گے اور ایک جگہ فرمایا:۔

لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ

حاصل یہ کہ آپ اُن کے (ایمان نہ لانے پر) غمگین نہ ہوں۔ اس

عمر فاروق@ون اردو

سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ گو آپ کا یہ فرضِ منصبی نہ تھا۔ کہ آپ اس قدر تبلیغ کوشش فرماویں۔ مگر آپ اپنی طبعی رحمت و شفقت کے تقاضے سے یہ چاہتے تھے۔ کہ ایک بھی دوزخی نہ رہے اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ تو آپ کو صدمہ ہوتا تھا۔ اس صدمہ کے دفعہ کرنے کے لیئے یہ ارشاد ہوا ہے۔ کہ آپ اس کی کچھ فکر نہ کریں۔ نہ آپ اپنی جان کھپائیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا۔

اگر آپ کا رب چاہتا تو سب کو ہدایت ہو جاتی۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔

کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتے ہیں؟ استفہام انکار کے لیئے ہے۔ یعنی آپ کا کام کوشش کرنا ہے اور کوشش پر پھر خدا جسے توفیق دے گا ایمان لے آوے گا۔ آپ مجبور کیوں کرتے ہیں۔ کوئی شخص بغیر خدا کے حکم کے مومن نہیں ہو سکتا۔

ثمرۂ تبلیغ

اس سے معلوم ہوا۔ کہ کوشش کے معنی یہ نہیں۔ کہ ثمرہ ضرور مرتب ہو۔ مثلاً مرتدین کو تبلیغ کریں تو وہ ارتداد سے بچ ہی جاویں۔ بلکہ کوشش کے معنی یہ ہیں۔ کہ جو کام تمہارے قبضہ میں ہے وہ کر ڈالو۔ ان کو سمجھاؤ دکھاؤ اسلام کے محاسن بتلاؤ۔ بس اس طرح کوشش کرو۔ اگر خدانخواستہ پھر بھی ناکامی ہو تو رنج مت کرو۔ کیونکہ تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے۔

یہ بھی ایک مرض ہے نفس کا۔ کہ اس کو اپنی بات کا رائیگان جانا ناگوار ہوتا ہے۔ اس وقت میں اسی کا علاج کر رہا ہوں اور ان آیتوں کا حاصل بھی یہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوشش کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں

عمر فاروق@ون اردو

ایک تو یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔ ایک یہ کہ ایسی کوشش کرے۔ کہ اگر ناکامی ہو تو گھل گھل کے جان دے دے۔ یہ دونوں درجے غیر محمود اور ناپسندیدہ ہیں۔ اس میں دو راز ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے کے فعل پہ قدرت نہیں۔ اس پہ رنجیدہ ہونے کے یہ معنی ہوتے۔ کہ یہ ہمارے قبضہ کی بات تھی۔ مگر نہیں ہوئی۔

اور دوسرا امر ذرا باریک ہے۔ وہ یہ کہ یہ بتاؤ۔ کہ دین کس کا ہے خدا کا تو اس کی حفاظت خدا کا وعدہ ہے۔ پھر تمہارے رنج کا منشاء یہ ہے۔ کہ اگر ناکامی کی یہی رفتار رہی۔ تو خدانخواستہ ایک دن اسلام مٹ جاوے گا اور وعدہ صحیح نہ رہے گا۔ تو یہ منشاء ہی غلط ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ پر اعتماد نہیں رہا۔ یاد رکھو کہ یہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ کیوں کہ اس کے محافظ تو خود وہ ہیں۔ جو تمہارے بھی محافظ ہیں۔

اب شاید یہ کہو گے۔ کہ پھر ہمیں کوشش کرنے کو کیوں کہا گیا۔ سو اس لیئے کہا گیا۔ تاکہ تم کو ثواب ہو اور اجر ملے۔ تمہارا تعلق دین سے ظاہر ہو۔ محبت کے آثار نمایاں ہوں۔ یہ تو اُن کی کمال عنایت و رحمت ہے۔ کہ اُنہوں نے تمہارے ثواب کے لیئے ایک بہانہ بتلا دیا ہے۔ باقی ثمرہ تو اُن ہی کا تصرف ہے۔ ؎

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

بس تمہاری نیک نامی کے واسطے بظاہر تمہارے متعلق یہ کام کر دیا ہے۔ کہ تم ذرا سی کوشش کر کے مقبول ہو جاؤ گے۔ ورنہ کام تو وہ خود کر سکتے ہیں۔ وہی محافظ ہیں۔ اس لیئے غم کبھی نہیں کرنا چاہیئے۔

اور ان دو رازوں کے علاوہ تیسری خرابی اس کاوش میں یہ ہے کہ اس غم کی وجہ سے طبیعت سست ہو جاتی ہے اور اس سے رفتہ رفتہ کوشش سے معطل و بےکار ہو جاتا ہے۔ تو جو منشا تھا غم کا یعنی ناکامی۔ وہ اور اچھی طرح واقع ہوتی ہے اور شریعت کا مقتضا یہ ہے۔ کہ مسلمان سست نہ ہونے پاویں۔ اس لیئے زیادہ رنج مناسب نہیں اور گو رنج کے موقع پر رنج کو منع کرنے سے ظاہر میں شبہ ہوتا ہے۔ کہ یہ تو شفقت کی کمی کی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر راز اس میں یہ ہے۔ کہ جب ایسی چیزوں کا غم کروگے جو تمہارے قبضہ میں نہیں ہیں۔ تو خواہ مخواہ سست ہو جاؤ گے اور اس سے اصل کام میں خلل واقع ہوگا۔ تو خلل کو گوارا کرنا یہ ہے۔ شفقت کی کمی اور کام جاری رکھنا تو عین شفقت ہے غرض اعتدال کے ساتھ کام کیئے جاؤ۔

تبلیغ میں اعتدال

اس کام کو اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔

سبحان اللہ کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی و لطافت سے اللہ کی سبیل کی طرف بلاؤ اور راہ راست پر لاؤ۔ یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے یا مکاتب و مدارس کے ذریعہ سے ہونا چاہیئے۔ یعنی مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جا کر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب و مدارس وہاں پر قائم کر دیئے جاویں۔ ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہو۔ اُسے اختیار کرنا چاہیئے۔ بس یہ تو ہمارا کام ہے۔ اسے پورا

کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کر دو۔ ناکامی کے متعلق تو کہہ چکا اب کامیابی کے متعلق بھی کہتا ہوں۔ کہ اگر خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاؤ تو نازست کرو۔ جیسے ہم سے یہ غلطی بھی ہوتی ہے اور اس وقت ہماری حالت اس شعر کا مصداق ہوتی ہے۔ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یعنی ہماری جو حالت ہے۔ وہ اعتدال سے باہر ہے۔ نہ ناکامی میں حدود پر رہتے ہیں نہ کامیابی میں۔ پس سنیئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی کے متعلق دو ارشاد ہیں۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہیئے اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے۔

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۔

بہت مت خوش ہو۔ خدا پسند نہیں کرتا زیادہ خوش ہونے والوں کو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خوش نہ ہونا چاہیئے۔ پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل ان میں تعارض نہیں۔ بلکہ یہ دونوں حالتیں جدا جدا ہیں۔ جن کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔ ایک خوشی اضطراری ہے۔ جس کی صورت یہ ہے۔ کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپے یا اشرفیوں کی کھو گئی۔ جس سے آپ بہت پریشان ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں۔ کہیں پتہ نہیں چلتا۔ کہ دفعۃً کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی۔ ایک خوشی تو اس وقت ہے۔ یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہو گی۔ اور ایک یہ صورت ہے۔ کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پیٹا۔ اب خدا جانے۔ وہ ان کو ملی یا نہیں

مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لاکر دے دی۔ ایک خوشی اس پر ہے۔ یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی۔ وہ اترانے کی نہ ہوگی۔ بلکہ شکر کی ہوگی۔ کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ کھوئی ہوئی چیز مل گئی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی۔ کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی۔ ورنہ یہ ہیانی کیسے ملتی۔ تو ان دونوں میں پہلی خوشی محمود ہے اور دوسری مذموم۔

اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا تو مضائقہ نہیں۔ باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا۔ کہ ہم نے یوں کیا تو کیا اچھا اثر ہوا۔ یہ مذموم ہے۔ بہر حال ہم کو کوشش کرنی چاہیئے اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کرنا چاہیئے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہیئے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہیئے۔ کام شروع کردو۔ اس کے سب راستے خود کھل جائیں گے۔ بقول مولانا رومیؒ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

یعنی جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو قصر مبتلع میں بند کیا تھا۔ تو اسوقت وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے تھے حالانکہ محل کے سات دروازے تھے اور ساتوں دروازوں میں زلیخا نے قفل ڈال دیئے تھے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم تھا۔ مگر چونکہ نبی تھے۔ اس لیئے آپ نے یہ سمجھا۔ کہ گو دروازے مقفل ہیں۔ مگر جتنا میرا کام ہے۔ وہ تو میں کروں۔ کم از کم دروازہ تک تو بھاگوں۔ چنانچہ بھاگے اب جس دروازہ کے پاس پہنچتے تھے۔ قفل خودبخود ٹوٹ کر گر پڑتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور یہ بچ گئے۔ مولانا اسی کو یاد دلاتے ہیں۔

؎ گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

تو بس تم بھی دوڑو اور یوں سمجھو۔ کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اُسی کے فضل سے سب کچھ ہوگا۔ پھر اگر کوشش کی اور تمہاری کوشش سے لوگ ارتداد سے بچ گئے۔ تو ناز مت کرنا۔ بلکہ شکر کرنا۔ غرض یہ دونوں درجے مطلوب نہیں۔ یعنی ایک یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ کوشش پر کامیابی کو لازماً مرتب سمجھے۔ جیسے سوداؔ نے ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے۔ جو خود بھی کام نہیں کرتے اور کام کرنے والوں کو یہ الزام دیتے ہیں۔ کہ میاں تم نے کیا کام کیا۔ جو نتیجہ مفید نہ نکلا۔ ؎

سوداؔ قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تبلیغ بقدرِ استطاعت

مگر اس کوشش کے لیئے ایک شرط بھی ہے۔ یعنی استطاعت۔ اور یہ سب کچھ میں اُن ہی کاموں کے لیئے بیان کر رہا ہوں۔ جو اسباب ظاہرہ کی رُو سے اپنی قدرت میں ہوں۔ یہ سب کوشش اور کوشش پہ اجر اور دوسرے احکام ایسے ہی کاموں کے لیئے ہیں۔

اور ایک وہ کام ہیں۔ جو اسباب ظاہرہ کی رُو سے اپنی قدرت واستطاعت سے باہر ہیں۔ ان کے لیئے کوشش کرنا فضول ہے۔ نہ مامور بہ اور نہ ایسی کوشش پر کچھ اجر۔ مثلاً کوئی شخص سورج کو قبضہ میں کرنے کے لیئے آسمان کی طرف ہر روز کُودا کرے اور یہ سمجھے۔ کہ اگر کبھی گر کے مروں گا۔ تو شہید مروں گا۔ تو یہ محض خبط ہے۔ کیونکہ یہ فعل اس

کی قدرت و استطاعت سے باہر ہے۔ اس لیئے اس پر بجائے آجر کے باز پرس ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ:-

لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسہٗ۔

یعنی مومن کو مناسب نہیں۔ کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ صحابہ رضؓ نے پوچھا۔ یارسول اللہ۔ مومن اپنے کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:-

یتحمل من البلاء لما لا یطیقہ۔

ایسی بلا اپنے ذمہ لے جس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب میں پوچھتا ہوں۔ کہ جہاں جہاں یہ خطرہ ارتداد رونما ہے۔ کوشش سے پہلے یہ دیکھیئے۔ کہ وہاں جانا اور تبلیغ کرنا جسًا و قانونًا آپ کی قدرت میں ہے یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھو۔ کہ اس میں چندہ دینا جسًا یا قانونًا کوئی جرم تو نہیں۔ جب ان باتوں کا اطمینان ہوجاوے تو پھر یہ متعارف تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں اور اس کے بعد نتیجہ سے کچھ بحث نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ دوسرے کا فعل ہے اور قادر بقدرت غیر قادر نہیں ہوتا۔ ایسی غیر مقدور چیز کے پیچھے پڑنا محض غلو ہے جس کی اسلام کو حاجت نہیں۔ اب تو دو چار ہزار کے ارتداد کی خبر ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ اگر پندرہ بیس لاکھ بھی خدانخواستہ مرتد ہوجاویں تو اسلام میں کچھ کمی نہیں آسکتی۔ ؎

چراغے را کہ ایزد برفروزد
ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

سعیٔ تبلیغ پر شبہ

اگر کوئی کوشش کے متعلق یہ کہے۔ کہ جب اللہ میاں ہی دین کی حفاظت کریں گے۔ تو ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت؟ ہاں تو پھر

قرآن بھی حفاظت کیا کرو۔ کیونکہ انہوں نے اس کی حفاظت کا تو خاص طور پر وعدہ کیا ہے۔ اللہ میاں کی حفاظت کا مطلب یہی تو ہے کہ ہمیں حفظ کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ پس یہ سب حفاظت میں داخل ہے۔

اس حفظ کرنے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ بعض فرقوں کو حفظ قرآن کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان میں سے کان پور میں ایک شخص کا یہ مقولہ سُنا تھا۔ کہ ہم اس واسطے قرآن حفظ نہیں کرتے۔ تاکہ ہم اور اللہ میاں برابر نہ ہو جائیں کیوں کہ وہ بھی حافظ ہیں اور اگر ہم بھی حافظ ہو جاتے تو نعوذ باللہ ان کے برابر ہو جاتے۔

میں نے کہا کہ وہ تمہارا ہی خدا ہوگا جس کے برابر ہر حافظ ہو سکے ہمارے خدا کے برابر تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ چاہے کوئی کتنا ہی کمال حاصل کرلے۔ پھر اگر اس خیال سے حفظ قرآن ترک کیا گیا ہے۔ تو علم کو بھی ترک کیا ہوتا۔ تاکہ مساوات لازم نہ آوے۔ کیوں کہ ہم جاہل ہیں اور اللہ میاں عالم۔ تو ہم علم حاصل نہ کریں۔ تاکہ اُن کی برابری لازم نہ آئے مہمل اور لغو باتیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوتے۔ کہ نعوذ باللہ اللہ میاں ہمارے بڑا بنانے سے بڑے بنے ہوتے ہیں۔

بلکہ حق تعالیٰ کی اس صفت پر نظر کر کے تو اور زیادہ حفظ کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ تاکہ تخلق باخلاق الٰہیہ نصیب ہو۔ چنانچہ اللہ میاں نے اپنی تقلید واتباع کا بعض افعال میں حکم بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

یعنی اللہ اور اس کے فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ پس اے مومنو! تم بھی درود بھیجو۔ اب یہاں کہو کیا کہتے ہو۔

کیا تم یہ کہہ سکتے ہو۔ کہ جب اللہ میاں درود بھیجتے ہیں۔ تو ہم کیوں بھیجیں۔ اس میں تو برابری ہو گی۔ بلکہ یہی کہو گے۔ کہ اب تو ہمیں اور زیادہ صلوٰۃ وسلام کا ورد کرنا چاہیئے۔ جب اللہ میاں آپ کی اتنی عظمت ظاہر فرماتے ہیں۔ تو ہم کس شمار میں ہیں۔

اس پر مجھے وطن کا اپنے بچپن کا ایک قصہ یاد آیا۔ کہ ہمارے والد باوجود ثروت و دولت کے منکسر المزاج بہت تھے۔ ایک مرتبہ برسات کے موسم میں کھرپا لے کر وہ خود ہی چھت پر گھاس چھیلنے کو جانے لگے۔ اور مجھ سے فرمایا تم بھی چلو۔ تائی صاحبہ نے فرمایا۔ جوان بیٹے سے ایسا کام نہیں لیا کرتے۔ انہوں نے مان لیا اور تنہا خود چھت پر چڑھ گئے۔ اس وقت تائی صاحبہ نے کہا کہ جب تمہارے باپ گھاس چھیلنے گئے ہیں۔ تو اب تمہیں بھی ضرور جانا چاہیئے۔ تو اسی طرح یہاں سمجھو۔ کہ حفاظت اسلام کا کام جب اللہ میاں خود کرتے ہیں۔ تو بندہ کو ضرور کرنا چاہیئے اور اگر اس شخص کی بیہودہ بات مان لی جاوے۔ تو لازم آوے گا۔ کہ کوئی اچھی بات نہ کریں۔ کیوں کہ وہ تو اللہ میاں بھی کرتے ہیں بس سب برائیاں ہی برائیاں کرنی چاہیئیں۔ کیونکہ وہ اللہ میاں نہیں کرتے۔ نعوذ باللہ خدا کی پناہ ہے ایسی جہالت سے۔ بس یہ بندہ کو سمجھنا چاہیئے کہ جب ہمارا کام وہ خود ہی کرتے ہیں۔ تو ہم خود کیوں نہ کریں۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم نہ کریں گے۔ تو یہ کام اٹکا پڑا رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ۔

یعنی اگر تم اسلام کی حفاظت و خدمت نہ کرو گے۔ تو وہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو قائم کر دیں گے۔ جو تمہاری سی (نافرمان) نہ ہو گی۔ نعوذ باللہ۔ حق تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں۔

اجتماعی تبلیغ کی ضرورت

باقی اس عالم امتحان میں اُن کی عادت یہ ہے۔ کہ وہ ہمارے کام کسی ظاہری واسطہ سے کیا کرتے ہیں اور یہ ہماری سعادت ہے۔ کہ ہم اُن کاموں کا واسطہ بنیں۔ بہرحال اس وقت یہ فتنے اسلام کے مٹانے کے دوسری قوموں کی طرف سے پیش آرہے ہیں۔ جس کی سب مسلمانوں کو مجتمع ہو کر مدافعت کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہاں کانپور میں بھی چند باحمیت مسلمانوں نے اس کام کا ارادہ کیا ہے۔ مگر اس کے لیئے سامان و سرمایہ کی ضرورت ہے۔ تاکہ مبلغین اس سرمایہ سے وہاں جاویں اور اسلام سے اعدائے دین کی تہمتوں کو ہٹادیں اور چونکہ اس قسم کے کام میں عادۃ اللہ یہ ہے۔ کہ اکثر غرباء ہی کی ہمتوں کی برکت سے انجام پاتے ہیں۔ اس لیئے ضروری ہے کہ اگر چندہ کیا جاوے۔ تو اس میں ان کو بھی شریک کریں۔

نیز جو لوگ خود جاکر تبلیغ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے پیسے ہی کو اپنا قائم مقام کردیں اور اس میں قلیل و کثیر سے مت شرماؤ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی دیکھ بھال نہیں ہے۔ کس کے روپے زیادہ ہیں۔ وہاں تو نیت اور خلوص کی دیکھ بھال ہے۔ ممکن ہے۔ کہ تمہارے خلوص کی بدولت ایسی کامیابی ہو جاوے۔ کہ آئندہ اس کوشش ہی کی ضرورت نہ رہے۔ مگر میرے نزدیک یہ کام اتنا ضروری ہے کہ بطور حفظ ماتقدم کے اسے ہمیشہ جاری رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ مسلمانوں میں بعض جگہ اس قدر جہالت بڑھی ہوئی ہے۔ کہ مردے تک بلا نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایسے نام کے مسلمان نہیں ہوتے۔ جیسے یہ لوگ ہیں جن میں ارتداد کا اندیشہ ہے۔ تاہم احکام کی تبلیغ اور تعلیم نہ

ہونے سے انہیں بھی کچھ خبر نہیں۔

مجھے نام کے مسلمانوں پر یہیں نواح کانپور میں موضع گجنیر کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے وہاں جاکر خود دیکھا۔ کہ وہ برائے نام ہی مسلمان ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ کہ میاں تم کون لوگ ہو۔ مسلمان ہو۔ کہنے لگے۔ ہم کیوں ہوتے مسلمان۔ میں نے کہا۔ اچھا تو ہندو ہو۔ کہنے لگے۔ ہم کیوں ہندو ہوتے۔

؎ از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد

میں نے کہا۔ آخر پھر کیا ہو۔ کہنے لگے ہم نومسلم ہیں۔ گویا ان کے خیال میں نومسلم ہندو اور مسلمان کے درمیان میں تیسری قسم ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ وہاں کے زمیندار سے ملے اور انہیں شربت دیا گیا۔ تو نہیں پیا۔ کہ مسلمان کے ہاتھ کا شربت پینے میں ہم اپنی برادری میں بدنام ہو جاویں گے۔

ایک مرتبہ ایک مبلغ کو وہاں ایک گاؤں میں بھیجا۔ چونکہ ان لوگوں سے روٹی تک دینے کی امید نہ تھی۔ اس لیئے ان مبلغ سے کہا گیا۔ کہ بھئی! ستو باندھ کر لے جاؤ۔ تو ان لوگوں نے ستو گھولنے کے لیئے اپنے برتن تک نہ دیئے۔ ان بے چاروں نے رومال پر ستو رکھ کر اس پر پانی چھڑک کر تب کھایا۔

اور دراصل یہ ہماری کوتاہی ہے۔ کہ ہم لوگوں کو نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام ہی نہیں ہے۔ شہروں میں مدرسے بھی ہیں۔ یتیم خانے بھی ہیں سب کچھ ہے۔ مگر کوئی نومسلم خانہ نہیں ہے۔ اگر کبھی کسی کو مسلمان بھی کیا تو بڑی بڑائی ہوگی کہ اسے ایک پرچہ لکھ کر دے دیا۔ کہ جا بھئی! ماتگ اور کھا۔ اگر ایسا ہوتا۔ کہ کم از کم چھ مہینے تو اس کو اپنے پاس رکھتے اور ضروری عقائد اور ضروری اعمال نماز روزہ وغیرہ سکھلاتے۔ تو کیا اچھا ہوتا۔ مگر

اس کا ذرا بھی اہتمام نہیں۔ اب تو بس مسلمان بنا کر سانڈ کی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح کے یہ لوگ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ کہ اُن کو بھی کسی نے یوں ہی مسلمان بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اُن کو کبھی تعلیم و تلقین نہیں کی گئی۔ اور نہ اس کے بعد پھر کوئی ان کا پُرسانِ حال ہوا۔ نہ کوئی واعظ ان کے پاس گیا۔ کیونکہ ہم لوگ جہاں پلاؤ قورمہ کی اُمید ہوتی ہے۔ وہاں تو خوب دوڑ کر جاتے ہیں اور ایسی جگہ جہاں ستو گھول کے کھانا پڑے، جانے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

امیروں تک تبلیغ

بہرحال انتظام کے ساتھ ایک جماعت قائم کر کے وہاں ہم کو جانا چاہیئے اور کام کرنا چاہیئے۔ اگر یہ طریقہ تبلیغ و اشاعت کا ہندوستان میں جاری ہو جاوے۔ تو پھر اُسے امریکہ اور یورپ تک وسعت دینی چاہیئے اور وہاں بھی اپنے مبلغین بھیجنا چاہئیں۔ مگر پہلے ہی دن بہت اُونچے نہ اُڑو۔ اوّل ہندوستان کی تو خبر لو۔

بے عمل مبلغ

بہرحال یہ بہت ضروری کام ہے۔ اب اس میں چند کوتاہیاں اور بھی ہوتی ہیں۔ اُن کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ بسا اوقات جو مبلغ ہوتے ہیں۔ خود اُن کی حالت درست نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب اُستاد ہی ناقص ہو گا۔ تو شاگرد تو اور بھی انقص ہو گا۔ تو سب سے پہلے مبلغ کو اپنے عمل کی اصلاح ضروری ہے۔ تاکہ اُن پر اثر اچھا پڑے۔ یہ غلطی تو اہلِ علم ہی کی تھی۔

عوام کی غلطی

اب ایک خطا اور کوتاہی عوام کی ہے۔ وہ یہ کہ ان کا کام سرمایہ جمع کرنا تھا۔ پھر مولوی اس سرمایہ سے سفر کرتے اور پھر چونکہ اُن کے ساتھ اپنی ضروریات بھی تھیں۔ مثلاً وہاں تبلیغ کے لیئے جائیں۔ تو اپنے پیٹ کو کہاں رکھ کر آویں۔ بیوی بچوں کو کیا کریں۔ اس لیئے ضرورت تھی سرمایہ سے اُن کی مدد کی جاتی۔ تاکہ یہ بے فکری سے کام کرسکیں۔ مگر عوام کو اس کا احساس ہی نہیں۔

ایک صاحب مجھ سے ملے اور کہنے لگے۔ ارے صاحب، یہ ساری خطا مولویوں کی ہے۔ کہ انہوں نے ان لوگوں کی کبھی خبر نہ لی۔ میں نے کہا پہلے تو تمہاری خطا ہے۔ کہ تم نے سرمایہ جمع کر کے ان کو نہیں دیا۔ آخر مولوی کام کریں تو بے چارے کہاں سے کریں۔ اس میں سرمایہ ہی تو بلی کی میاؤں ہے۔ لیکن عوام کے ساتھ اس میں تھوڑا سا قصور مبلغین کا بھی ہے۔ وہ یہ کہ جہاں سرمایہ کا انتظام بھی ہوا ہے۔ وہاں بے دریغ روپیہ اُڑا ڈالتے ہیں۔ مثلاً خود اپنے پیسے سے جاتے تھرڈ میں بھی سفر نہ کریں گے۔ مگر چندہ کا پیسہ ایسا مفت کا ہے۔ کہ اب سیکنڈ سے کم میں نہیں بیٹھ سکتے۔

چندے میں احتیاط

بہر حال ان سب کوتاہیوں سے احتیاط کر کے سرمایہ ضرور جمع کرو۔ سرمایہ ہی اصلی چیز ہے۔ بدوں اس کے نری تجویزیں ایسی بے کار ہیں۔ جیسے ایک دفعہ بہت سے چوہے جمع ہوئے۔ انہوں نے سوچنا شروع کیا۔ کہ کوئی ایسی تجویز ہو سکتی ہے۔ کہ بلی کو پکڑ لیں۔ کیونکہ یہ ہم کو بہت

عمر فاروق @ ورڈ پریس

جانی نقصان پہنچاتی ہے۔ چنانچہ مشورہ ہونے لگا۔ اُنہوں نے کہا کہ سب مل ایک ایک عضو کو پکڑ لینا۔ ایک نے کہا میں ہاتھ پکڑ لوں گا۔ ایک بولا میں ٹانگ پکڑ لوں گا۔ کسی نے گردن پکڑنے کو کہا۔ وعلیٰ ہذا وہاں ایک بڈھا چوہا بھی تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ جب اس سے پُوچھا گیا۔ کہ تم کیوں نہیں بولتے۔ اس نے کہا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ سب کچھ تو تم پکڑ لوگے۔ مگر اس کی میاؤں کو کون پکڑے گا۔ جس وقت وہ میاؤں کرے گی سب بھاگ جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک اور قصہ ہے۔ کہ ایک قصائی مر گیا تھا۔ اس کی بیوی برادری کے سامنے اپنے خاوند کو یاد کر کے رونے لگی۔ کہ ہائے اب اس کی دوکان کو کون چلائے گا۔ تو ایک صاحب بولے میں چلاؤں گا۔ میں تمہے اس کے کپڑوں کو کون پہنے گا۔ وہی بولا میں پہنوں گا۔ کہا ہائے اس کی چھریاں کون لے گا۔ وہ بولا میں لوں گا میں، اس نے کہا ہائے اس کا قرضہ کون ادا کرے گا۔ تو کہنے لگا۔ بولو بھئی! اب کس کی باری ہے کیا سب کام میں اکیلا ہی کروں۔

اور نیز مثال ہے۔ کہ دو رفیق کسی سفر میں ہمراہ ہوئے۔ کسی منزل پر ٹھہرے۔ تو ایک رفیق نے کہا۔ بھئی! کنوئیں سے پانی میں بھروں۔ لکڑی تم جنگل سے لے آؤ۔ اس نے کہا۔ بھئی مجھ سے کچھ نہ ہو گا۔ خیر اس نے خود ہی دونوں کام کر لیئے۔ اب کہا مسالہ تم پیس لو۔ کھانا میں پکاؤں گا۔ کہنے لگا یہ بھی مجھ سے نہ ہو گا۔ اس نے یہ بھی کر لیا۔ اب جب کھانا پک گیا۔ تو اس نے کہا۔ اچھا آؤ کھا تو لو۔ کہنے لگے اب ہر بات میں تمہاری کہاں تک مخالفت کروں۔ لاؤ کھا تو لوں۔ تو ایسے ہی جنٹلمین بھی چاہتے ہیں۔ کہ سب کام تو مولوی کر لائیں اور یہ خالی حکومت کرنے کو بیٹھے رہیں۔ دیکھو سارا کام سرمایہ کا ہے اور سرمایہ جمع کرنا مولویوں

کا کام نہیں۔ بلکہ اس شخص کا کام ہے جو پچاس روپے اپنے پاس سے
دے۔ تب پانچ روپے چندہ کی تحریک دوسروں سے کریں۔ غرض مولویوں
کا کام سرمایہ جمع کرنا نہیں۔ مولویوں کا کام وعظ کرنا ہے اور رؤساء کا کام ہے
چندہ جمع کرنا۔ پھر دونوں مل کر کام میں لگیں۔ کام تو اسی طرح ہوتا ہے۔ باقی
باتیں بنانا سب کو آتی ہیں۔ سب سے پہلے بڑے لوگوں کو سرمایہ جمع کرنے
کے لئے اٹھنا چاہیے۔

لیکن ان کے چندہ جمع کرنے میں ایک اور مصیبت ہے۔ وہ یہ کہ
چندہ جمع کرنے کون گئے ہوئے منصف صاحب، جج صاحب، ڈپٹی
کلکٹر صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانہ دار صاحب تو لوگ انہیں تو مارے
ڈر کے چندہ دیں گے۔ کہ کہیں یہ عدالت میں کسر نہ نکالیں مقدمہ نہ خراب
کردیں کبھی یہ ہوتا ہے۔ کہ جتنا آزادی میں خوشی سے دیتے۔ اب ان
کے دباؤ سے اس سے بہت زیادہ دیں گے۔ یاد رکھو اس طرح سے
چندہ لینا بالکل حرام ہے۔ مناسب یہ ہے۔ کہ رؤساء میں جو اہل حکومت
ہیں وہ چندہ نہ کریں۔ بلکہ ذی وجاہت لوگ جن کا حکومت میں بالکل
دخل نہیں ہے چندہ کریں۔ ہاں اگر ایسا ہو۔ کہ کوئی شخص ان اہل حکومت
سے اتنا بے تکلف ہو کر صاف انکار بھی کر سکے۔ تو ایسے لوگوں کا چندہ
اہل حکومت بھی لے لیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور ایک کوتاہی بعض مبلغین
کی (جیسا اوپر مذکور ہوا اور اب مکرر ایک اور مضمون کی تمہید کے
لئے بیان کرتا ہوں) یہ ہے۔ کہ وہ چندہ میں اسراف بہت کرتے ہیں۔
سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور جو کام خط سے نکل سکتا ہے اس
کے لئے تار پر تار جا رہے ہیں۔ اسٹیشن پر برف لمینڈ بھی پی رہے
چائے بسکٹ بھی اڑ رہا ہے۔ چاہے اپنے پاس سے ایک دفعہ بھی
ایسے کاموں میں پیسہ خرچ نہ کرتے۔ مگر چندہ کا پیسہ ایسی بے دردی

سے تباہ کرتے ہیں۔ واللہ مولویوں کی نسبت ایسے واقعات سُن کر بہت رنج ہوتا ہے۔ کہ یا اللہ ان پر علم کا کیا اُلٹا اثر ہوا۔ علماء کو اس سے بہت ہی احتراز کرنا چاہیئے۔ یہ طریقے تو لیڈروں ہی کے واسطے چھوڑ دینے چاہییں۔

اب اس پر ایک تفریع کرتا ہوں۔ کہ جب یہ معلوم ہو گیا۔ کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو چندہ کے روپے کا درد نہیں رکھتے۔ تو اب مسلمانوں کو دو کام اور بھی کرنا چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یہ چندہ ایسے شخص کے پاس جمع کرنا چاہیئے۔ جس پر خیانت کا احتمال نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ چندہ کا صرف ایسے شخص کے مشورہ سے ہونا چاہیئے۔ جو متقی اور عالم ہو مسائل فقہیہ شرعیہ کا ماہر ہو اور وہ ایسا ہو کہ سب اُسی کے تابع ہوں۔ یہ بات اصول شرع و اسلام سے ہے۔ کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے اور اپنی اعانت کے لیئے وہ دوسروں کی بھی رائے لے لیتا ہے۔ اس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے۔ کہ معاملہ کے سب پہلو اسے مستحضر ہو جاتے ہیں۔ جب سب پہلو نظر میں آجاویں۔ تو اس کا کام یہ ہے۔ کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کرے۔ اسی کا حکم دیدے۔

یہ ہی طریق مشروع و معقول ہے۔ مگر اب یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر کسی کام کے لیئے انتخاب کریں گے۔ تو اسے جو خود مالدار ہو اور اس کے ذریعہ سے چندہ خوب آسکتا ہو۔ ایسے شخص کو چندہ جمع کرنے کے کام پر مقرر کرنا تو مضائقہ نہیں۔ مگر سارے کام اسی کے سپرد کر دینا خواہ وہ نرا جاہل ہی ہو حماقت اور بیوقوفی ہے۔ انتخاب اس شخص کا کرنا چاہیئے جو طامع نہ ہو۔ کسی سے ڈرتا نہ ہو۔ عالم ہو۔ متقی ہو۔

سب سے بڑا کام

چنانچہ میں نے اس جماعت کو جو یہاں کام کرنے کے لیئے آمادہ ہوئی ہے یہی رائے دی ہے۔ اب ان میں آپس میں میاریہ مشورہ پیش ہو گا۔ پھر جیسا طے ہو عمل کیا جاوے گا۔ لیکن جب تک کوئی مستقل تحصیلدار منتخب ہو کام تو نہ بند رکھنا چاہیئے۔ اس کے متعلق میں نے یہ رائے پیش کی ہے۔ کہ اس وقت تک کے لیئے ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو تحصیلدار مقرر کر دیا جاوے۔ چنانچہ انہوں نے چندہ جمع کرنے کا اہتمام شروع کر دیا ہے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا ہے۔ کہ رسیدیں بھی چھپوا لی جاویں اور جب تک رسیدیں چھپ کر تیار نہ ہوں۔ محصل چندہ سادہ کاغذ پہ یادداشت لکھ کر اہل عطا کو دے دیا کرے اور کہہ دے۔ کہ فلاں تاریخ تک باقاعدہ چھپی ہوئی رسیدیں آجائیں گی۔ اس وقت آکر اسے بدل لے جانا۔ یہ سب تو میری تنہا رائے ہے۔ اب یہاں کارکنوں کی جو مرضی ہو وہ کریں۔

پھر اس کے بعد جو کام جتنا جس سے ہو سکے۔ وہ اس کام میں شرکت کرے۔ اگر کسی کے پاس علم اور روپیہ بھی نہیں ہے۔ تو زبان تو ہے۔ اسی سے کام کرو۔ یعنی لوگوں کو اس کام کی رغبت دلاؤ۔ ؎

لاخیل عندك تهديها ولا مال

فليسعد النطق ان لم يسعد الحال

غرض پہلے تو جان سے خدمت کرو۔ یعنی وہاں جا کر تبلیغ کرو۔ اگر یہ نہ کر سکو تو روپیہ پیسہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مال سے خدمت کرو۔ اگر اس کی بھی وسعت نہ ہو تو زبان سے خدمت کرو وہ یہ کہ اپنے اہل وسعت دوستوں اور عزیزوں سے کہو اگر ان سے بھی کہنے کی ہمت نہ ہو تو پھر اللہ میاں سے کہو۔ یعنی دعا کرو کہ اے اللہ! مسلمانوں پر فضل فرمایئے اور اسلام کی نصرت فرمایئے۔ حق کو حق اور

باطل کو باطل ظاہر کر دیجئے۔ اگرچہ میں نے یہ کام بتایا۔ سب مضامین سے آخر میں مگر ہے یہ سب سے بڑا۔

غلو فی التبلیغ

اور یہ نہ سمجھنا کہ جب یہ سب سے بڑا ہے۔ تو پھر اس کے ہوتے ہوئے اور سب کام چھوڑ دیئے جاویں۔ جیسا کہ بعض جوشیلے لوگ ایک ہی طرف چل دیتے ہیں۔ سو میں کہتا ہوں کہ اگر یہی بات ہے۔ تو جاہل ایک شاہ صاحب کی بات بھی ماننا پڑے گی۔ جو نماز نہ پڑھتے تھے اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے تھے :۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ۔

تو بس کہنے لگے۔ کہ اب ہم اللہ اللہ ہی کیا کریں گے۔ نہ نماز کی ضرورت رہی نہ روزہ کی۔ میں نے کہا۔ کسی کام کے بڑا ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ اور چھوٹے کاموں سے پہلو تہی کر لو۔ دیکھو تمہارے تین بیٹوں میں سے ایک اگر زیادہ کام کا ہے۔ تو کیا دو کا گلا گھونٹ دو گے۔ ہرگز نہیں۔ پس ولذکر اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں۔ کہ اس سے قرآن دنماز کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔ لانہ ذکر اللہ۔ اس لیئے کہ یہ بھی ذکر اللہ ہیں۔

اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔ تو نماز بہت بڑی چیز ہوئی۔ بس اب آگے شاہ صاحب کے چلنے کی جگہ ہی نہیں رہی۔ کیونکہ اب تو اس کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے۔ ایک یہ کہ ذکر اللہ سے مراد نماز ہی ہو۔ جیسا اوپر ذکر ہوا۔ دوسرے یہ کہ محض ذکر متعارف یعنی اللہ اللہ کرنا مراد ہو۔ اب ذکر اللہ سے مراد جنتا صرف اللہ اللہ ہی کرنا نہیں رہا۔ بلکہ اس میں نماز کا احتمال بھی پیدا ہو گیا اور دوسرے دلائل سے یہ صرف احتمال ہی نہیں رہا۔ بلکہ واقع میں بھی [illegible] ہی ہے۔

اسی طرح دعا کے متعلق بعضوں کو ایسی ہی غلطی ہو رہی ہے۔ سو اس کو بھی سمجھو۔ اس کے بڑا ہونے کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ اور تدابیر سے مانع نہیں ہے۔ کیونکہ دعا میں وہ تدابیر بھی داخل ہیں۔ ایک دعائے قولی ہے، ایک دعائے فعلی ہے اور اگر واقع میں یہی معنی ہیں جو تم سمجھتے ہو۔ تو پھر نکاح بھی کرو اور کہہ دو ہم کو شاہ صاحب کی دعا پر اعتماد ہے۔ اولاد کی تو ہمیں بڑی تمنا ہے مگر نکاح نہیں کریں گے۔ بس یوں ہی کسی طرح دعا سے اولاد ہو جاوے گی۔ کیونکہ اگر نکاح سے اولاد ہوئی تو پھر خدا کی قدرت کیا ہوئی۔ صاحب!! اپنے دعا کے بھروسے کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے؟ جب نکاح میں ایسا نہیں کیا۔ تو اس معاملہ میں ایسا کیوں کرتے ہو۔ بس اب دُعا کے یہ معنی ہوئے۔ کہ جتنی تدبیریں ہو سکیں سب کرو اور پھر دعا بھی کرو اور محض تدبیر پہ بھروسہ نہ کرو۔ بھروسہ دعا ہی پر کرو۔ اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

گفت پیغمبر بآواز بلند — بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

گر توکل می کنی در کار کن — کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

یہ مضمون مذکور حدیث شریف کا ہے۔ کہ ایک اعرابی نے پُوچھا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ اُونٹ باندھ کر توکل کروں یا خدا کے بھروسہ پہ کھلا رہنے دوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اعقل ثم توکل۔ کہ باندھ پھر خدا پہ بھروسہ کر۔ تو یہ ہے توکل۔ اب اس میں رسی پر نظر کرنا الحاد اور بد دینی ہے اور محض خدا کے بھروسہ پہ اسباب کا قطع کرنا حماقت و جہل ہے اور دونوں کا جمع کرنا عقل اور توکل ہے۔

یہ ہے حقیقت توکل کی۔ اب خلاصہ وعظ کا ذکر کر کے ختم کرتا ہوں۔ وہ خلاصہ یہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے جہاں دنیا کی مذمت اور

آخرت کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے۔ کہ اپنی آخرت کی فکر کرو۔ اور آخرت کی فکر یہ ہے۔ کہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی اور اپنے بھائیوں کی سب کی اصلاح کرو۔ اب میں ختم کرتا ہوں حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے۔ کہ وہ ہمیں فہم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہٖ واصحٰبہٖ اجمعین۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اشرف علی

ختم ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

عمر فاروق@ون اردو

اتباعِ علماء

آپ داعی

الی طریق اللہ ہیں سب کی طرف

ادعوا الی اللہ میں اشارہ ہے اور یہی شان علماء میں بھی موجود ہے۔ مگر بواسطۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ شان بلاواسطہ ہے پس واسطہ بلاواسطہ کا فرق ہے۔ مگر نفس نسبت مشترک ہے۔ تو یہ اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علماء سے بہت تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کو بواسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علماء سے بہت تعلق ہے۔

از حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ

عمرفاروق@ون اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اتباعِ علماء یعنی سعید السبیل سے موسوم یہ وعظ ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ بعد از نمازِ جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ہوا۔

مولانا سعید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ممبر دار العلوم دیوبند نے اس کی فرمائش کی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کرسی پر بیٹھ کر حضرت علیہ الرحمۃ نے بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً یک صد تھی۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلم بند فرمایا۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ۔[1]

شفقتِ خداوندی

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ جس میں حق تعالیٰ نے تمام دین کا خلاصہ ارشاد فرمایا ہے۔ تمام دین اس کی تفسیر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے۔ جس کا اثر یہ ہے۔ کہ اس کو سن کر عمل کی رغبت ہوتی ہے۔ اور یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ وہ احکام جو فی نفسہ آسان ہیں۔ مگر مخالفتِ نفس اور منازعت نفس کے عارض سے دشوار ہوگئے ہیں۔ ان کو نہایت سہل عنوان سے بلکہ شوق دلانے والے عنوان سے بیان فرمایا ہے۔ تاکہ یہ عارضی دشواری شوق کی حرکت سے مغلوب ہو جائے۔

اور یہ دلیل ہے حق تعالیٰ کے شفیق ہونے کی۔ حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا ہے اور جتنے ضوابط و قواعد حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ ان میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سب بندوں کی مصلحت کے لیے ہیں، وہ ضابطہ محضہ نہیں۔ بلکہ عین شفقت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے

---

[1] اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ سیدھا ہے۔ پس اس راہ پر چلو ۱۲۔ منہ پارہ ۸ رکوع ۶

کوئی بچہ کنویں میں گرنے لگے۔ تو اس کو گرنے سے اس طرح روکتے ہیں۔ کہ ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور دو چار طمانچے لگا کر وہاں سے ہٹا دیتے ہیں۔ شفقت کا منشا یہی ہے نہ یہ کہ اہلِ حکومت کی طرح ضابطہ سُنا دیا جائے جیسے حکام و سلاطین اور اُن کے نوابّ کا طریقہ ہے۔ کہ منادی کرنے والا ایک طرف سے منادی کرتا چلا گیا۔ چاہے کوئی سُنے یا نہ سُنے، سمجھے یا نہ سمجھے اور رغبت ہو یا نہ ہو۔ سو یہ ضوابط ہیں۔ اور حق تعالیٰ کے احکام میں ایسے ضوابط نہیں ہیں۔ ہاں صورت ضوابط کی ہے۔

سو اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے حکیم دوا کی مقدار معین کرتا ہے۔ وقت مقرر کرتا ہے، پرہیز متعین کرتا ہے۔ تو ظاہر میں یہ بھی ضوابط ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ محض ضوابط نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر یہ ضوابط مرتفع ہو جائیں۔ تو حقیقت میں اہلاک ہوگا۔ طبیب یہ قیدیں صرف مریض کی مصلحت سے لگاتا ہے۔ اپنی مصلحت کے لیے نہیں لگاتا۔

اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی شانِ حکومت کے لحاظ سے ضوابط مقرر نہیں فرمائے۔ بلکہ بندوں کی مصالح اور منافع کے لیے متعین فرمائے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا۔ تو بندوں ہی کا ضرر تھا۔ پس احکام میں بظاہر جو کچھ قواعد و ضوابط ہیں۔ ان کا مبنیٰ شفقت ہے اور اسی شفقت کا یہ اثر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ احکام کو ایسے عنوان سے بیان فرماتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ بندوں کو انہیں اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوتی اور شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اس کی رعایت کرتا ہے۔ کہ بیٹا سمجھ لے اور اس کی سمجھ میں بات آ جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اس طرزِ شفقت کی پوری رعایت ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ۔ کہ واقعی یہ میرا راستہ ہے۔ هٰذَا کا اشارہ اُوپر کے احکام کی طرف ہے۔ جو اُمہاتِ احکام ہیں۔ جو تمام دین کا خلاصہ ہیں۔ مگر وہ تو اجمال بصورت تفصیل تھی اور یہ یعنی آیت اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا۔ اجمال

بعد تفصیل ہے۔

رفع اشکال

قبل ازیں کہ میں اس آیت کے عنوان میں طرز شفقت کو واضح کروں ایک اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید کسی ذہین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہے۔ کہ ہم کو بدون ابتلاء بالاحکام کے جنت عطا فرمادیں اور شفقت کا مقتضیٰ بھی بظاہر یہی تھا کہ ابتلاء سے محفوظ رکھ کر ہم کو نجات عطا فرماتے۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ بے شک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلاء وامتحان کے سب کچھ عطا فرمادیتے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ انسان کو ابتلاء وتکلیف کے بعد ہی دولتِ قرب عطا فرمادیتے ہیں۔ اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق وبعد کا نام ہے ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت
فراقِ یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیثِ ہول قیامت کہ گفت واعظِ شہر
کنایتی ست کہ از روزگار ہجراں گفت

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے:۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ۔

رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ سو اس کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے۔ کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے۔ ان کا طریقہ یہ ہے۔ ابھموا ما ابھمہ اللہ۔ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے۔ تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔ پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے۔ کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے۔ گو ہم کو معلوم نہ ہو۔ مگر اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر انسان

یہ طاعت بدونِ ابتلاء مقصود ہوتی تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے۔ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ ملائکہ میں اطاعت بدون ابتلاء ہی ہے۔ ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر منازعت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے۔

اور درجہ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی۔ تو الدین یسر کے خلاف ہوتا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگا دی اور یہ منازعت بھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے۔ بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الٰہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے۔ چنانچہ مشی وغیرہ میں ابتداء ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے۔

اس پر یہ شبہ نہ ہو۔ کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہو گا۔ کیوں کہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے۔ کہ ابتداء کے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے۔ کیوں کہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان جو نماز روزہ کا پابند ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے۔ کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا، ہمیشہ روزہ رکھوں گا، خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو۔ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔ کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اس واسطے اس کو زوال منازعت کے بعد بھی بوجہ

نیت دوام کے رہی ثواب ملتا ہے۔ جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا۔ تو جیسے مبنی کو فعل اختیاری اسی لیئے کہا جاتا ہے۔ کہ ابتداء میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے۔ گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتداء میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لیئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائے گا۔

رحمت خداوندی

اور یہاں سے پتہ لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کی رحمت کا۔ ورنہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جائے اور عبادت میں لذت و حظ پیدا ہو جائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے۔ کیونکہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے۔ اس وقت عقل کہتی ہے۔ کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں۔ مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ تمہے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے۔ ہم اس کو منازعت ہی کا اجر دیں گے۔ گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو بخشش دیں گے۔ لیکن عقل بخشش کو جائز نہیں کرتی جیسے معتزلہ نے کہا ہے۔ کہ گناہوں پہ سزا دینا ضروری ہے۔ عفو و مغفرت خلاف عقل ہے۔ پس یوں کہیئے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہو جاتی ہے۔ جو بعضے پیروں کی حالت سنی گئی ہے۔ کہ جب کوئی مرید ان کی دعوت کرتا ہے۔ تو وہ دعوت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں۔ جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیئے۔ ایک پیرزادہ کو دعوت کے بعد پچاس روپیے دیئے گئے۔ تو اس نے پھینک دیئے اور کہا۔ کہ کیا ہماری شان پچاس روپے کے لائق ہے۔ غرض وہ سو روپے لے کر ٹلے۔ تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلا دیا۔ کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں۔ کیونکہ انتہا میں طاعت کا بجا لانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہوا۔ کان خلقہ القرآن

کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی آپ کی تو یہ فطرت ہی سے طبیعت تھی مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اس وقت اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے۔ جیسے ماں بچہ کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگ گیا ہے۔ تو وہ اس کے چپت لگاتی ہے حالانکہ وہ جانتی ہے۔ کہ یہ خود دودھ پیئے گا۔ کیوں کہ دودھ سے اس کو خود ہی رغبت ہے۔ مگر اظہار شفقت کے لیئے چپت لگاتی ہے ایسے ہی منتہی کے لیئے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں۔

فطرتِ انسان

بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کے لیئے بھی وعیدات محض اظہار شفقت و رحمت ہیں کیونکہ بات یہ ہے۔ کہ انسان کو فطرۃً حق تعالی سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے۔ یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالی پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیئے۔ میرے اوپر یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں اور بزبان حال یوں کہتا ہے ؎

ہم نے اُلفت کی نگاہیں دیکھیں جانیں کیا چشم غضب ناک کو ہم

یہ آج کل کے واعظوں کی زیادتی ہے۔ کہ مسلمانوں کو محبت حق سے خالی سمجھتے ہیں اور وعظ میں مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں۔ کہ تم کو نہ خدا سے محبت ہے اور نہ خدا کی عظمت ہے حکام کے سمن اور طلبی پر تو تم فورا بلا چون و چرا کے عدالت میں حاضر ہوتے ہو خواہ گرمی ہو یا سردی یا برسات کوئی چیز تم کو مانع نہیں ہوتی۔ اور خدا کے احکام میں سو بہانے اور حیلے نکالتے ہو۔ سو یہ دلیل غلط ہے کیونکہ رعایا کو حکام سے محبت نہیں۔ ان کے احکام شاقہ سے رعایا کو تعجب نہیں ہوتا۔ لوگ جانتے ہیں۔ کہ حاکم غیر ہے۔ اس سے ہم کو کیا تعلق اور وہ

ہماری راحت و کلفت کا کیوں لحاظ کرے۔ اس لیئے ان کے احکام میں منازعت و کشاکشی نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ سے انسان کو محبت ہے اور خاص تعلق ہے ان کی طرف سے جو حکم اور قید آتی ہے۔ اس میں بوجہ ناز کے مچلتا ہے۔ کہ ایسے رحیم و کریم نے میرے اوپر مصیبت کیوں ڈالی۔ واعظوں نے اس فرق کو نہیں سمجھا۔ اس لیئے خواہ مخواہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت سے خالی بتلا کر ان کے دلوں کو مجروح کرتے ہیں۔ گویا بس ایک یہی واعظ صاحب تو حق تعالیٰ کے چاہنے والے ہیں۔ حضرت عارف شیرازیؒ نے ایسے واعظوں کی خوب خبر لی ہے۔ فرماتے ہیں سہ

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر می کنند
چوں بخلوت می رسند ایں کار دیگر می کنند

اس میں بعض واعظوں کے دل میں یہ تاویل آچکی ہے کہ حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ خلوت میں جا کر یہ لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں۔ جی ہاں بس خوش ہو لو؟ ذرا اس سے آگے بھی پڑھ لو سہ

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

واعظین گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ کہ وہ خود بھی خلاف ورزی احکام کی کس قدر کرتے ہیں پھر بھی اپنے بیان کے موافق محبت سے خالی نہیں اور اگر وہ خالی نہیں۔ تو عوام بھی خالی نہیں۔ بلکہ سب کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔

تجویز محبوب

اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ اس لیئے اس مقام پر فرماتے ہیں:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا۔ کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا۔

جس میں اس راستہ کو اپنی طرف اس لیئے منسوب فرمایا کہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے۔ اس عنوان سے سب کو اس کی طرف حرکت ہو گی خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا میرا تبلایا ہوا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اس پر چل کر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہنچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو۔ مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے۔ کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی ہو جائے گا۔ تو اس کو اس کام میں سب مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو۔ مگر اس کا علم ہو جاوے۔ کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی یہی اثر ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا اور ذرا اُف نہ کرتا ننانوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی۔ کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ ننانوے کوڑوں پر آہ نہ کی، اخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا۔ میری حالت کو دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کی محبت میں مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے۔ تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔ تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا۔ جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہو گا۔

نسبت کا اثر

اسی بناء پر جب یہاں بندوں کو یہ تبلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی

میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے۔ یہ سن کر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہو گی۔ کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں۔ تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا سا ہلکا کر دیا۔ یہی وہ بات ہے۔ جس کو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے۔ کہ اول تو دین کو فی نفسہٖ آسان کیا۔ پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور مشقت آجاتی ہے اس کو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہو گئی۔ کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا۔ اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔

اور یہیں سے ایک حکایت کی حقیقت معلوم ہو گی جو مولوی مظہر صاحب رام پوری نے جو میرے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں موجز میں شریک تھے میں نے موجز کو موجز ہی پڑھا ہے ورنہ مطول ہو جاتی رام پور ریاست کا قصہ بیان کیا کہ ایک شخص صاحب قبض ایک صاحب ارشاد کے پاس گیا انہوں نے پوچھا تم کون ہو کہا میں شیطان ہوں فرمایا اگر شیطان ہو تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ جواب سن کر اس کو مردودیت کا یقین ہو گیا کہ جب ایک شیخ صاحب ارشاد نے بھی مجھ پر لاحول پڑھ دی تو میرے مردود ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ تو اس نے اپنے خادم سے کہا کہ اب اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ اس لئے اب میں خودکشی کر لوں گا۔ اگر کچھ کسر رہے تو تم پوری کر دینا چنانچہ اس نے خودکشی کی اور جان نکلنے کے بعد مرید نے ابھی ہوئی کھال کو الگ کر دیا۔ اسی حالت میں وہ گرفتار کیا گیا اس نے کہا تم مجھے کیا گرفتار کرتے ہو۔ میں تو خود زندگی سے بیزار ہوں

جب میرا پیر نہ رہا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ تم شوق سے مجھے پھانسی دے دو اس بیان سے حاکم کو اس کے قاتل ہونے میں شبہ پیدا ہوا۔ تو اس نے واقعہ دریافت کیا اس نے سب واقعہ بتلا دیا یہ خبر اُن صاحب ارشاد شیخ کو بھی پہنچی انہوں نے بھی تصدیق کی کہ ہاں وہ قبض میں مبتلا تھا اور میرے پاس آیا تھا کچھ تعجب نہیں کہ اس نے خود کشی کر لی ہو۔

یہ حکایت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سُنی۔ تو فرمایا کہ ہم ان صاحب ارشاد کو شیخ سمجھتے تھے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں ان کو چاہیئے تھا کہ جب اس نے کہا تھا کہ میں شیطان ہوں۔ تو جواب میں یوں کہتے کہ پھر کیا حرج ہے شیطان بھی تو اسی کا ہے۔ نسبت اب بھی قطع نہیں ہوتی اس سے تسلی ہو جاتی۔ شاید تم یہ کہو کہ ان الفاظ سے کیا ہوتا۔ تو تم اس کو کیا جانو؟

جس پر قبض طاری ہو چکا۔ وہ اس کے اثر کو سمجھتا ہے صاحبو! الفاظ میں بڑا اثر ہے اس کو ایک مثال سے سمجھیئے۔ مولوی غوث علی صاحب پانی پتی سے کسی نے شیخ اکبر و فرید عطار اور مولانا رومی کے متعلق دریافت کیا کہ وحدت الوجود میں گفتگو کرنے والے یہی تین حضرات بڑے ہیں۔ ان میں کیا فرق ہے۔ فرمایا: تینوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ تین مسافر کسی گاؤں میں ایک کنوئیں پر پہنچے۔ ایک عورت پانی بھر رہی تھی۔ اس سے پانی مانگا۔ مگر ایک نے تو یُوں کہا کہ اماں! مجھے پانی پلا دے۔ یہ تو مولانا رومی ہیں۔ دوسرے نے یُوں کہا کہ میرے باوا کی جورو مجھے پانی دے دے۔ یہ شیخ اکبر ہیں تیسرے نے یُوں کہا کہ میرے باوا سے یوں توں کرانے والی مجھے پانی دے دے۔ یہ شیخ فرید ہیں۔ اب غور کر لیجئے۔ کہ ان الفاظ کے اثر میں یہ فرق ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ماں کو اماں کہے تو وہ خوش ہو گی اور اگر باوا کی جورو یا باوا سے یُوں توں کرانے والی کہے۔ تو اس کا منہ نوچنے کو تیار ہو جائے گی۔

حالانکہ معنی سب کے متحد ہیں۔

مجھ پر خود ایک حالت گزری ہے جس میں الفاظ کے اثر کا مجھے پورا مشاہدہ ہوا ہے ایک بار مجھے سخت مرض ہوا اور ایک حکیم صاحب کے پاس قارورہ بھیجا انہوں نے قارورہ دیکھ کر یہ کہا کہ اس شخص میں تو حرارت عزیزیہ نام کو بھی باقی نہیں یہ زندہ کیسے ہے۔ قارورہ لے جانے والے نے یہ عقل مندی کی کہ حکیم کا مقولہ مجھ سے آ کر بیان کر دیا جس کا مجھ پر بہت زیادہ اثر ہوا میں نے ان کو دھمکایا کہ یہ بات کیا میرے سامنے کہنے کی تھی تم نے بڑی حماقت کی۔ جاؤ اس کا تدارک کرو۔ انہوں نے تدارک پوچھا۔ میں نے کہا کہ مکان سے باہر جاؤ اور کچھ دیر میں آ کر مجھ سے یوں کہو کہ میں پھر حکیم صاحب کے پاس گیا تھا انہوں نے مکرر دیکھ کر یہ کہا۔ کہ پہلے جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی حالت اچھی ہے۔ کچھ خطرے کی بات نہیں۔ وہ کہنے لگے کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی سکھلائی ہوئی بات کہوں گا تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے کہا تم خواص اشیاء کو کیا جانو۔ جس طرح میں کہتا ہوں تم اسی طرح کرو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا۔ کہ ان لفظوں کے سننے سے میری پہلی سی حالت نہ رہی بلکہ ایک گونہ قوت بدن میں پیدا ہوگئی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ علاج سے قوت بڑھتی گئی اور حق تعالیٰ نے پوری شفا عطا فرما دی۔ تو الفاظ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اثر رکھا ہے گو ہماری سمجھ میں نہ آتے اطباء سے پوچھو کہ خفقان میں کہربا کی تعلیق کیوں مفید ہے؟ وہ اس کی وجہ بجز تجربہ کے کچھ نہیں بتلا سکتے اسی طرح اہل طریق کو کلمات و الفاظ کے اثر کا تجربہ ہو چکا ہے مگر ان کے تجربہ کو اہل ظاہر نہیں جانتے۔

شاید کسی مولوی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے الفاظ سے تسلی کرنا تو جائز نہ تھا کہ شیطان بھی تو اسی کا ہے۔ نسبت پھر بھی باقی ہے۔ کیونکہ اس سے کفار بھی اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ فوری علاج سنکھیا سے بھی کیا جاتا ہے۔ پھر بعد میں سنکھیا کی سنبھال کر لیتے ہیں۔ اس کو بھی اطباء جانتے ہیں۔ اور اہل اللہ کا تجربہ ہے۔ کہ بعض دفعہ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرے تم اس میں اضافت تشریفیہ کیوں لیتے ہو اور خواہ مخواہ اس کو خلافِ شرع پر کیوں حمل کرتے ہو؟ معنی لغوی پر کیوں محمول نہیں کرتے آخر شیطان بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ یعنی ان کا پیدا کیا ہوا ہے ان کا بندہ ہے۔ بتلایئے اس میں کیا خرابی ہے اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نسبت اور اضافت کا اثر اہل محبت پر کس قدر ہوتا ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔ کہ یہ میرا راستہ ہے اس سے محبت کو ہیجان ہو گیا۔ اور اب موانع کا ارتفاع آسان ہو گیا اب یہ حال ہو جاتا ہے۔ کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور اب عاشق زبانِ حال سے اور بعض دفعہ زبانِ قال سے یوں کہنے لگتا ہے

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا کو سن کر ایک دفعہ تو کافر کو بھی اس کی طرف حرکت ہو گی اور وہ اس راستہ پہ چلنا چاہے گا۔ کیونکہ خدا سے محبت کافر کو بھی ہے۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں اور آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ بعض سنیاسی ذکر و شغل کرتے ہیں اور لذائذ کو ترک کر دیتے ہیں اس کا منشاء وہی محبت ہے۔ گو وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں۔

کیفیات کی حقیقت

اور یہاں سے ایک بات اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ کفار کو ذکر الٰہی سے

گو آخرت میں کچھ نفع نہ ہو اور یہ ذکر وہاں ان کے لئے نجات کا سبب نہ ہو مگر دنیا میں ان کو بھی کچھ مل جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ کہ وہ کبھی اچھے کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔ بلکہ اگر ذاکر طالب آخرت ہے تو اس کو آخرت میں بھی اجر عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی۔ اور طالب دنیا ہے تو اس کو دنیا میں کیفیات نفسانیہ۔ ذوق وشوق وغیرہ عطا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کا اجر ہے۔ اسی لیئے محقق حضرات نے فرمایا ہے۔ کہ کیفیات نفسانیہ کے درپئے نہ ہو کیونکہ وہ تو چٹنی ہے اور چٹنی مطلوب نہیں۔ بلکہ مطلوب غذا ہے۔ اب اگر کوئی چٹنی ہی سے پیٹ بھر لے۔ تو اس کا معدہ خراب ہو جائے گا۔ بس چٹنی کا کام یہ ہے کہ غذا کے ساتھ تھوڑی سی کھا لی جائے تاکہ غذا اچھی طرح کھائی جائے۔

میں نے اس کے متعلق ایک فیصلہ کیا ہے۔ جو مختصر ہے گو یہ لفظ دعویٰ کا ہے مگر میرا مقصود دعوے نہیں بلکہ یہ ایسا ہے جیسے کہ ہم یوں کہتے ہیں کہ میں نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا اور دعوے تو جب ہو کہ یہ فیصلہ میں نے اپنے آپ کیا ہو سو نہیں بلکہ یہ ان حضرات کا طفیل ہے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اور طوطا اگر کچھ پڑھے گے تو یہ اس کا کمال نہیں۔ بلکہ یہ پڑھانے والے کا کمال ہے۔ تو وہ فیصلہ اس کے بارے میں یہ ہے۔ کہ یہ کیفیات محمود تو ہیں۔ مگر مقصود نہیں اور غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنا لینا عصیان باطنی اور بدعت باطنیہ ہے۔ اس لیئے ان کے درپے نہ ہو۔ ان کی تمنا نہ کرو۔ ہاں دعا کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ دعا میں خاصیت یہ ہے۔ کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شکایت و قلق پیدا نہیں ہوتا اور تمنا کے پورا نہ ہونے سے شکایت و قلق ہوتا ہے

حق تعالیٰ نے امور اختیاریہ و غیر اختیاریہ کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۚ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

میرا ذوق یہ ہے کہ اس آیت میں مطلوب کی دو قسمیں کی گئی ہیں ایک موہوب جس کو ما فضل اللہ بہ اور واسئلوا اللہ من فضلہ میں فضل سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرے مکسوب جس کو للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن میں اکتساب کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اب حاصل یہ ہوا کہ موہوب کی تمنا نہ کرنا چاہیئے نہیں بلکہ مکسوب کا اہتمام و فکر کرنا چاہیئے مدار نجات اعمال مکسوبہ ہیں۔

اب رہا تمنائے موہوب سے جو ممانعت ہے اس میں نہی تحریم کے لیئے ہے یا کراہت تحریم یا کراہت تنزیہ کے لیئے۔ اس سے مجھے بحث نہیں۔ عشاق سے پوچھو کہ جب محبوب کسی کام سے منع کر دے تو کیا عاشق محبوب سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ حضور یہ بات آپ کو کس درجہ میں ناپسند ہے کس قدر ناگوار ہے اگر کوئی ایسا سوال کرے گا تو محبوب اس کو نکال باہر کرے گا کہ تو عاشق نہیں۔

اس کے بعد حق تعالیٰ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موہوب کے لیئے ان کا دل للچائے گا ضرور اس لیئے دعا کی اجازت دیتے ہیں۔ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ کہ دعا کر سکتے ہو آگے بعض اوقات عدم قبول دعا سے پریشان نہ ہونے کی تعلیم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو اور قبول کے آثار معلوم نہ ہوں۔ تو گھبراؤ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو اچھی طرح جانتے ہیں یعنی وہ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ یہ نعمت موہوبہ تمہارے لیئے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس

وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔
یہ تو کیفیات کے متعلق فیصلہ کا ذکر تھا اور اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کیفیات کفار کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ تو جو چیز کافر کو بھی حاصل ہو سکے اس کے درپے نہ ہونا چاہیئے اور نہ ان کیفیات کے حصول پر اکتفاء کرنا چاہیئے کیوں کہ نجات کا مدار اعمال مکتوبہ ہے ان کیفیات سے قرب و نجات میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوتی ہاں یہ ضرور ہے کہ عادۃً عمل مجرد عن الکیفیۃ سے عمل مع الکیفیۃ میں خود شان اکتساب کی زیادہ ہوتی ہے اس لیئے وہ اکمل ہونے کے سبب افضل ہو گا۔ غرض خدا کا راستہ سن کر کفار کو بھی حرکت ہوتی ہے اور وہ بھی ایک دفعہ کو بے اختیار اس راستہ پر چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ خدا تعالٰی سے سب کو محبت ہے۔ جس کی وجہ سے جس چیز کی نسبت حق تعالٰی کی طرف ہو جائے۔ اس سے بھی محبت ہوتی ہے۔ آگے ارشاد ہے کہ بس لذت نسبت ہی پر کفایت نہ کرنا بلکہ آگے بڑھو اور کام کرو فاتبعوہ کہ اس راستہ کا اتباع کرو اس راستہ پر چلو۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو کافر سے نہیں ہو سکتی کیفیات تو کفار کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں مگر صراطِ خداوندی کا اتباع کافر سے بحالتِ کفر نہیں ہو سکتا۔

مقام علمائے کرام

یہ تو تمہید تھی۔ اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں۔ جو مختصر ہی ہے اور مقصود تو ہمیشہ مختصر ہی ہوتا ہے۔ جیسے روٹی مختصر ہے اور تمہید اس کی بہت لمبی ہے۔ یہ تو حسیات میں ہے اور طریق باطن میں بھی مقصود مختصر اور تمہید مطول ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا گنگوہیؒ کا ارشاد ہے۔ کہ سلوک کا جو حاصل پندرہ سال کے بعد معلوم ہوا ہے۔ اگر پہلے معلوم ہوتا۔ تو اس کے لیئے ہم اتنا وقت صرف نہ کرتے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ حاصل پندرہ برس کی محنت سے پہلے معلوم ہی کیوں

ہوتا اور یہ بھی حضرت قدس سرہٗ کا کمال تھا کہ ان کو پندرہ برس کی محنت سے خلاصہ معلوم ہو گیا۔ بہت سوں کو تو تیس اور چالیس سال کے بعد جا کر کہیں مقصود کا پتہ لگتا ہے۔ پس یہ مختصر ایسا ہے جیسے ایک بڑے دفتر حساب کا خلاصہ میزان کل ایک سطر میں لکھا ہوتا ہے کہ کل میزان دس ہزار پانچ سو دس ہے۔ مثلاً یہ لفظ تو ایک سطر سے کم میں بھی آجائے گا۔ مگر کیا آپ میزان کو بدون تمام دفتر جمع کیے معلوم کر سکتے تھے ہرگز نہیں۔ غرض حق تعالیٰ نے یہاں تو صراط کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور ایک جگہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی اضافت فرمائی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔

اور ایک مقام پر انبیاء و علماء سب کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے۔

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔ اور ایک مقام پر خود سالک کی طرف اضافت کی گئی ہے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۝[1]

گو یہ اضافت صریح نہیں۔ مگر سالک کو اس طریق کے ساتھ تلبس ہونے پر یہ آیت ضرور دال ہے۔ کیوں کہ لفظ سبیل اس میں اتخذ کا مفعول بہ ہے اور فاعل سالک ہے اور متخذ و متخذ میں تلبس ضرور ہوتا ہے اور اضافت سے میری یہی مراد ہے۔ اضافت نحویہ مراد نہیں۔

اب ان اضافات متعددہ کے اسباب سنیئے۔ حق تعالیٰ کی طرف تو اس طریق کی اضافت اس لیئے ہے کہ وہ واضع طریق ہیں اور منتہائے طریق ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس لیئے ہے کہ آپ داعی اور مبلغ ہیں

---

[1] پارہ ۲۹، سورۂ مزمل ۱۲۔

سو جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے۔

اور یہی وجہ نسبت الی العلماء کی ہے اور سالک کی طرف اضافت کا منشا یہ ہے کہ وہ طالب سبیل ہے اور فقہاء نے اصول میں بیان فرمایا ہے۔ کہ جہاں ایک چیز دوسری کی طرف منسوب ہو وہاں ان دونوں چیزوں میں غایت تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اصولیین نے حرمت مصاہرت کے مسئلہ میں اس کی تقریر کی ہے اور بیان فرمایا ہے۔ کہ ولد منسوب ہے واطی اور موطوٴ کی طرف اس لئے کہ ان دونوں میں تعلق قوی ہو گیا پس دونوں کے اصول و فروع ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے۔ تو ایسے ہی یہاں سمجھئے۔ کہ سبیل حق کی نسبت اللہ تعالےٰ کی طرف بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی یہ غایت تعلق مع الرسول کی دلیل ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کو بہت تعلق ہے اور منشاء اضافت الی الرسول کا یہ ہے۔ کہ آپ داعی الی طریق اللہ ہیں۔ جس کی طرف ادعوا الی اللہ میں اشارہ ہے اور یہی شان علماء میں بھی موجود ہے، مگر بواسطہ رسول کے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ شان بلا واسطہ ہے۔ پس واسطہ اور بلا واسطہ کا فرق ہے۔ مگر نفس نسبت مشترک ہے۔ تو قاعدۂ مذکورۂ بالا کے موافق یہ اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علماء سے بہت تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی بواسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علماء سے بہت تعلق ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب یہ نسبت مشترک ہے اور سالک کی طرف بھی اس کی اضافت ہے تو جو اس راستہ پر چلنا شروع کرتا ہے۔ اس سے بھی اللہ تعالیٰ کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص تعلق ہو جاتا ہے۔

جب یہ سمجھ گئے تو اب سنو! کہ مجھے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا ہے جس کا حاصل یہ ہے ؎

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب | بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب
چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ | چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی اس وقت مجھے علماء کی شان بیان کرنا اور ان کا درجہ بتلانا ہے۔ جو اس اضافت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو شخص اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہے اور خدا تعالیٰ کو راضی کرنا چاہے۔ اس کے لئے بجز اتباع علماء کے کوئی صورت نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے۔ گو حضور کی وفات بھی حیات ہی ہے مگر حیات صوریہ کے مقابلہ میں اس کو وفات کہنا ضرور صحیح ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ حی لا یموت ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ سے بجز انبیاء کے بلا واسطہ کوئی مستفید نہیں ہو سکتا۔ اور ہم تو صحابہ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بلا واسطہ مستفید نہیں ہو سکتے۔ تو اب بجز اتباع علماء کے ہمارے لئے دین پر چلنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔

نااہل مجتہدین

مگر حالت یہ ہے۔ کہ بہت لوگوں کو اتباع علماء سے آج کل عار ہے۔ بلکہ بعض کو تو اتباع ائمہ سے بھی عار ہے۔ آج کل بعض لوگوں کو مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ پڑھ کر اجتہاد کا دعوےٰ ہے مگر اس اجتہاد کی حالت یہ ہے کہ ایک عامل بالحدیث تنہا نماز پڑھتے تو سکون سے پڑھتے اور امامت کرتے تو خوب ہل ہل کر نماز پڑھتے کسی نے ان کو ٹوکا کہ تم امامت کے وقت اس قدر کیوں ہلتے ہو تو کہا حدیث میں اس کا حکم آیا ہے اور مشکوٰۃ کا ترجمہ نکال کر لائے جس میں من ام منکم فلیخفف کا ترجمہ لکھا تھا کہ جو شخص امام بنے۔ وہ ہلکی نماز پڑھے مجتہد صاحب نے ہلکی کو ہل کے پڑھا اور نماز میں ہلنے لگے۔

صاحبو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج کل دعوےٰ اجتہاد کی کم تلے ہے جس کو علم سے مس بھی نہیں ورنہ صاحب علم کبھی دعوئے اجتہاد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب کمال علم حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم جاہل ہیں چنانچہ مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ عمر بھر پڑھنے پڑھانے

سکا یہ نتیجہ نکلا کہ ہم جہل مرکب سے جہل بسیط میں آگئے۔ بھلا ایسا شخص دعوئے اجتہاد کیوں کر کر سکتا ہے۔ بس مُدعی وہ لوگ ہیں۔ جن کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی ان کو اجتہاد کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔

ایک صاحب نے ریل میں مجھ سے سوال کیا تھا کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں میں نے کہا کہ تم اس کی حقیقت اصطلاحی الفاظ میں تو کیا سمجھ گے۔ میں ایک مثال سے اس پر تنبیہ کیئے دیتا ہوں بتلاؤ اگر دو شخص سفر میں ہوں اور صبح کی نماز کا وقت آنے اور پانی موجود نہ ہو۔ اس لیئے دونوں کو تیمم کرنا پڑے مگر ایک نے تو وضو کا تیمم کیا۔ دوسرے نے بوجہ رات کو احتلام ہو جانے کے غسل کا تیمم کیا۔ تو ان دونوں میں سے امام کون بنے اور کس کی امامت افضل ہے کہا کہ اس شخص کی جس نے وضو کا تیمم کیا ہے کیونکہ طہارت تو دونوں کو برابر حاصل ہے اور حدث ایک کا اصغر ہے اور دوسرے کا اکبر۔ اس لیئے وضو کے تیمم والے کی طہارت اقوی ہے۔

میں نے کہا۔ یہ تو تمہارا اجتہاد ہے۔ اب سنو! فقہاء نے تیمم غسل والے کو امامت کے لیئے افضل فرمایا ہے۔ وہ یہ بات سُن کر بڑے حیران ہوتے اور وجہ پوچھنے لگے۔ کہ فقہاء نے یہ بات کہاں سے فرمائی۔ میں نے کہا کہ فقہاء فرماتے ہیں۔ کہ جب پانی موجود نہ ہو۔ تو تیمم طہارتِ کاملہ ہے حدثِ اکبر کے لیئے بھی اور حدثِ اصغر کے لیئے بھی۔ جب تیمم طہارتِ کاملہ ہے تو جس نے غسل کا تیمم کیا ہے وہ افضل ہے کیونکہ نائب اکمل کا اکمل ہے۔ اس لیئے غسل والے کا تیمم اکمل ہے[1]۔

---

[1] اسی طرح عطاء بن ابی رباح سے سوال کیا گیا کہ عورتیں اگر باہم جماعت کریں۔ تو امامت کے لیئے ان میں کون افضل ہے۔ فرمایا کہ جو حاملہ ہو لکون طہرہا اکمل من طہر غیر الحامل لبراءتہا من الحیض بامامت حاملا۔ یہ جواب غیر مجتہد کبھی نہیں دے سکتا ۱۲۔ ظ

اس دلیل کو سن کر ان کی آنکھیں کھل گئیں اور کہنے لگے واقعی اجتہاد کرنا انہی حضرات کا کام تھا صاحبو! تم جب چاہو امتحان کر لو کہ حدیث سے بیس احکام تم مستنبط کرو اور وجہ استنباط پیش نظر رکھو پھر ان احکام کے متعلق فقہاء کا کلام اور ان کا استدلال معلوم کرو تو واللہ خود قسم کھا کر کہو گے کہ فقہاء حدیث اور قرآن کو خوب سمجھتے ہیں اہل حدیث کو فقہاء پر یہ اعتراض ہے کہ یہ احادیث کے خلاف مسائل بیان کرتے ہیں۔ میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی اگر عمل بکل الحدیث ہے۔ تو اس معنی کو تو تم بھی عامل بالحدیث نہیں۔ کیونکہ بہت سی احادیث کو جو حنیفہ کے موافق ہیں۔ تم چھوڑتے ہو اور اگر اس کے معنی عمل ببعض الحدیث ہیں تو اسی معنی کو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں یہ اور بات ہے کہ تمہارے دلائل بخاری و مسلم میں ہیں اور ہمارے دلائل مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں ہیں تو وہ بخاری مسلم کے بھی استاد اور استاد الاستاد ہیں۔ گو شاگرد زیادہ مشہور ہو جائے پھر اس کی کیا وجہ کہ تم ائمہ فقہاء کو حدیث کا مخالف کہتے اور ان پر طعن کرتے ہو۔

غیر مقلدین سے شکایت

اور دراصل ہم کو غیر مقلدوں سے اسی کی زیادہ شکایت ہے کہ وہ ہمارے ائمہ کو برا کہتے ہیں۔ اگر وہ ائمہ کو برا نہ کہیں۔ تو تقلید یا ترک تقلید سے ہم کو زیادہ بحث نہیں یہ تو ہر شخص کا خدا کے ساتھ اجتہادی معاملہ ہے خواہ تقلید سے خدا کو راضی کر لے یا ترک تقلید سے ہمارا اجتہادی خیال یہ ہے کہ ہم بدوں تقلید کے دین پر عمل نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کا اجتہادی خیال یہ ہے۔ کہ ترک تقلید سے بھی دین پر عمل ہو سکتا اور خدا راضی ہو سکتا ہے تو اس کو اختیار ہے ہم اس کے ساتھ نہ الجھیں گے مگر اس کی کیا وجہ کہ وہ مقلدوں سے الجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے ائمہ کو برا کہتے ہیں حالانکہ ہم ان کے ائمہ کو برا

نہیں کہتے بلکہ ہم تمام محدثین کو بھی اپنا امام سمجھتے اور ان کی عظمت کرتے ہیں اور کسی کی تحقیر کو جائز نہیں سمجھتے۔

ایک دفعہ میں قنوج گیا تو غیر مقلدوں نے میری دعوت کی حنفیوں نے تو مجھے منع کیا اور کہا کہ ان لوگوں کا کیا اعتبار کہیں سنکھیا نہ دے دیں۔ مگر میں نے دعوت قبول کی اور کھانے کے بعد یا قبل ان سے کہا کہ میں آپ کا بالقوہ یا بالفعل نمک خوار ہو گیا ہوں اس لیے میرے ذمہ آپ کی خیر خواہی لازم ہو گئی۔ اس خیر خواہی کی بنا پر میں آپ کو دو نصیحت کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ بدگمانی نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ بد زبانی نہ کرو۔ غیر مقلدوں میں یہ دو مرض زیادہ غالب ہیں اسی وجہ سے وہ ائمہ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک تاویل و قیاس کے معنی مخالفت حدیث ہیں گو وہ مستند الی الدلیل ہی ہو۔

ایک عامی نے ایک غیر مقلد عالم کو اسی بنا پر سخت الزام دیا۔ ان سے پوچھا کہ من ترك الصلوٰة متعمدا فقد کفر کے کیا معنی ہیں۔ کہا کہ معنی کیا ہوتے تاویل ہی کی کیا ضرورت ہے۔ بس جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔ عامی نے کہا کہ حنفی لوگ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے اور حدیث میں ہے کہ

لا صلوٰة لمن لم یقرء بام الکتاب۔ تو یہ لوگ آپ کے اصول پر کہ اس میں کچھ تاویل نہیں تارک صلوٰۃ ہوئے اور تارک صلوٰۃ کافر ہے۔ تو کیا حنفی سب کافر ہیں۔ جناب وہ عالم دم بخود ہو گئے اور ایسے خاموش ہوئے۔ کہ کچھ جواب نہ بن پڑا۔ کیونکہ وہ محض اس بات پر ان کی تکفیر نہیں کر سکتے تھے پس نہ حنفیوں کو کافر کہہ سکے اور نہ حدیث میں تاویل کر سکے۔ کیونکہ تاویل اور قیاس گناہ ان کے نزدیک شرک و کفر میں داخل ہے۔ مگر عامی نے ان کو الزام دے کر بتلا دیا کہ بدون تاویل و قیاس کے چارہ نہیں اور یہ الزام دینے والا ایک عامی لوہار تھا۔ غرض مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرنا جاہلوں کا کام ہے اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور بات ہے۔ مگر وہ کسی محقق عالم کے سامنے اپنے اجتہادات بیان کریں

تو حقیقت معلوم ہو جائے وہ ان کے سب اجتہادیات کی قلعی کھول کر رکھ دے گا اور
ان سے اقرار کرائے گا کہ تم اجتہاد کے ہرگز اہل نہیں اسی لیئے کہا گیا ہے ؎

ہمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

عارف فرماتے ہیں ؎

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اجتہاد ایک خاص آن ہے جو امر فروقی ہے بعض کتابوں کے یاد کر لینے کا نام اجتہاد نہیں ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست نہ ہر کہ سر بتراشید قلندری داند

البتہ دو علموں میں اب بھی اجتہاد باقی ہے۔ ایک طب باطنی میں ایک ظاہری میں۔ جو شخص ان میں مجتہد نہ ہو اس کو علاج کرنا جائز نہیں میں یہ کہہ رہا تھا کہ آجکل عوام کو اتباع علماء سے عار ہے۔ حتیٰ کہ بعض کو ائمہ کے اتباع سے بھی عار ہے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ خدا کا راستہ بدون اتباع علماء و اتباع ائمہ کے نہیں مل سکتا عوام اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ان کے لیئے طریقہ یہی ہے کہ علماء سے احکام پوچھ پوچھ کر ان کا اتباع کریں۔ ان کو علماء سے دلائل و حکم دریافت کرنے کا حق نہیں۔ صرف احکام دریافت کرنے کا حق ہے

علماء کے لیئے نصائح

اور علماء کو بھی چاہیئے کہ عوام کے سامنے دلائل و حکم بیان نہ کیا کریں۔ میرا یہی طرز ہے چنانچہ علی گڑھ میں ایک پروفیسر نے جو عربی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ مجھ سے ایک حدیث کا متن پڑھ کر جس میں آیا ہے۔ کہ زنا کی کثرت سے طاعون پھیلتا ہے۔ سوال کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت و عقوبت میں وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی۔ کہا ربط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ ربط کے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے آپ بدون علم ربط ہی کے حدیث پر ایمان رکھیئے۔ کہا اس میں ایک نفع ہے میں نے کہا وہ

کیا کہا زیادت اطمینان۔ میں نے کہا خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل؟ کہا دلیل اس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ. میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے۔ کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نافع تھی وہ آپ کو بھی نافع ہو۔ بس اس پر وہ خاموش ہو گئے علماء کو عوام کے ساتھ یہی طرز اختیار کرنا چاہیئے کہ دلائل و حکم و اسرار ان کے سامنے بیان نہ کریں اس سے ان کا دماغ خراب ہوتا ہے پھر وہ کوئی حکم بدون علت و حکمت معلوم کیئے بغیر قبول نہ کریں گے اور بعض احکام کی علل و حکم دقیق ہوتی ہیں عوام بیان کے بعد بھی ان کو نہیں سمجھ سکتے وہاں عوام یا تو عمل ترک کریں گے یا علماء علت و حکمت کے سمجھانے میں اپنا دماغ اور وقت ضائع کریں گے۔ اس سے بہتر یہی ہے۔ کہ عوام کے سامنے صرف احکام بیان کیئے جائیں۔ یہ تو علماء کا کام ہے اور عوام کا فرض یہ ہے۔ کہ علماء کا اتباع کریں۔ خود اجتہاد نہ کریں۔ ان سے احکام دریافت کریں۔ علل و حکم دریافت نہ کریں۔

علماء کو ایک بات کی اور نصیحت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جن کے سرپر بڑے موجود ہوں۔ ان کو اپنی شہرت کی کوشش نہ کرنا چاہیئے بلکہ جہاں تک ہو اپنے کو گم کرو، گمنامی میں رہو کیونکہ بڑا اندیشا سخت خطرہ کی بات ہے اور شہرت سے دینی و دنیوی مصائب کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

خویش را رنجور ساز و زار زار	تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم است	بند ایں از بند آہن کے کم است
چشمہا و خشمہا و رشکہا	بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

یعنی اشتہاری آدمی مجرم ہوتا ہے (یہ لطیفہ ہے) یہ تو آج کل قانون بھی ہے۔ پس سلامتی اسی میں ہے۔ کہ چھوٹے بن کر رہو اس میں دین کی بھی

سلامتی اور دنیا کی بھی اور جس کے سر پہ کوئی بڑا نہ ہو اس کے لیئے میں دوسرا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس کے مستحسن ہونے پر قسم کھا سکتا ہوں وہ یہ کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرے۔ انشاء اللہ غلطیوں سے محفوظ رہے گا۔

اس کے بعد میں ایک نئی بات کہتا ہوں۔ جو اکثر لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ کہ مرید کو شیخ کی رائے سے مخالفت کا حق نہیں۔ اگرچہ دوسری شق بھی مباح ہو کیونکہ مرید کا تعلق شیخ سے اُستاد شاگرد جیسا نہیں ہے۔ بلکہ اس طریق میں مرید شیخ کا معاملہ ایسا ہے جیسے مریض اور طبیب کا معاملہ ہے کہ مریض کو فتوے طبیب کی مخالفت جائز نہیں ایسے ہی یہاں مرید مریض ہے اور شیخ طبیب ہے۔ اس لیئے مرید کو شیخ کی مخالفت جائز نہیں ہاں دوسرا شیخ اس شیخ کے اجتہاد سے مزاحمت کر سکتا ہے جیسے ایک طبیب دوسرے طبیب سے مزاحمت کر سکتا ہے مگر مرید تو تربیت میں طبیب نہیں اور جب تک طبیب نہیں اس وقت تک مریض ہے پس اس کے ذمہ اتباع قول طبیب لازم ہے ہاں یہ شرط ہے کہ اس کا قول خلاف شریعت نہ ہو اگر مرید کے نزدیک شیخ کا قول خلاف شرع ہو تو مخالفت جائز بلکہ لازم ہے مگر ادب کے ساتھ گو واقع میں خلاف شریعت نہ ہو۔ مگر یہ تو اپنے علم کا مکلف ہے جیسے حضرت سید صاحب بریلوی کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصور شیخ تعلیم فرمایا تو سید صاحب نے اس سے عذر کیا۔ کہ مجھے اس سے معاف فرمایا جائے شاہ صاحب نے فرمایا۔ ؎

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

سید صاحب نے عرض کیا۔ کہ مے خواری تو ایک گناہ ہے آپ کے حکم سے میں اس کا ارتکاب کر لوں گا۔ پھر توبہ کر لوں گا۔ مگر تصور شیخ تو میرے نزدیک شرک ہے اس کی کسی حال میں اجازت نہیں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نے یہ جواب سن کر سید صاحب کو سینہ سے لگالیا کہ شاباش جزاک اللہ تم پر مذاق توحید و اتباع سنت غالب ہے۔ اب ہم تم کو دوسرے راستہ سے لے چلیں گے تقدیر شیخ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں غرض نبوت تو ختم ہو چکی ہے مگر سبیل حق منقطع نہیں ہوا اس کو علماء سے معلوم کرو اور یہ رحمت ہے کہ نبوت ختم ہو گئی ورنہ انکارِ نبوت سے کفر لازم آجاتا اور بہت سے مسلمان نبی کے انکار سے کافر ہو جاتے۔ اب کفر سے تو بچ گئے کیونکہ حضور کے بعد کوئی نبی نہیں۔ بس حضور کے بعد کسی امتی کے انکار سے کفر لازم نہ آئے گا۔ ہاں گناہ لازم آئے گا۔

اگر علماء و مجتہدین سے مخالفت و منازعت کی گئی صاحبو! مجتہدین کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہے کہ ان حضرات نے محنت کر کے احکام دین کو مدون کیا اور ہم کو پکی پکائی روٹی مل گئی مگر بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم تو خود ہی پکائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پکا کر دیکھ لو۔ پھر دونوں کا موازنہ کر لو خود فرق واضح ہو جائے گا پس اجتہاد نہ کرو۔ بلکہ اہل اجتہاد کا اتباع کرو۔ مجتہدین فی الاحکام الظاہرہ کا بھی اور مجتہدین فی الاحکام الباطنہ کا بھی تو یہ سبیل حق قیامت تک بواسطہ علماء کے باقی رہے گا۔ جو اتباع علماء ہی سے آپ کو مل سکتا ہے۔ بدون اس کے راستہ نہیں مل سکتا مقصود تو ختم ہو گیا

اب ایک بات باقی رہی۔ کہ اس سبیل کی اضافت سالک کی طرف جو کی گئی ہے۔ یہ باعتبار غایت ہونے کے ہے۔ کیونکہ یہ اس کا مقصود ہے۔ سالک نہ اس کا موجد ہے نہ مبلغ و داعی ہے۔ نہ داعی کا وارث ہے خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کو علماء سے خاص تعلق ہے۔ پس علماء کو چاہیئے۔ کہ وہ بھی حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کریں۔ تاکہ فیض میں برکت ہو محض تعلق علم کافی نہیں بلکہ تعلق عملی و حالی کی ضرورت ہے اور عوام کو علماء سے خاص تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ یعنی

عمر فاروق@ون اردو

تعلق اتباع کر ان کو خدا تعالیٰ سے بواسطہ علماء ہی کے تعلق ہو سکتا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ وقت زیادہ نہیں ہے۔ جن حضرات کی فرمائش سے یہ بیان ہوا ہے۔ وہ اسی ریل سے جانے والے ہیں اور اب ریل کا وقت قریب آگیا ہے۔ پس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

اشرف علی

۵ رجب ۴۹ھ

عمرفاروق@ون اردو

(التبشیر)

آدابِ اصلاح

آداب اصلاح کے بارے میں یہ وعظ موسوم بالتبشیر ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون ۵۰ منٹ تک بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

محترم عبدالحکیم صاحب نے اسے قلمبند فرمایا

سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔

اے وہ لوگو! جو اتفاق اتفاق پکارتے ہو اتفاق اس طرح نہیں پیدا ہوتا صرف چالیس دن کسی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو تمہیں طریقہ معلوم ہو۔

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

(از حضرت حکیم الامت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ و رسولہ وصلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد: فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا۔

تمہید

یہ ایک حدیث ہے۔ جس کے تین جملے ہیں۔ تین اس معنیٰ۔ میں کہ باعتبار تعلقِ معنوی کے دو دو جملے مربوط ہیں کہ جو حکم میں ایک ہی کے ہیں۔ ورنہ یوں تو چھ جملے ہیں اور اس کے مخاطبِ اوّل حضرت ابو موسٰی اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ ہیں۔ اور اول کی قید اس واسطے لگائی کہ مخاطبِ ثانی تمام امت ہے۔ وہ امت جن کو ان احکام کی ضرورت پیش آئے۔ وہ سب اس کے مخاطب ہیں اور خطاب اس وقت کا ہے جب کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے دو علاقوں پر ان دونوں حضرات کو حاکم بنا کر بھیجا تھا۔ ایک علاقہ پر ایک کو اور دوسرے پر دوسرے کو اور دونوں کی سرحد ملی ہوئی تھی۔ اس لئے عادۃً یہ بات لازم تھی۔ کہ دورہ میں جب اپنی اپنی سرحد پر پہنچیں گے۔ تو اتفاقات

ہو گا۔

نیز ملکی معاملات میں بھی باہم ایک کا اثر دوسرے پر پہنچے گا اس واسطے حضورؐ نے دونوں صاحبوں کو ایسے احکام تعلیم فرمائے۔ جن میں بعض وہ ہیں جن کا حاکم کو رعایا سے تعلق رکھنے میں لحاظ رکھنا ضروری ہے اور بعض وہ ہیں کہ جب ان دونوں صاحبوں کو عہدے ملے ہونے سے باہمی تعلقات رکھنا ضروری ہیں۔ تو ان احکام کا باہمی تعلقات قائم رکھنے کے لیئے لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے یا یوں کہو کہ اس میں ضمناً یہ امر تھا کہ باہمی تعلقات رکھیں اور اس کا یہ طریقہ تبلا دیا غرض اول کے دو حکم ایسے ہیں کہ اپنے محکومین کے ساتھ ان کا لحاظ رکھیں اور اخیر کا امر ایسا ہے کہ باہمی تعلقات میں اس کا لحاظ رکھیں یہ حاصل ہے اس حدیث کا۔

یہ مضمون گو نمکین نہ ہو گا۔ مگر تلخ بھی نہ ہو گا بلکہ شیریں ہو گا۔ کہ بعض اوقات طبائع سلیمہ کو شیریں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس معنی کو وہ نمکین سے بڑھ جاتا ہے اور تفصیل کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں ضمناً اگر کوئی ڈلی نمک کی آپڑے تو اور بات ہے۔ میں نے اس واسطے تمہید میں مصرح کر دیا۔ کہ شاید پہلےؔ کے بعض مضامین کی طرح اس میں بھی منتظر رہیں کہ شورش ہو گی۔ جوش ہو گا۔ تو اب شورش و جوش کا انتظار نہ کریں اور ہاں شیریں سے وہ مراد نہیں۔ جس کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ بلکہ یہ شیریں ایسا ہے جس کے استعمال کی ہر حالت میں ضرورت ہے نہ کہ گلقند۔ کہ کبھی کبھی استعمال کر لیا جاوے۔

ہر شخص کی ۲ دو حالتیں

لہ اس سے پہلے کوئی وعظ ایسا ہوا ہو گا۔ ۱۲ منہ

وجہ اس کے اختیار کرنے کی یہ ہے کہ یوں تو بہت سے مضامین ضروری ہیں. مگر پھر بھی ان میں کئی قسم ہیں بعض تو وہ ہیں. جن کی حاجت بھی شدید ہے اور لوگوں کو اس طرف توجہ بھی زیادہ ہے اور بعض وہ ہیں جن کی حاجت تو شدید بلکہ اشد ہے مگر توجہ بہت کم ہے تو مضمون اوّل قسم سے زیادہ قابل بیان کے ہوگا چنانچہ یہ مضمون بھی بالخصوص ایسا ہے کہ جس کی طرف توجہ کم اور حاجت زیادہ ہے اور حاصل اور خلاصہ اس کا یہ ہوگا (اس کو بطور مقدمہ کے پہلے سمجھ لیا جائے تاکہ اس سے اس حدیث کا پورا پورا لطف آئے. کہ ہر شخص کی دو حالتیں ہیں ایک صلاح کی اور دوسری اصلاح کی یا یوں کہو ایک صالح بننے کی دوسری مصلح بننے کی.

ہر چند کہ پہلی حالت بھی اصلاح کے مصدر سے مشتق ہو سکتی تھی کہ حاصل دونوں کا ایک ہی ہوتا مگر ضرورت کیا کہ مصلح کا لفظ کہہ کر ایک مضاف الیہ بڑھاؤں یعنی مصلح النفس کہوں اس لیے یہی کہنا مناسب ہے کہ ایک حالت صلح کی ہے اور ایک اصلاح کی اس میں قافیہ بھی ہو گیا اور فن بدیع کی رعایت بھی ہو گئی.

بہر حال ہر شخص کی دو حالتیں ہیں اور ان میں سے ہر وقت ایک نہ ایک ضرور رہے گی اور یہ تردید بطور مانعۃ الخلو ہے کیا معنی کہ یہ تو جائز نہیں کہ یہ حالت صلاح ہو نہ حالت اصلاح کیونکہ اگر اصلاح غیر کسی وقت نہ بھی ہو مگر اپنی صلاحیت تو ہر وقت ضروری ہے اس سے کوئی شخص کسی وقت خالی نہیں ہاں یہ جائز ہے کہ حالت صلاح بھی ہو اور حالت اصلاح بھی ہو: بہر حال یہ دو حالتیں ہیں اور ہر حالت کے کچھ آداب ہیں اور کچھ حقوق ہیں سو حالت صلاح کے حقوق و آداب تو اکثر بیان ہوتے رہتے ہیں اس لیے اس وقت دوسری حالت یعنی اصلاح کے حقوق و آداب کو بیان کے لیے اختیار کیا

سوجانا چاہیئے کہ آج کل اول تو کسی کو کسی کی اصلاح کی فکر ہی نہیں عام طور پر آزادی ہے۔

ع کسے را باکسے کارے نہ باشد

ہر شخص کا عمل ہے لیکن بہت تأسف کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ برتاؤ فقط دینی امور میں ہے۔ اگر یہ حالت عام ہوتی کہ جس طرح دینی امور میں دوسروں سے لاپروائی ہے۔ دنیوی امور میں بھی ایسی ہی لاپروائی ہوتی تو یہ تو جب بھی نہ ہوتا کہ شکایت نہیں شکایت تو جب بھی ہوتی مگر کم ہوتی نفس شکایت کی وجہ تو یہی ہوتی کہ دین کو دنیا پر قیاس نہیں کر سکتے کہ ایک شخص اگر ایک کو دنیوی امور میں آزاد رکھتا ہے تو دینی امور میں بھی آزاد رکھے۔ تو کوئی شکایت نہ ہو اس لیئے کہ دین بہت مہتم بالشان ہے بخلاف دنیا کے کہ دین کے مقابلہ میں کچھ بھی اہتمام کے قابل نہیں

کسبِ دُنیا

میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا سعی و تحصیل کے قابل نہیں کیوں کہ اہتمام اور شئے ہے سعی اور شئے ہے۔ اہتمام مقاصد کا ہوتا ہے سعی مبادی کی بھی ہوتی ہے تو دنیا کی سعی و تحصیل سے ممانعت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں الدنیا رأس کل خطیئۃ فرمایا ہے۔ وہاں کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضہ بھی فرمایا ہے دیکھئے کسب کو تو حضورؐ فرض فرما رہے ہیں گو یہ حکم کم ہمت لوگوں کے لیئے عیناً ہے اور جس کو ہمت ہو اس کے لیئے فرض کفایہ ہے یعنی اگر ساری دنیا کے آدمی تحصیل دنیا چھوڑ دیں تو گنہگار ہوں گے۔ ہاں اگر اہل ہمت چھوڑ دیں اور کم ہمت مشغول ہوں

تاکہ تارکانِ اسباب کو معونت ہو تو سب کے ذمہ سے فرض ادا ہو جائے گا۔ دیکھئے ہم تو دنیا کو فرض بتاتے ہیں لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا چھڑاتے ہیں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تحصیلِ دنیا میں اتنا توغل کیا جائے کہ تمام اہل دنیا پر دُنیا کی پرستش واجب کر دی جائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے اتنا بھی بہت ہے کہ ہم فرض کہتے ہیں مگر اس میں تفصیل ہے۔

سنیئے! اگر اہل دنیا متفق ہو کر تجارت ملازمت زراعت چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے اس واسطے جہاں انسان کی حقیقت روح ہے وہاں اس کا قوام بدن سے ہے اور وہ بغیر اجتماع و اہتمام کے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیئے تمام اہل دنیا پر فرض ہے۔ کہ اتنا اسباب جمع کر دیں کہ لوگ کافی طور پر تدبیرِ بدن کر سکیں اگر اتنا اسباب مہیا ہو جائے تو جو لوگ ترک اسباب کر دیں ان کے لیئے کچھ حرج نہیں لیکن کم ہمت پر اب بھی فرض ہے کہ وہ زراعت پیشہ ہو تو زراعت کرے تجارت پیشہ ہو تو تجارت کرے ملازمت پیشہ ہو تو ملازمت کرے۔

غیر شرعی ملازمت

اسی واسطے جب ہمارے حضرت سے کوئی شخص بیعت ہو کر پوچھتا کہ نوکری چھوڑ دوں۔ تو فرماتے تھے نہیں نہیں ایسا ہرگز نہ کرنا میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کوئی نوکری ایسی بھی ہو کہ نامشروع ہو اور مشروع نہ ملتی ہو تو نہ چھوڑو۔ ہاں اپنے کو گنہگار سمجھو۔ اگر کوئی کہے امر نامشروع کے چھوڑنے سے منع کرتے ہیں تو صاحبو! ہم نامشروع کے چھوڑنے سے منع نہیں کرتے بلکہ ایک نامشروع کو سپر بناتے ہیں بہت سے نامشروع کے لیئے۔ یعنی اس وقت اگر چھوڑے گا نہ معلوم کتنے معاصی میں مبتلا ہو گا کہیں چوری کرے گا جوا کھیلے گا جھوٹی گواہی دے گا لوگوں

کا قرض لے کر مارے گا اور نہ معلوم کیا کیا آفتیں کرے گا۔

پھر جب آگے بڑھے تو یہ خیال ہو گا۔ کہ اے نفس تو اس قدر معاصی میں مبتلا ہے۔ تیری نجات کیا ہو گی پس جب نجات نہ ہو گی تو الگ کرو۔ سارا جھگڑا اور خوب جی کھول کے جو کچھ ہو سکے کر لو اسے لیجئے ایک نامشروع کے ترک سے کفر کی حد تک پہنچ گیا۔

اب بتایئے یہ اچھا ہے کہ ایک نامشروع میں مبتلا ہو کر مسلمان رہے۔ یا یہ اچھا ہے کہ ایک نامشروع کو چھوڑ کر بہت سے نامشروع میں بھی مبتلا ہوا اور پھر مسلمان بھی نہ رہے

من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما۔

جو شخص دو مصیبتوں میں مبتلا ہو اس کو چاہیئے کہ ہلکی مصیبت کو اختیار کرے مثلاً ایک طرف میں گز کی کھائی ہے اور ایک طرف کنواں ہے جس میں پچاس ہاتھ پانی ہے وہاں ممکن ہی نہیں کہ گر کر زندہ رہ سکے جب یہ معلوم ہو گیا۔ کہ بغیر گرے پناہ نہیں تو عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ کھائی اختیار کرے کہ بلا تو ہاتھ منہ ہی ٹوٹنے پڑیں گے جان تو بچ جائے گی اسی طرح یہاں بھی واقع میں ایک مصیبت کی اجازت نہیں ہے بلکہ اور سینکڑوں معاصی سے بچانا ہے۔

جب ہماری نیت بخیر ہے تو ممکن ہے کہ ہم پر حق تعالیٰ کے یہاں ملامت نہ ہو بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ پر جو اشکال و جواب ہے وہی ہمارا بھی جواب ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰی اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ. قَالَ اَلْقُوا الآیۃ۔

موسیٰ علیہ السلام سے ساحروں نے پوچھا کہ تم اپنا عصا ڈالتے ہو یا ہم ڈالیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تم ہی ڈالو اشکال یہ ہے کہ

ساحروں کا یہ کہنا کہ:۔

اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم کفر کریں کیونکہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیئے آئے اور گویا یہ کہتے تھے کہ تم اظہارِ حق کرتے ہو یا ہم اظہار کفر کریں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اَلْقُوْا یعنی تم اظہار کفر کرو۔ تو کیا موسیٰ علیہ السلام نے اظہار کفر کی اجازت دے دی پس جو جواب ہے اس اشکال کا وہی ماخذ ہے ہمارے قول مذکور کا۔

جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو احقاقِ حق مقصود تھا اس احقاق کے لیئے اجازت اظہار کفر کو وسیلہ بنایا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام یہ جانتے تھے۔ جب میں عصا ڈالوں گا تو یہ سارے سحر مضمحل ہو جاویں گے جب تک سارے سحر ظاہر نہ ہو لیں گے تو ظہور معجزہ ہو گا کیسے؟ تو واقع میں اظہار کفر کی اجازت نہ تھی بلکہ احقاق حق کی تمہید تھی پس جو اس جواب کا حاصل ہے وہی ہمارا جواب ہے کہ ظاہراً اجازت ہے امر غیر مشروع کی، مگر حقیقت میں روکنا ہے بہر حال ہمارے حضرات ضعفاء کے واسطے اسباب کا چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

ترکِ دنیا

ہاں جو لوگ خدام دین اہل ہمت ہیں۔ ان کے لیئے یہی زیادہ مناسب ہے کہ وہ اسباب ترک کر دیں کہ دو کام ایک شخص سے نہیں ہو سکتے۔ دیکھو ملازم گورنمنٹ کو کسی اور ملازمت یا تجارت وغیرہ کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسی طرح سرکار حقیقی کے ملازم کو بھی نازیبا ہے کہ کسی اور کی ملازمت کرے یا تجارت کرے۔ جس طرح ملازم گورنمنٹ سلطنت کو اپنے مصارف کا کفیل سمجھتا ہے اسی طرح اسے بھی حق تعالیٰ کو اپنی معیشت کا

ذمہ وار سمجھنا چاہیے۔ اگر کوئی عالم قاضی ہو جائے یا اور کسی اور منصب پر بھی فائز ہو جائے۔ تو جو اس کا اصلی کام ہے اسے پورے طور پہ ہرگز ادا نہیں کر سکتا۔

اہلِ دین سے دُنیا کا سوال

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی سے ایک شخص نے نماز کا مسئلہ پوچھا قاضی صاحب نے حوض پر وضو کیا اور دو رکعت شکریہ کی پڑھیں پھر مسئلہ بتایا۔ اس نے پوچھا حضرت مسئلہ بتانے میں اتنا توقف کیوں کیا فرمایا کہ کتنی سال میں نماز کا مسئلہ پوچھا گیا۔ ورنہ حدود و قصاص بیع و شری ہی کے مسائل سے سابقہ تھا کیوں کہ قاضی تھے۔ قاضی کے یہاں تو دنیا ہی کے جھگڑے پیش ہوتے ہیں اور غیر ممکن ہے کہ لوگ قاضی صاحب سے اس لیئے نماز کے مسئلے نہ پوچھتے ہوں کہ سمجھتے ہوں کہ فرصت نہیں مگر ہمیں تو فرصت ہے کہ کوئی دنیا کا مشغلہ نہیں مگر لوگوں کو خود توجہ نہیں اگر کوئی شخص ہم ہی سے کوئی مسئلہ پوچھنے آتے بھی ہیں۔ تو یہی فرمائش ہوتی ہے کہ تعویذ دے دو۔

صاحبو! علماء سے تعویذ کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے سُنار سے یہ کہنا کہ گھاس کھودنے کا کھرپا بنا دو۔ سُنار کا کام تو یہ ہے۔ کہ وہ عمدہ نازک زیور بنائے۔ اسی طرح علماء کا کام مسئلے بتانا ہے۔ افسوس! گوشہ نشینوں سے دنیا کے کام کراتے ہو۔ کیا انہوں نے تمہارے دُنیا کے کام کرنے کے لیئے دنیا کو چھوڑا ہے۔ ہاں دُنیا کے کاموں کے لیئے دعا کرانا جائز ہے شکایت تو تعویذ کی ہے۔ ہاں اگر دس باتیں دین کی پوچھیں، اس میں ایک دنیا کی بھی پوچھ لی تو کچھ حرج نہیں اب غضب تو یہ کرتے ہیں کہ دو ماہ میں تو تشریف لائے اور کہا گیا کہ ایک تعویذ

دے دو فلاں کو بخار آتا ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ ریاضت کرتے ہیں اس سے قوت متخیلہ بہت بڑھ جاتی ہے بس جیسے تعویذ دیدیں گے وہ جھٹ پٹ اچھا ہو جاوے گا۔

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے۔ کہ ہماری مثال ایسی ہے۔ کہ ایک شخص بخیل تھا۔ اس نے بہت سے باورچی نوکر رکھ چھوڑے تھے۔ مگر کوئی عمدہ کھانا کبھی کسی سے نہ پکواتا تھا۔ ایک دن ان کے دار وغہ نے اس بخیل سے کہا کہ حضور کبھی مہینے دو مہینے میں تو کوئی عمدہ چیز پکوا لیا کیجئے اور یوں خالی بیٹھے رہنے سے تو ہم اپنا فن بھی بھول جائیں گے۔ بس یہی ہماری حالت ہے کہ کوئی ہم سے مسئلے پوچھتا نہیں۔ جس سے یہ نوبت پہنچی کہ ہم مسئلے بھولنے لگے کوئی بیع و شرا کا مشکل مسئلہ آجاتا ہے تو یاد ہی نہیں جو بغیر کتاب کے بتلا سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شریعت کے موافق معاملہ کرتا ہی نہیں۔

بہرحال دنیا کے اندر اتنے منہمک ہو رہے ہیں۔ کہ اہل دین سے بھی دنیا ہی کا سوال کرتے ہیں اس وقت بے توجہی کی وجہ سے دین کی بات نہیں پوچھتے۔ اس وقت لوگوں کو اتنی بے توجہی تو نہ تھی۔ مگر خود قاضی صاحب کو فرصت نہ تھی۔

ایک آدمی ایک کام کر سکتا ہے

بہرحال دو کام جمع نہیں ہوتے حتی کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ مولانا محمد مظہر صاحب فرماتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں ذکر و شغل اور درس و تدریس جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ ہم نہیں مان سکتے کیوں کہ دونوں کام دین کے ہیں نہ جمع ہونے کی کوئی وجہ نہیں مولانا نے فرمایا خیر نہ مانتے پھر جب خود ذکر و شغل کیا تو تمانع ہوا۔ بس اقرار کر لیا کہ واقعی دونوں جمع نہیں

ہو سکتے۔

میں دیوبند میں طالب علم تھا حضرت مولانا گنگوہی وہاں تشریف لے گئے۔ میں نے بیعت کی درخواست کی۔ فرمایا اس وقت یہ شیطانی خیال ہے جب کتابیں ختم ہو جائیں گی۔ اُس وقت اس کا قصد کرنا۔ اس وقت تو مولانا کے اس فرمانے سے بہت تعجب ہوا۔ مگر اب معلوم ہو گیا کہ واقعی ٹھیک فرمایا تھا کیونکہ تحصیلِ علم فرض ہے۔ گو یہ بھی فرض ہے اور ہم نے مانا کہ تحصیلِ علم سے بڑھ کر ہے مگر جس طرح نماز فرض ہے اور وضو سے بڑھ کر ہے مگر بغیر وضو کے نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح درویشی بھی فرض سہی اور بڑھ کر سہی تحصیلِ علم سے۔ مگر تحصیلِ علم اس کے لئے بمنزلہ وضو کے ہے۔ تو جس طرح وہاں اہمیت باعتبار موقوف علیہ ہونے کے وضو میں ہے۔ یہاں تحصیلِ علم میں ہے۔ تو بہرحال جب دو کام دین کے جمع نہیں ہو سکتے۔ تو ایک کام دنیا کا اور ایک دین کا کہاں جمع ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے حضرات صاحب ہمت کے لئے افضل سمجھتے ہیں کہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی سے اس کا تعلق نہ ہو۔ اسی کو فقہاء نے سمجھا ہے۔

قبولیتِ دعوت کے لئے دستور

لوگ کہتے ہیں فقہاء درویش نہیں تھے۔ ہاں اس معنی کر نہ تھے کہ رونا رُلانا نہیں آتا۔ مگر رونا ہی عبادت نہیں۔ ہر چیز عبادت ہے ہنسنا رونا سب بعض تو فقہاء کو یہاں تک کہتے ہیں۔ کہ کوتوال تھے۔ ہم نے مانا کہ کوتوال تھے مگر اس کی کیا دلیل کہ دوسرا وصف ان میں نہ تھا تو فقہاء نے علماء کے واسطے یہ دستور العمل لکھا ہے۔ کہ ہر جگہ کی دعوتیں مت کھاؤ۔

میں نے مدرسہ کانپور میں یہ قانون مقرر کر دیا تھا۔ کہ طلباء دعوت کھانے

کہیں نہیں جائیں گے جس کو کھلانا ہو یہیں لاکر کھلایا جائے لوگ کہتے ہیں بڑے متکبر ہیں اچھا صاحب متکبر ہی سہی کیا کیا جائے جب لوگ طلبہ کو ذلیل سمجھتے ہیں ہاں اگر کوئی اکرام کرے تو وہاں جانے میں کچھ حرج نہیں مگر اب تو کچھ پوچھو نہیں کہ لوگ کیا سمجھتے ہیں۔

ایک طالب علم ایک تحصیلدار کے یہاں کھانا لینے جایا کرتے کھانا ملنے میں دیر ہو جایا کرتی تھی یہ خالی بیٹھے رہا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے تحصیلدار صاحب سے کہا میں اتنی دیر خالی بیٹھا رہتا ہوں آپ کا لڑکا جو انگریزی پڑھتا ہے اس وقت تعطیل کے وقت بے کار پھرتا ہے میں اسے عربی بھی شروع کرا دوں وہ تحصیلدار کہنے لگے مولانا آپ نے عربی پڑھی تو میرے دروازے پر مانگنے آتے ہیں یہ پڑھے گا تو آپ کے دروازہ پر مانگنے جایا کرے گا اس پر اتنا تعجب نہیں جتنا ان طالب علم پر ہے کہ وہ پھر بھی کھانا لاتے رہے ؎

بئس المطاعم حین الذل تکسبھا

القدر منتصب والقدر مخفوض

ہمارے بعض اہل علم عذر میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔ ؎

آں کہ شیراں را کند روبہ مزاج

احتیاج است احتیاج است احتیاج

مگر اس کا جواب میں وہی دوں گا جو شہزادۂ ایران نے دیا تھا میرے بڑے ماموں صاحب ایک نواب کی حکایت بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ سرائے لکھنؤ میں ایک مسافر شہزادۂ ایران نے ان کی دعوت کی ؎

شریف گر متضعف شود خیال مبند

کہ پائے گاہ رفیعش ضعیف خواہد شد

نواب صاحب نے دعوت کھائی۔ مگر اس وقت شہزادہ کی یہ کچھ

خدمت نہ کر سکے اور یہ کہا کہ آپ ہماری ریاست میں تشریف لایئے
یہ ایک بار وہاں آئے ٹٹو پر سوار، مگر پھٹے حال۔ نواب صاحب کو اطلاع
ہوئی، غایت شوق میں باہر آ گئے اور اُن کی خستگی کو دیکھ کر ہمدردی سے
یہ بے جوڑ شعر پڑھ دیا۔ ؎

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

یہ سُننا تھا کہ شہزادہ بھڑک اُٹھا اور فی البدیہ یہ پڑھ دیا۔ ؎

شیر نگردد می شود روبہ مزاج
می زند بر کفش خود صد احتیاج

یہ پڑھ کر وہاں سے لوٹا۔ پھر نواب صاحب نے ہزار ہاتھ جوڑے
مگر وہ نہیں ٹھہرا۔ تو حضرت ہم بھی آپ کے عذر کا یہی جواب دیں گے۔
ہاں اگر کہیں عزت ہوتی ہو اور اہانت نہ ہوتی ہو تو جانے کچھ حرج نہیں
بلکہ وہاں نہ جانا تو ایک قسم کا تکبر ہے۔

بہرحال علماء کو حضرت بہلول کا مذہب اختیار کرنا چاہیئے کہ ایک
مرتبہ شہر میں شدت کی قحط سالی تھی۔ کسی نے عرض کیا۔ حضرت روٹی بہت
مہنگی ہو گئی ہے۔ فرمایا بھائی یہ اس سے کہو جس کے ذمہ تقسیم ہے۔ ہمیں کیا
ہمیں تو برابر ملے جاوے گی جاؤ اپنا کام کرو۔

صاحب حال کا حکم

ایک اور بزرگ دنیا سے تائب ہونے کی وجہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ
ایک مرتبہ سخت قحط سالی تھی۔ تمام لوگ فکر میں تھے۔ میں نے ایک غلام
کو دیکھا۔ کہ خوب موٹا تازہ ہے اور بے فکری سے گیند اُچھالتا پھرتا ہے۔
میں نے کہا تمام مخلوق قحط سالی سے پریشانی ہے۔ تمہیں بالکل فکر نہیں۔ جو اس

آزادی سے پھر رہے ہو۔ اس نے کہا مجھے فکر کی کیا ضرورت میرا نفقہ آقا کے ذمہ ہے اس کے دس گاؤں ہیں اب مجھے کیا فکر۔ فرماتے ہیں وہ بزرگ کہ اس کے جواب سے میرے قلب پر چوٹ لگی کہ اس کا آقا صرف دس گاؤں کا مالک ہے۔ اس پر اسے اتنی بے فکری ہے اور اے نفس! تیرا مالک تو تمام سماوات وارض کا مالک ہے۔ پھر تجھے اس قدر فکر۔ بس میں نے فوراً توبہ کی۔

اس حکایت سے کوئی صاحب کہیں یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ بس ہم بھی بے فکر ہو کر بیٹھ جائیں۔ نہ ہمیں نوکری کی ضرورت ہے نہ تجارت وزراعت کی۔ کیونکہ یہ بزرگ صاحب حال تھے اگر تم پر حال طاری ہو تو بسم اللہ مبارک ہو سب کو چھوڑ دو۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے۔

اکابر دیوبند کی دقت نظر

ہمارے حضرتؒ کی اتنی دقیق نظر تھی۔ کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ جیسے زبردست عالم ایک سوال کریں اور حضرتؒ انہیں جواب مسکت دیں۔ قصہ یہ ہے۔ کہ حضرت مولانا کی اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ایک ریاست سے نوکری آئی۔ سو روپے تنخواہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی تھی اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تین سو روپے تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں فلاں مطبع میں دس روپے کا ملازم ہوں۔ ملاحظہ کیجیئے۔ کہ مولانا اور دس روپے۔ قرآن کی تصحیح کا کام کرتے تھے۔ ہرچند مالک مطبع نے اضافہ کرنا چاہا۔ مگر یہی فرمایا۔ کہ میں تصحیح کا کام کر سکتا ہوں۔ اس کے لیئے یہی بہت ہیں تو تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میں دس روپے کا نوکر ہوں مجھے اسی کے خرچ کرنے کی فکر رہتی ہے۔ سو پانچ روپے تو اہل وعیال کو دیتا ہوں اور پانچ روپے طالب علموں کی ضروریات میں خرچ ہو جاتے ہیں۔

تین سو ملیں گے. تو مجھ کو تو وہی پانچ روپے کافی ہوں گے بقیہ کے لیئے ہر وقت میں اسی خلجان میں رہا کہ کیوں کر خرچ ہوں گے اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ میں تین سو روپے سے کم پر نہیں آسکتا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا حضرت! آپ نے یہ کیا کیا. اگر وہاں سے منظوری ہو جاوے. تو پھر کیا کیجیئے گا آپ کے مقابلہ میں ایک لاکھ بھی تھوڑے ہیں. تو اس کے آگے مولانا نے تحریر فرمایا کہ لیکن جب جاہوں گا گھر رہوں گا. جب جاہوں گا نوکری پر. جب خط وہاں پہنچا. معلوم ہو گیا کہ یہ حضرات کہیں نہیں جائیں گے. تو بس حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی یہ دس روپے کی نوکری برائے نام نوکری تھی نام تو تھا نوکری کا مگر حقیقت میں کیا یہ نوکری تھی.

اس حالت میں حضرت حاجی صاحبؒ سے رائے لیتے ہیں. نوکری چھوڑنے کی حضرت فرماتے ہیں پوچھنا دلیل تردد کی ہے. تردد دلیل خامی کی ہے. خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں جب قوت ہو گی رسے تڑا کے بھاگو گے بلکہ پوچھیں گے بھی نہیں اللہ اکبر سارے ارسطو افلاطون. بقراط وسقراط جمع ہو کر تو ایسا کلیہ نکال دیں. تو ضعیف کے لیئے یہی مسئلہ ہے کہ نوکری نہ چھوڑے.

ایک صاحب میرے پاس آئے مجھے اپنی زمینداری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے. میں نے منع کیا. بعد چند روز کے ان کی حالت سنبھلی. تو احساس ہوا. میرے بڑے شکر گزار ہوئے.

حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک بی بی نے اپنی جائداد وقف کرنے کی اجازت چاہی. حضرت نے منع کیا اگر کوئی کہے نیک کام سے منع کیا تو صاحب نیک کام سے منع نہیں کیا. بلکہ شر سے روکا ہاں کسی میں قوت ہو جاوے تو وہ مستثنیٰ ہے اگر کوئی کہے. کہ ہمیں کیوں کر معلوم ہو کہ ہم میں اتنی قوت پیدا ہو گئی ہے. کہ ہم ترک اسباب پر صبر کر سکتے ہیں کیا دی ہو گا. تو بات یہ ہے

کہ ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ ہم میں قوت پیدا ہو گئی ہے اور اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو شیخ کامل سے پوچھے اگر بزرگ سے ترکِ اسباب کی اجازت ہو جاوے تو اگر کمی بھی ہو تو شیخ کی برکت سے قوت بہت ہو جاتی ہے بہر حال یہ تفصیل تھی ترکِ اسباب کی جس کا حاصل یہ تھا کہ جو اقویا ہیں ان کے لیئے ہمارے حضرات ترکِ اسباب تجویز کرتے ہیں۔ ایسا شخص حق تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت معاش کی کیا سبیل ہے۔ فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے۔ کہ ضیافت تین دن ہے۔ ہم اللہ کے مہمان ہیں اور اللہ میاں کے یہاں کا ہر دن ایک ہزار برس کا ہوتا ہے تو ہم تین ہزار برس تک تو اللہ میاں کے مہمان ہیں۔ جب چوتھا ہزار شروع ہو گا۔ تو معاش کی سبیل پوچھنا سو اتنی مدت تک ہمیں ہی نہیں رکھیں گے۔ یہ نہ سمجھو کہ یہ شاعری ہے۔ بلکہ ان کی یہ حالت ہوتی ہے اسی کو ایک لطافت سے ظاہر کر دیا پس اس پر استدلال کے متعلق حرج نہیں ہو سکتا مثلاً اگر کوئی طالب علم شبہ کرنے لگے۔ کہ ہزار برس کا ایک برس یہ آج کے لیئے تھوڑی ہی ہے۔ یہ تو قیامت کے واسطے ہے۔ تو بات یہ ہے کہ یہ تو بزرگوں کے لطائف ہیں۔ دلیل نہیں ہے دلیل تو یہ ہے۔ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گر دلیلت باید از وے رو متاب

یعنی اُن کی دلیل تو قوتِ قلب ہے وہ نظر آوے تو پھر کچھ بھی شبہ نہیں اور جسے نظر نہیں آتی اسے اسی طرح سمجھاتے ہیں۔ اُن کا استدلال تو قوتِ قلب ہے۔ جب یہ حالت پیدا ہو جائے۔ تو ایسے لوگوں کو ترکِ اسباب جائز ہے۔ الحاصل دنیا کو دین پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ کسبِ دنیا بجز ضعفاء کے اور کسی کے لیئے ضروری نہیں تو بہر حال کوئی مادہ تو ایسا

نکلا جہاں دنیا چنداں ضروری نہیں۔ اگر اس میں کسی کو بے فکری ہو تو کچھ حرج نہیں۔ اگر اس میں یہ حالت ہو کہ:-

ع کسے را با کسے کارے نباشد

تو کچھ مضائقہ نہیں

دین میں بے فکری

لیکن دین میں تو کوئی مادہ ایسا نہیں نکل سکتا جس میں وہ ضروری نہ ہو۔ بلکہ دین ہر مادہ میں ہر وقت ضروری ہے۔ سو دنیا میں بے فکری ہونے سے بھی دین میں بے فکری کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ لیکن خیر پھر بھی اگر کسی شخص کو دین میں بھی بے فکری ہو اور دنیا میں بھی۔ کہ اگر اپنے بچہ کو کنویں میں گرتے دیکھے اور پھر بے فکری سے منہ پھیرے اور گرنے دے۔ تو ہمیں صبر آجاتا۔ کہ ان کی آزادی طبعی ہے شکایت بالکل تو رفع نہ ہوتی کہ کہاں دین اور کہاں دنیا۔ مگر ہاں قلیل ہو جاتی اور اب تو بہت بڑی شکایت ہے کہ دین میں آزادی ہے اور دنیا میں نہیں ہے۔ یہ تفاوت کیوں ہے؟

تفاوت کی بنا صرف یہی ہے۔ کہ جس کو اپنے نزدیک ضروری سمجھا۔ اس میں تو توجہ کی اور جسے غیر ضروری سمجھا۔ اس میں بے فکری اختیار کر لی چنانچہ نفع دنیا کو جب ضروری سمجھتے ہیں۔ تو اپنی اولاد کو صنعت و حرفت بڑی توجہ کے ساتھ سکھاتے ہیں۔ اسی طرح ضرر دنیا کو عظیم سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اپنے بچہ کو کنویں میں گرنے سے بچاتے ہیں۔ وہاں پر تو دیکھئے اپنی آزادی میں بھی خلل ڈالتے ہیں اور ان کی آزادی میں بھی خلل ڈالتے ہیں یہ کیا دنیا کے بارے میں تو ہمیں اتنی توجہ دیں۔ کہ باپ میں ہم اتنے کیوں آزاد ہیں کہ دوسرے کی اصلاح سے تو خبر ہی نہیں اور ان تعرض سے میرا یہ مطلب نہیں ہے شاید کسی کو غلط فہمی ہو کہ ساری دنیا سے لڑتا جھگڑتا پھرے

میں اس کو صاف کیے دیتا ہوں کیوں کہ مجمع عام اور خطاب عام میں ضرورت ہوتی ہے کہ مختلف پہلو صاف کر دیے جائیں خطاب خاص میں تو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

صوفیاء کی تعلیم

یہی راز ہے صوفیاء کی خلوت کی تعلیم کا لوگ سمجھتے ہیں وہ شریعت نہیں اس لیے خلوت میں تعلیم دیتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی نسبت لوگوں کا یہ گمان تھا کہ اُن کو جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ایسی خاص باتیں تعلیم فرمائی ہیں جو اوروں کو نہیں بتائیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ :-

ھل خصکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیء من دون الناس۔

یعنی کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی باتیں بتائیں ہیں۔ جو اوروں کو نہیں بتائیں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

واللہ ما خصنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیء الا فہما اوتیہ الرجل فی القرآن۔

بخدا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے ساتھ مجھے مخصوص کیا ہو ہاں مجھے ایسا فہم ضرور ملا ہے۔ جس سے قرآن سمجھتا ہوں اور اس فہم سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ ایسے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ جن پر عوام کا دسترس نہیں ہے۔

اور وہ معنی وہ نہیں ہیں جو صوفیاء بیان کرتے ہیں مثلاً :-

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔

کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے۔ فرعون کی طرف جانے

کا تو وہ موسیٰ سے مراد روح لیتے ہیں اور فرعون سے مراد نفس لیتے ہیں۔ تو معنی یہ ہوئے کہ جائے روح نفس کی طرف اور قرآن کے جو دو معنی ہیں ایک ظاہر اور ایک باطن۔ سو صوفیاء جو ایسے معانی بیان کرتے ہیں۔ نہ یہ ظاہر قرآن ہیں نہ باطن قرآن ظاہر کیا ہے مدلول اولی قرآن کا۔ کہ جسے عام لوگ سمجھتے ہیں۔ مثلاً لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الآیة فئ کا ذکر ہے یعنی فئ (مال غنیمت) مہاجرین کے لئے ہے اس کو سب سمجھ گئے اور باطن کیا ہے (یہ) وہ ہے۔ جو مثلاً اسی آیت میں مجتہدین سمجھے اور ان کے سمجھنے کے بعد ہم بھی اب سمجھ گئے کہ واقعی یہی معنی ہیں مثلاً ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ میں (رحمہم اللہ تعالیٰ) اس مسئلہ میں گفتگو ہوئی کہ اگر کفار قہراً مسلمانوں کے مال پر قابض ہو جائیں۔ تو مالک بن جاتے ہیں یا نہیں سب ائمہ کی رائے تھی کہ مالک نہیں ہوتے امام صاحب نے فرمایا۔ کہ مالک ہو جاتے ہیں اور دلیل اس کی یہی آیت ہے للفقراء المہاجرین کیونکہ فقیر کی تعریف ہے:۔

من لا یملک شیئاً۔

جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور ظاہر ہے کہ مہاجرین ہجرت سے پہلے مال دار تھے۔ مگر ہجرت کے وقت وہ مال کفار مکہ کے قبضہ میں ہو گیا تھا۔ اگر کفار مکہ قبضہ سے ان کے مال کے مالک نہ ہو جاتے۔ تو ان کو فقراء کیوں کہا جاتا اور مجازیہ خلاف اصل ہے۔ دیکھئے اب ہماری سمجھ میں بھی آ گیا۔

اور امام صاحب کا یہ مسئلہ ہم لوگوں کے حق میں بڑی رحمت ہے اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا۔ تو آج ہمیں حلال روزی نہ ملتی۔ اس واسطے کہ آج کل غیر مسلم سلطنتوں میں تحصیل واصول شریعت کے موافق کہاں ہوتی ہے۔ ہم جن کی نوکری کرتے ہیں۔ وہ ہمیں تنخواہ دیتے ہیں اور ان کی تحصیل اصول شریعت کے موافق نہیں۔ اس لیئے اور ائمہ کے نزدیک وہ خود مالک نہیں ہوتے

قرآن کے دینے سے ہم کب مالک ہو سکتے ہیں کیونکہ تملیک تو فروع ہے ملک کی۔ مگر امام صاحب کے نزدیک وہ مالک ہو گئے اس لیئے ان کے دینے سے ہم بھی مالک ہو جاتے ہیں اسی واسطے اسلامی ریاستوں کی نوکری سے غیر اسلامی ریاستوں کی نوکری کو اچھا سمجھتا ہوں کیونکہ یہ شرعاً مالک ہو گئے اور وہ مالک نہیں ہوئے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ بات ہے بڑی عجیب کہ مسلم کی نوکری سے غیر مسلم کی نوکری اچھی۔ ہاں جی عجیب ہی سہی۔ تو یہ مصلحت ہے امام صاحب کے مذہب میں۔ ایک انگریز کا قول ہے کہ امام صاحب کے مذہب پر تو سلطنت چل سکتی ہے اور دیگر ائمہ کے مذہب میں یہ بات نہیں۔ چونکہ یہ لوگ اہل تمدن و سیاست ہیں اس لیے اسباب ہیں۔ اُن کی شہادت معتبر ہے۔ تو یہ ہے باطن قرآن اور یہ ہر شخص کے ائمہ کے موافق متفاوت ہوتا ہے۔ مثلاً امام صاحب کے مرتبہ سے جن کا مرتبہ بڑا ہے۔ وہ اس سے آگے کے باطن تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام اسی کو کہتے ہیں۔ ؎

حرف حرفش راست در بر معنے

معنے در معنے در معنے

غرض صوفیاء جو خلوت میں تعلیم دیتے ہیں۔ وہ تعلیم شرعی ہی ہوتی ہے۔ مگر عوام میں بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتی اب لوگ نامعلوم کیا سمجھتے ہیں۔

اسی واسطے ایک غیر مسلم نے آج کل سلطنت کو رائے دی ہے۔ کہ صوفیوں کی خلوت کی تعلیم قابل نگرانی ہے کیونکہ مولوی تو جو کچھ کہتے ہیں ممبر پر بیٹھ کر کہتے ہیں جو سب پر آشکارا ہو جاتا ہے اور یہ لوگ چپکے سے کہتے ہیں۔ تو ان سے بڑا اندیشہ ہے۔ کہ خدا جانے کیا سکھا دیں۔ استغفر اللہ وہ کیوں

ایسا کرنے لگے۔ اگر یہ کہو کہ ایسا نہیں۔ تو الگ کیوں تعلیم کرتے ہیں۔ الگ اس لیے تعلیم کرتے ہیں کہ ایک شخص کی طبیعت کے موافق وہ ایک ہی پہلو پر گفتگو کرتے ہیں اگر مجمع عام میں بیان کریں تو ایک ہی بات سے ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے موافق ایک ایک پہلو نکال لے گا۔ اس لیئے ان کو اس کی ضرورت ہو گی کہ تمام پہلو خود ہی بیان کر کے ان پر منطبق کرے۔ تو اس کے لیئے بڑا وقت چاہیئے۔

آدابِ اصلاح

چنانچہ میں اس وقت اس پہلو کو بیان کر رہا تھا۔ کہ دنیا کی فکر تو ہے، دین کی فکر کیوں نہیں ہے۔ اس پر یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ اگر دین کی فکر ہو تو اس طرح نہ ہو جیسے ہمارے بعض احباب ہوا سے لڑتے پھرتے ہیں۔ کہ ہم بزرگ ہیں تو ساری دنیا بھی بزرگ بن جائے۔ اگر کسی نے تمہیں نسخہ بخار کا لکھ دیا ہے۔ تو تم خود پیو۔ ساری دنیا کو کیوں پلاتے پھرتے ہو۔ تو دین کی فکر کرتے ہیں تو ایسی کرتے ہیں جیسے بندر کے ہاتھ ادرک کی گرہ لگ گئی تو وہ بھی پنساری بن بیٹھا۔ دو چار مسئلے اصلاح الرسوم سے لے لیئے اور ساری دنیا سے لڑنے لگے۔ جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہ صحیح بھی ہے۔ تو اس کے آداب کی بھی ضرورت ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ۔

دین کی طرف بلاؤ مگر حکمت سے بلاؤ اصلاح کے لیئے بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔

یہ اصلاح کا طریقہ نہیں ہے جس طرح ہمارے یہاں ایک صاحب تشریف لائے تھے۔ عصر کی نماز پڑھی۔ بعد نماز کے دعا مانگنے سے پہلے ہمارے یہاں ایک اہل علم مہمان تھے۔ وہ تنگی کی وجہ سے صف سے ذرا

پیچھے کی طرف کھسک کر بیٹھ گئے یہ ہمارے مصلح صاحب کیا سمجھے کہ شاید انہوں
نے نماز بھی اسی طرح پڑھی ہو گی بس جھٹ پکار کر کہنے لگے۔ صف ٹیڑھی
کرنا جائز نہیں۔

میں نے کہا تمیز بھی ہے۔ اول تو تمہیں تحقیق کرنا چاہیئے تھا کہ نماز بھی
اسی طرح پڑھی ہے یا نہیں۔

دوسرے اگر تحقیق بھی ہو جاتا تو بھی نرمی سے کہنا چاہیئے تھا

تیسرے یہ کہ تم ایک عامی آدمی تمہیں تو بعد تحقیق کے بھی کسی اہل علم
کو کہنے کا منصب نہیں ہے چہ جائیکہ تم اتنی سختی سے کہتے ہو اسی طرح
علماء کو عوام پر بھی سختی نہ کرنا چاہیئے ہاں کہیں خاص قدرت ہو تو مضائقہ
نہیں۔ مگر بلاضرورت وہاں بھی سختی نہ کرنا چاہیئے۔

جو واقعی مصلحین ہیں انہوں نے اتنی رعایت کی ہے کہ کیا ٹھکانہ
ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھائی نے ایک شخص کو مسجد میں
ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہنے دیکھا اس وقت تو اور کچھ نہیں فرمایا۔
صرف یہ فرمایا کہ بعد نماز کے ذرا ٹھہر جایئے گا مجھے آپ سے کچھ مشورہ
کرنا ہے۔ وہ ٹھہر گئے سب چلے گئے تو فرمایا۔ مجھ میں ایک عیب ہے
اس کے متعلق میں آپ سے مشورہ لیتا ہوں یہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ میرا
پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے اور اس پر یہ یہ وعیدیں ہیں سو تم
ذرا دیکھنا کہ آیا واقعی لٹک جاتا ہے یا محض میرا وہم ہے انہیں فوراً
تنبہ ہوا اور کہا کہ حضرت آپ میں تو یہ عیب نہیں مگر ہاں مجھ میں ہے
اب میں توبہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ کبھی ٹخنوں سے نیچا پاجامہ نہ پہنوں گا
اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس رعایت کا۔ اسی کو شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں ہم نکردند تنگ

ترا کہ میسّر شود ایں مقام
کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

ظاہری تقدس

خدا جانے ہمیں تقدس پر کیوں ناز ہے۔ ہماری تو حقیقت کیا ہے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ۔

کہ اگر ہم چاہیں تو سارا علم سلب کرلیں ہمیں اپنے تھوڑے سے علم اور تھوڑے سے تقدس پر اس قدر ناز ہمیں کا ہے کا ناز ہے۔ جہاں ذرا تسبیح ہلائی اور بزرگ ہو گئے۔ اب ساری دُنیا سے جھگڑتے پھرتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ؎

غافل مرو کہ مرکب میدان مرد را
در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نو مید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

آپ کو کیا خبر ہے۔ کہ آپ کا سارا تقدس دھرا رہ جائے اور جن سے آپ جھگڑتے پھرتے ہیں۔ اُن کی آناً فاناً منزل تک رسائی ہو جائے۔

ہرہ کے ایک دوست بیان کرتے تھے۔ ایک شخص تمام عیوب میں مبتلا تھا۔ مگر یہ ہنر بھی تھا۔ کہ خدا تعالیٰ سے پوری محبت تھی۔ چنانچہ جب کوئی اسے کچھ کہتا۔ تو وہ یہ کہتا کہ تم کون۔ ہم جانیں اور ہمارا خدا۔ ایک دفعہ بیٹھے بیٹھے اسے یہ خیال آیا۔ کہ میں اس قدر گناہوں میں مبتلا ہوں۔ میرا کیا حال ہو گا۔ یہ خیال آنا تھا کہ رونے لگا۔ حتیٰ کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور کھانا پینا سب بند ہو گیا تین چار دن اس کی یہی کیفیت رہی۔ اس کے

بعد انتقال ہو گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ گنہگار شہید بلکہ شہید اکبر مردانہ خدا کی تلوار سے مارا گیا۔ ؎

نو مید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک بنیئے کو خواب میں دیکھا۔ کہ جنت میں ہے پوچھا تم یہاں کہاں۔ کہا مرتے وقت کلمہ پڑھ لیا تھا اب کیا کسی کو حقیر سمجھتے ہو اگر خدا چاہے ذرا سی دیر میں ناپاکی کو دھو کے طاہر بلکہ مطہر بنا دے۔ خواہ کتنا ہی بڑا کافر ہو۔

ایک شخص نے مجھ سے یہ پوچھا۔ کہ یزید کو لعنت کرنا کیسا ہے۔ میں نے کہا۔ اس شخص کو جائز ہے۔ جسے یقین ہو کہ ہم یزید سے اچھی حالت میں مریں گے۔ بس چپ ہی تو رہ گئے۔ ؎

گر رشک برد فرشتہ بر پاکی ما
گر خندہ زند دیو ز ناپاکی ما

ایمان چو سلامت بلب گور بریم
تحقیق شود پاکی و ناپاکی ما

ابھی کیا خبر کہ مرتے وقت ہم کس حال میں ہوں گے۔ ابھی تو کشتی منجدھار میں ہے اللہ جانتا ہے یہ فکر وہ فکر ہے۔ کہ اس کے بعد نہ کسی کی تکفیر کی فکر ہوتی ہے نہ تفسیق کی۔ میں اصلاح کو منع نہیں کرتا مگر ہاں حقیر نہ سمجھو۔ کیونکہ یہ تو تکبر ہے۔ خدا جانے انجام کیا ہو۔ چنانچہ ابھی سن چکے ہو۔ کہ اس شخص میں کتنے عیوب تھے مگر بلا کسی واسطہ بلا کسی شیخ کے منزل تک پہنچ گیا۔

اسی طرح شیطان کو دیکھو۔ کہ خدا کی قدرت ہے۔ آٹھ لاکھ برس تک عبادت کرتا رہا مگر ایک بات سے انکار کر کے مردود و مطرود ہو گیا میں نے اس مقام پہ لوگوں کو کہتے سنا ہے۔ کہ وہاں تو ذرا میں پکڑے

ذرا میں نواز دے۔ میں کہتا ہوں یہ اللہ میاں پر تہمت ہے۔ کہ ذرا میں پکڑ لیتے ہیں اس سے توبہ کرو۔ وہاں تو سبقت رحمتی علیٰ غضبی ہے۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ کہ ذرا میں نواز دیتے ہیں۔

باقی یہ نہیں ہوتا کہ ذرا میں پکڑ لیں۔ یہ شاہ اودھ نہیں ہیں کہ اندھیر نگری چوپٹ راج ہو کہ ذرا کسی سے ناخوشی ہوئی۔ اب پھانسی کے اوپر اسے مفر نہیں، شیطان جو راندہ گیا۔ تو کوئی تھوڑی بات نہ تھی جس پر راندہ گیا حکم ہوا سجدہ کرو۔ تو کہتا ہے نہیں کرتے۔ اگر آپ کا کوئی نوکر اس طرح جحود کرے تو بتایئے۔ کہ آپ کو کس قدر طیش ہو گا اور وہ نالائق تو حجت بھی کرتا ہے کہ:

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔

کہ میں آدم کو سجدہ کیسے کروں؟ مجھے نار سے پیدا کیا ہے اور انہیں خاک سے تو اس کی رائے میں یوں ہونا چاہیئے تھا کہ آدم اسے سجدہ کرتے۔ حجت کے ساتھ انکار کرتا ہے۔ گویا خدا کے امر کو بیوقوفی سمجھتا ہے پھر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ حکیم مطلق ایک امر کرے اور یہ اس کا مبنیٰ حماقت سمجھ کر اس کے امتثال سے انکار کرے۔ تو دیکھو اتنی عبادت بھی کی۔ پھر بھی ہونے والی بات ہوئی۔ تو اے نفس! کیا ناز کرتا ہے اپنی عبادت پر خاقانی کہتے ہیں۔ ؎

ابلیس گفت طاعت من بیکرانہ بود
سیمرغ وصل رادل وجان آشیانہ بود

آدم ز خاک بود و من از نور پاک او
گفتم منم یگانہ و او خود یگانہ بود

در لوح بد نوشتہ کہ ملعون شود یکے
ہر دم گمان بہر کس و بر خود گمان نبود

عمر فاروق @ون اردو

شیطان کہتا ہے کہ میں نے لوحِ محفوظ میں لکھا دیکھا تھا کہ آدم مخلوق ہوں گے پھر ان کو سجدہ کا حکم ہوگا اور ایک شخص سجدہ سے انکار کر کے ملعون ہوگا مجھے ہر شخص پر شبہ تھا کہ شاید یہ ملعون ہو مگر خود اپنے اوپر شبہ نہ ہوا کیونکہ اپنی عبادت کی وجہ سے اپنے ساتھ حسنِ ظن بہت بڑھا ہوا تھا اور بڑا ناز تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ حکم ہو جائے۔ کہ سوائے ایک شخص کے کوئی دوزخ میں نہ جائے گا۔ تو میرا گمان نہ فرعون پر ہو نہ ہامان پر، نہ قارون پر، نہ نمرود پر۔ بلکہ مجھے یہی خوف ہوگا۔ کہ کہیں وہ ایک میں ہی نہ ہوں اسی طرح اگر یہ حکم ہو جائے۔ کہ سوائے ایک کے کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ تو مجھے یہ احتمال ہوگا۔ کہ شاید وہ ایک میں ہی ہوں۔ ؎

اُو خواست تا فسانۂ لعنت کند مرا
کرد آنچہ خواست آدمِ خاکی بہانہ بُود
گویند ہا بلان کہ نہ کردے تو سجدہ
نزدیک اہلِ معرفت ایں جبہانہ بُود

جہلاء کہتے ہیں۔ کہ تو نے سجدہ نہ کیا مگر اہلِ جوش جانتے ہیں کہ۔ جف القلم بما ھو کائن یہ بڑا قطعہ ہے۔ مجھے سب تو یاد نہیں رہا۔ مقطع کہتے ہیں ؎

خاقانیا تو تکیہ بہ طاعات خود مکن
کیں بندہ بہر دانش اہلِ زمانہ بُود

تو اپنے ظاہری تقدس پر نظر کر کے کبھی کسی کو حقیر نہ سمجھ تمہیں کیا خبر ہے کہ:

ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

مرض سے بے خبری

امراض باطنی بہت دقیق ہیں۔ یہاں تک کہ مرض کبر ہی جو اخبث الامراض ہے۔ علماء تک مبتلا پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے کو کم از کم یہی سمجھتے ہیں۔ کہ ہم میں یہ مرض نہیں۔ بس یہی مرض ہے۔ ؎

علت ابلیس انا خیر بداست

ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

یہ مرض تو ہر مخلوق میں ہے کہ مریض ہیں مگر یہ مدعی بھی نہیں سمجھتے کہ ہم مریض ہیں۔ اگر کوئی مریض ہو اور وہ یوں سمجھے۔ کہ میں مریض ہوں تو وہ متواضع ہے۔ مگر افسوس ہے ان پر جو مریض ہیں اور انہیں اپنے مرض کی خبر نہیں یہ شخص متکبر ہے۔

ایسا شخص بہت اچھا جسے اپنے مرض کی خبر ہو اگرچہ وہ علاج نہ کرائے۔ کیونکہ خدا کا دربار عجیب رحمت کا دربار ہے۔ کبر کو علم مرض بھی خدا کے یہاں علاج کا کام دیتا ہے یہ بھی بڑی چیز ہے۔ اگر کوئی متواضع ہو کر اپنے کو متواضع سمجھے تو وہ متکبر ہے اور اگر متکبر اپنے کو متکبر سمجھے۔ تو متواضع ہے۔

امر بالمعروف کا طریقہ

تو بہر حال امر بالمعروف کرو۔ مگر کسی کو کبر کی راہ سے نہ کرو۔ اس سے اور فتنہ و فساد ہوتا ہے۔ اگر از راہ کبر نہ بھی ہو تب بھی جہاں فتنہ فساد کا اندیشہ ہو۔ وہاں کچھ مت کہو۔

حضرت مولانا گنگوہی نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا بعض پیرزادوں نے اعتراض کیا ایک پیرزادہ نے کہا وعظ کہنا نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ تمہیں کافر ہونے

سے بچا دیا کیوں کہ وہ وعظ کہتے تو تم اسے رد کرتے اور وعظ میں شرعی احکام ہوتے ہیں تو تم شریعت کا رد کرتے اور رد شریعت کفر ہے۔ واقعی موقع و مصلحت کا سمجھنا یہ کام ہے حکیم کا۔

اگر اس موقع پر حضرت وعظ فرماتے تو بجائے اصلاح کے اُن کا ایمان بھی جاتا رہتا۔ تو خوب سمجھ لو اگر ایسے موقع پر منع کیا۔ تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اور زیادہ کریں گے یا استخفاف کرینگے۔ اگر استخفاف کریں گے تو کافر ہو جائیں گے اور اُن کے کفر کا باعث یہ وعظ ہو گا۔

ایسے امر کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دو صحابہؓ نے نہایت استعجاب سے پوچھا کہ حضور اپنے ماں باپ کو کون گالیاں دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کسی کے ماں باپ کو گالیاں دے۔ وہ اس کے ماں باپ کو گالیاں دے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سبب بھی مباشر کے حکم میں ہے۔ تو جب تم سبب ہوئے ان کے کفر کے تو تم نے تعلیم دی کفر کی۔

میں ایک دفعہ کہہ کے بہت پچھتایا۔ ایک بانکے صاحب خلاف وضع بنائے ہوئے ریل بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہ شریعت کے خلاف ہے۔ تو اس نے کہا کہ شریعت کی یوں کی ماں کی گالی دی میں بہت پچھتایا کہ اتنا فحش آدمی ہے میں نے اس سے کیوں کہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ شریعت کی گستاخی ان ناصحین کی بدولت ہوئی یہ خواہ مخواہ انہیں چھیڑتے ہیں اور خود بھی بُرے بنتے ہیں۔ شریعت کو بُرا کہلاتے ہیں۔ میں بیعت کے وقت اس سے بھی منع کر دیتا ہوں کبھی کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں میں نے دیکھا ہے کہ جو کم عقل لوگ لڑتے پھرتے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کو گالیاں کہلاتے ہیں کیونکہ وہی حالتیں ہیں یا تو وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کرے گا تو یہ بھی مجھے پسند نہیں یہ استخواں فروشی

ہے کہ خواہ مخواہ اپنے بزرگوں کی تعریف کراتے پھریں جسے غرض ہوگی وہ خود آکے دیکھ لے گا۔ تمہیں کیا ضرورت ترغیب دینے کی دوسری حالت یہ کہ یا وہ گالیاں دے گا۔ لوگ کیا کرتے ہیں کہ ایک مسئلہ کسی کے سامنے بیان کیا اس نے ابھی تک تو انہیں کو بُرا بھلا کہا تھا اس کے بعد انہوں نے یہ کہہ دیا کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے بس اب ان بزرگ پر گالیاں پڑنا شروع ہوگئیں بھلا اس کی کیا ضرورت کہ ایک مخالف کے سامنے اپنے شیخ کا ذکر کرنا اور گالیاں کھلوانا اول تو آپ کو جوش ہی کیوں آیا اگر آیا تھا۔ تو اپنی ہی طرف منسوب رہنے دیا ہوتا یہ بالکل ناواقفی ہے۔ کہ جوش آپ کو ہو اور نام لیں شیخ کا تاکہ تبرا جو کچھ ہو وہ انہیں پر ہو۔

غرض یہ کہ یہ سب ایک ہی اصل کے شعبے ہیں۔ اس طرح اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اور عناد بڑھتا ہے اور مادۂ فاسدہ میں ترقی ہوتی ہے میرا ایک وعظ ہے۔ تعدی للغیر۔ اس میں اس کی تفصیل ہے اس لیئے یہاں مختصر بیان کر دیا۔

صُلح کل کی حقیقت

مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ میں اصلاح سے منع کرتا ہوں جو اصلاح کو ضروری نہیں سمجھتے اور استدلال میں یہ شعر پڑھ دیتے ہیں۔ ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص وعام

بامسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام

یہ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کا شعر نہیں۔ یہ تو کوئی ہندوستان کے اصطلاحی حافظ جی معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں یہ نہ سوجھا کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ یہ ذریعہ قرب نہیں۔ اگر یہ صحیح مذاق ہوتا تو پھر کسی کو کافر کسی کو مومن

کہتے کسی کو اولیاء اللہ اور عدو اللہ سے کیوں تعبیر فرماتے قرب تو رضائے محبوب سے ہوتا ہے۔ محبوب کے دشمن سے صلح کرنے میں محبوب کی رضا ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تو پھر قرب بھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ میاں کا طریقہ صلح کل کا نہیں۔ صلح کل کا طریقہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کو عمالقہ سے مقاتلہ کرنے کا کیوں حکم ہوتا؟ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب کیوں ہوتا ہے۔ جاھد الکفار اور یہ ارشاد کیوں ہوتا ہے۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ تو آپ ایک پہاڑ پہ چلے گئے۔ اور وہاں جا کر پکارا۔

یا صباحاہ یا صباحاہ۔

اس کلمہ کے معنی تو یہ ہیں۔ کہ اے صبح کے وقت کی لوٹ اے صبح کے وقت کی لوٹ اور ماخذ اس کا یہ ہے۔ کہ عرب میں رات کو لوٹ مار کم ہوتی تھی۔ صبح کے وقت لوٹتے تھے۔ کہ وہ لوگوں کے سونے اور سنانے کا وقت ہے۔ تو جب کبھی کوئی لٹا جاتا تھا یا اور کوئی امر عظیم پیش آتا۔ تو یا صباحاہ یا صباحاہ پکارا جاتا تھا۔ خواہ صبح کا وقت نہ بھی ہو۔ یہ آواز سن کر ساری قوم اس کی امداد کے لیئے جمع ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس محاورہ کے موافق حضورؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر یا صباحاہ یا صباحاہ پکارا۔ تھوڑی سی دیر میں ساری قوم جمع ہو گئی۔

آپ نے فرمایا۔ مجھے جانتے ہو میں کون ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں آپ محمد امین ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اگر میں تمہیں خبر دوں۔ کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے جو عنقریب آ کر تمہیں ہلاک کر دے گا۔ تو تم کیا سمجھو گے؟ کیا سچا سمجھو گے؟

انہوں نے کہا۔

ما جربنا علیك الا صدقاً۔

ہم نے آپ کو جہاں تک آزمایا سچا ہی پایا لہٰذا ہم اسے بھی سچ سمجھیں گے آپ نے فرمایا بس میں تم کو خدا کے عذاب سے ڈراتا ہوں کہ وہ عنقریب آنے والا ہے اگر تم اس سے بچنا چاہتے ہو۔ تو صدق دل سے کہو لا الٰہ الا اللہ۔

بس یہ سن کر جل بھن گئے ابو لہب آپ کا چچا تھا جھلا کر کہنے لگا۔

تباً لك سائر الیوم الہٰذا جمعتنا۔

خدا تمہیں برباد کرے کیا یہی بات تھی جس کے لیئے ہمیں جمع کیا تھا۔ حق تعالیٰ کو اس کا یہ کلمہ اپنے رسول کی شان میں بُرا معلوم ہوا اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ۔

ابولہب ہی برباد ہو جئیو۔ بلکہ برباد ہو گیا۔

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔

اور اس بربادی سے نہ اسے اس کا مال بچا سکتا ہے نہ اس کی کمائی۔

وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ۔

اور اس کی بیوی لکڑیاں چننے والی ہے بعض لوگوں نے تو اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے۔ کہ اس سے اس کا اظہار بخل مقصود ہے کہ باوجود مال و دولت کے پھر بھی اتنی کنجوس ہے۔ کہ لکڑیاں خود چن کر لاتی ہے عرب میں بخل کو زنا سے بھی زیادہ قبیح سمجھتے تھے بعضوں نے کہا ہے۔ کہ یہ جنگل سے خار دار لکڑیاں چن کر لاتی تھی اور حضورؐ کے راستہ میں بچھا دیتی تھی تاکہ آتے جاتے آپ کو تکلیف ہو

ایک مرتبہ ایک تھرلائی حضورؐ کے مارنے کو گئے مگر آپ اُسے نظر نہ آئے اگر حضورؐ اس وقت صلح کل سے کام لیتے تو تمام عرب مسخر ہو جاتا تو، معلوم ہو گیا کہ صلح کل مذہب ملحدوں کا ہے۔ اس لیئے میں اس سے بھی منع کرتا ہوں۔ لہذا اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی بھی اصلاح کرنا ضروری ہے۔

طریقۂ تربیت

دیکھو کہ اصلاح کرنا علاج کرنا ہے۔ فرق اتنا ہے۔ کہ اصلاح روحانی علاج ہے اور یہ جسمانی۔ مگر نفس علاج ہونے میں دونوں برابر ہیں اور یہ معلوم ہے۔ کہ علاج بغیر مطب کے کوئی نہیں کرسکتا پس جس طرح علاج جسمانی کے لیئے مطب کی ضرورت ہے۔ اسی طرح یہاں بھی کسی طبیب روحانی سے پہلے مطب کرو اس کے بعد پھر علاج کے درپئے ہو۔ دو چار کی اصلاح کے لیئے کچھ نہیں مگر اصلاح عام کے لیئے اڑنا، ایک ایک سے لڑنا جھگڑنا بگڑنا ٹھیک نہیں، اس کے لیئے پہلے مرض کی پہچان علاج کا طریقہ طبیب کامل سے سیکھ لو اس کے بعد اصلاح کرو۔

تو ایک تو اس میں کوتاہی ہے۔ کہ ایک کو دوسرے کی اصلاح کی فکر نہیں۔ دوسرے اگر فکر کرتے بھی ہیں تو طریقہ نہیں معلوم۔

اس حدیث میں دونوں باتیں مذکور ہیں ترغیب و ترہیب بھی ہے اور طریقۂ تربیت بھی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

یسرا ولا تعسرا۔

آسانی کرنا و شواری مت کرنا

وبشرا ولا تنفرا۔

خوشی کی باتیں کرنا نفرت مت دلانا۔

و تطاوعا ولا تختلفا۔

ایک دوسرے کا کہا ماننا اختلاف مت کرنا۔ یہ ترجمہ ہوا حدیث کا اس میں پہلے دو امر تو عام لوگوں کی اصلاح کے متعلق تھے۔ یہ تیسرا حکم اس میں باہمی تعلقات کا ادب بتلا دیا۔ یعنی باہم اتفاق سے رہنا۔

ترجمہ سے حاصل ترجمہ میں آ گیا ہوگا۔ اب اس کی تحقیق سنیئے۔ اول فرماتے ہیں:۔

یسرا و لا تعسرا دوسرا حکم فرماتے ہیں۔ بشرا و لا تنفرا ان دو دو حکموں کی کیا ضرورت تھی صرف امر اول ہی پر اکتفا کیوں نہ کی۔ بس یوں فرما دیتے کہ یسرا آسانی کرنا بس کافی تھا اور دوسرے میں یوں فرما دیتے۔ کہ بشرا تو یسرا و لا تعسرا سے کیا بات بتلائی؟

منقول تو دیکھا نہیں۔ مگر لغت و آثار تتبع کرنے سے اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ اصلاح کے دو طریقے ہیں۔ ایک فعل ایک قول۔ مثلاً فعل تو یہ کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر مصلے پر کھڑا کر دیا۔ کہ نماز پڑھو قول یہ کہ زبان سے کہا کہ نماز پڑھا کرو یا یوں مثلاً کسی بچہ سے کہا کہ فلاں کھیل مت کھیلو۔ ایک یہ کہ اس کھیل کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ تو اصلاح کبھی فعل سے ہوتی ہے کبھی قول سے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں طریقوں کو الگ الگ کر کے بتلایا ہے۔ کہ اگر کر کے بتلاؤ تو آسان بتلاؤ۔ ایسا نہ ہو دشواری میں پڑ جائے مثلاً یوں کہنا کہ ایک گھنٹہ میں سانس لیا کرو۔ رطوبت تحلیل ہوگی اس طرح دشواری میں ڈالنا مناسب نہیں۔ اس کی بہت تفصیل ہے۔ ایک شخص میں دس عیب ہیں۔ وہ دفعۃً سب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ تو منع تو کرے سب کو۔ یہ تو نہ کرے کہ منع نہ کرے۔ ہاں سب کے چھوڑنے پر مجبور نہ کرے۔

ایک شخص نے رسوم شادی کے متعلق مجھ سے کہا کہ ایک دم سے نہ منع کیا کرو۔ ایک ایک کو منع کرو۔ میں نے کہا سلام ہے۔ جب میں ایک کو منع کروں گا ایک کو منع نہ کروں گا۔ تو مجھ سے بدگمان ہوں گے کہ رسوم ہونے میں تو دونوں برابر ہیں پھر ایک کو کیوں منع کیا اور ایک کو کیوں نہ منع کیا۔ پھر بار بار منع کرنے سے قلب میں تنگی پیدا ہو گی کہ یہ تو روز ایک بات کو منع ہی کرتے رہتے ہیں۔ خدا جانے کہاں تک قید کریں گے۔ اس لئے منع تو سب کو کروں گا۔ مگر مجبور نہیں کرتا کہ سب کو ایک دم سے چھوڑ دو۔ تم چھوڑنے میں ایک ایک کر کے چھوڑ دو۔ تو بہر حال اگر کسی میں عیوب بہت سے ہوں۔ تو بتا تو دے سب کو۔ مگر پہلے ایک کو چھوڑا دے۔ پھر دوسرے کو چھوڑا دے۔ پھر تیسرے کو چھوڑا دے۔

شیخ کامل کی شفقت

صوفیاء اس راز کو خوب سمجھتے ہیں۔ خشک علماء چاہتے ہیں۔ آج ہی سب عیوب چھوٹ جائیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ خشک علماء میں ضابطہ ہوتا ہے، شفقت نہیں ہوتی۔ اور صوفیاء میں شفقت ہوتی ہے اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں۔ ؎

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم ست
زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

شیخ کامل کی حالت یہ ہے کہ اگر ناخوش بھی ہوتے ہیں تو ظاہر میں برہم ہوتے ہیں مگر دل سے خفا نہیں ہوتے۔

شاہ ابوالمعالی صاحب نے شاہ بھیک صاحب کو نکال دیا تو یہ روتے پھرتے تھے۔ تین دن کے بعد پھر وہی الطاف وہی انعام تھا

شاہ ابوالمعالی صاحب نے زبان سے تو نکالا تھا۔ مگر دل سے جذب کر رہے تھے۔ اگر دل سے بھی نکال دیتے۔ تو شاہ بھیک صاحب کو کبھی شوق و ذوق پیدا نہ ہوتا۔

ع نفرت فرعون میدان از کلیم

فرعون کو جو موسٰی علیہ السلام سے نفرت تھی۔ وہ اس وجہ سے تھی۔ کہ موسٰی علیہ السلام ہی کو فرعون سے نفرت تھی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو بھی فرعون سے نفرت تھی۔ جب فرعون ڈوبنے لگا۔ تو کہنے لگا۔ کہ میں موسٰی کے پروردگار پر ایمان لاتا ہوں۔ تو جبریل علیہ السلام نے اس کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دی۔ کہ تیرا منہ اس لائق نہیں۔ کہ تو اس سے کلمات ایمان جاری کرے۔ تو پھر موسٰی کو کیوں نہ نفرت ہوتی اب آگے مسئلہ تقدیر کا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو ایسا کیوں بنایا۔

ایک مرتبہ مجھے شبہ پیدا ہوا۔ کہ حق تعالیٰ کو قدرت تھی کہ ابتدا ہی سے سب کو نیک بنا دیتے۔ پھر کیوں نہ ایسا کیا۔ میرے قلب میں خود بخود جواب پیدا ہوا۔ کہ ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

بس تسلی ہو گئی۔ کہ حکم تکوینی کا مقتضا یہی ہے۔ کہ کوئی نیک ہو، کوئی بد ہو کوئی مومن ہو، کوئی کافر ہو۔ آگے تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ غرض موسٰیؑ اور جبریلؑ کو نفرت تھی۔ اس سے اسے بھی نفرت تھی۔ تو یہ بزرگوں کی محبت تھی کہ تم ان کی طرف کھنچتے ہو۔ بہر حال انہیں شفقت ہے اور اہل ظاہر کو شفقت نہیں۔ اسی واسطے ایک دفعہ کہہ کر بس ہو گیا مانو چاہے نہ مانو اور وہ تدبیریں نکالتے ہیں۔ طرح طرح کی سہولتیں پیدا کرتے ہیں۔

یہاں سے آپ کو قرآن مجید کی تکرار کا حال معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ مختصر المعانی

میں تکرار نہیں۔ ہدایہ میں تکرار نہیں اور قرآن مجید میں تکرار ہے۔ حضرت آپ باپ بنے ہوں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شفیق باپ کا جی نہیں مانتا۔ ایک ہی بات کو بار بار کہتا ہے۔ ایک دفعہ کہہ چکا ہے مگر جب پھر وہی حرکت کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ تو مقتضائے شفقت پہلے کہے ہوئے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ پھر کہتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی تکرار بھی عین شفقت ہے۔ اس کی معترضین نے یہ قدر کی۔ کہ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ شفقت ہی تو ہے۔ کہ دو ہاتھ۔ دو پیر، دو آنکھیں، دو کان دیئے۔

ایک ملحد نے قرآن کے تکرار پر اعتراض کیا تھا کہ خدا تعالیٰ مکرر کیوں فرماتے ہیں کسی مخلوق کا اس میں تصرف ہوا ہے۔ بادشاہ وقت نے اس کو یہ سزا دی۔ کہ جلاد کو حکم دیا۔ کہ اس کا ایک ایک عضو حذف کر دو۔ کیونکہ تکرار خدا کا فعل نہیں ہے تکرار شیطان نے کی ہے۔ بس مکرمت عیب چیز ہے۔ اگر مکرمت ہوتی۔ تو ان معترضین کی بھی تکرار حذف کر دی جاتی۔ پھر کسی کے دل میں اعتراض وشبہ تو کیا وسوسہ بھی نہ آتا بہرحال تکرار کی یہ وجہ ہے۔

اور یہ ایک عجیب بات ہے جو مذکور ہوئی منقول نہیں دیکھی۔ شفیقوں کے برتاؤ میں غور کرنے سے ایک بات ذہن میں آگئی واقعی قرآن سمجھنا ہو تو عامہ خلائق کے حالات میں غور کرو۔ تو اسرار اچھی طرح منکشف ہو جاویں گے۔ اب آپ نے نظر تصنیف سے دیکھا۔ تو خواہ مخواہ شبہے پیدا ہوں گے۔ تو شیخ کامل اور عالم ظاہری میں یہ فرق ہے۔ کہ یہ ایک ہی بات کو مکرر بتلاتا ہے اور وہ ضابطہ کا برتاؤ کرتا ہے۔ اس کی شفقت کی یہ حالت ہے۔ کہ کہہ دیا سب کو کہ دس مرض تمہارے اندر ہیں۔ مگر ایک ایک کو چھڑائے گا۔ کہ بار اور گرانی نہ ہو اور وہ چاہے گا۔ کہ آج ہی تمام چھوڑ کر یہ جنید وقت بن جائے۔

اسی وجہ سے بعضے شیوخ پر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ امراض میں مبتلا پاتے ہیں اور علاج نہیں کرتے۔

ایک چور تھا۔ اسے اپنی حالت پر افسوس ہوا۔ ایک بزرگ کے پاس جاکر مرید ہوگیا۔ اُن بزرگ نے مرید کرلیا اور اس سے بھی توبہ کرائی۔ کہ چوری مت کرنا۔ اور خانقاہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ صبح کے وقت ذاکرین اُٹھتے ہیں تو جوتے ندارد۔ بڑی تلاش کے بعد اس طرح ملتے ہیں۔ کہ میرا وہاں آپ کا وہاں ایک پوائی میری تو ایک آپ کی۔ تو بڑی دقت تلاش کرنے میں ہوا کرتی تھی۔ آپس میں سب ذاکرین کہنے لگے۔ یہ واہیات حرکت کون کرجاتا ہے۔ اس کو پکڑنا چاہیئے ایک صاحب پہرہ پر مقرر کیئے گئے جب رات زیادہ گزری اور سب سو گئے۔ تو دیکھتے کیا ہیں۔ کہ نئے مرید صاحب یہ حرکت کر رہے ہیں۔ پکڑے گئے۔ رات بھر پہرہ میں رکھے گئے۔ صبح کو شیخ کی خدمت میں پیش کیئے گئے۔ شیخ نے پوچھا۔ کیوں میاں تم نے یہ حرکت کی۔ اس نے کہا ہاں میں نے یہ حرکت کی ہے۔

دیکھو! شیوخ سے اپنے مرض کو کبھی مت چھپاؤ۔ یہاں تاویلیں نہیں چلیں گی۔ وہ فراست سے معلوم کرلیں گے۔ اگر کھانسی اُٹھ رہی ہے گو سل نہیں ہے۔ فقط دسک ہے۔ طبیب سے ہرگز نہ چھپاوے۔ اسی طرح شیخ سے عیب نہ چھپاوے۔ بلکہ اگر شیخ کہے اور تم میں وہ مرض نہ بھی ہو تو کہہ دوے۔ تمہارا حرج ہی کیا ہے۔ آپ تاویلیں کیوں کرتے ہیں۔

حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

چنداں کہ گفتیم غم با طبیباں
درماں نکردند مسکین غریباں

اس سے مراد اہل ظاہر ہیں۔ ؎

ما حالِ دل را با یار گفتیم
نتواں نہفتن درد از طبیباں

اس سے مراد شیخ کاملین ہیں۔ طبیب سے کیا ماننہ۔ اسی طرح مرشد کہ اس سے نہ چھپانا چاہیئے: ناقص سے تو کہے نہیں۔

شیخ غیر کامل

ایک دفعہ ایک حالت مجھ پہ پیش آئی تھی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ہر ایک اس کا اہل نہیں۔ کہ اپنی حالت اس پر ظاہر کی جا دے۔ اناڑی آدمی لمبے چوڑے وظیفوں سے کام لیتے ہیں۔ جس طرح کپاس کھائی بوجھو گے۔ جہاں ان سے ایک بات کہی۔ انہوں نے ایک وظیفہ تبلا دیا دوسری حالت کہی اس کے لیئے انہوں نے ایک اور وظیفہ تبلا دیا۔ انہوں نے کہا وسوسے آتے ہیں۔ انہوں نے ایک وظیفہ تبلا دیا۔ غرض وظیفہ در وظیفہ تبلاتے چلے جاتے ہیں۔

علی حزیں جس وقت دہلی میں آیا۔ ایک مکان کرایہ کا لے کر ٹھہر گیا۔ دو تین روز کے بعد مالک مکان نے آ کر پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں۔ کہا کوئی تکلیف نہیں مگر اس تذکرۃ الاولیاء کو کہیں اور لیجا دو۔

اس مکان کے ایک حصے میں ایک بدائی فقیر رہتا تھا۔ جو شجرہ پڑھا کرتا تھا۔ علی حزیں نہایت نازک دماغ تھا۔ اسے تکلیف ہوتی تھی تو میں کہتا ہوں۔ کیا مجموعہ وظائف بنو گے۔ یہ تو شیخ غیر کامل کی تربیت کا حال ہے۔ شیخ کامل کہتا ہے وسوسے آنے دو کچھ پرواہ نہ کرو۔ عوام الناس کے نزدیک وہی زیادہ شفیق ہیں۔ جو مجموعہ وظائف بتا دیں۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ حضرت کیسے شفیق ہیں ارے بھائی تمہیں کیا خبر علاج کرو۔ نسخہ برتنے سے معلوم ہو گا تو ایسی ہی بڑی بڑی حالتیں پیش

آتی ہیں غرض اناڑی سے تو کچھ نہیں۔

ایک اناڑی پیر نے ایک شخص کو حبس دم کا شغل بتلایا۔ اس نے کرنے کے بعد اپنی حالت کہی کہا کیئے جاؤ۔ یہاں تک کہ وہ غریب مر گیا

میں کہتا ہوں اس پیر پر خون کا گناہ ہوا۔ حدیث شریف میں ہے۔

من تطبب ولم یعلم منہ الطب فلھو ضامن

یعنی جو شخص بغیر جانے ہوئے علاج کرے گا، وہ ضامن ہوگا۔ اسی طرح جو شخص بغیر جانے ہوئے پیری مریدی کرے، وہ ضامن ہے کہ علت دونوں میں مشترک ہے۔

جیسے ایک طبیب نے کسی کو مسہل دیا تھا حال کہا گیا حکیم صاحب: دست آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا آنے دو۔ کہا کہ بہت آرہے ہیں، کہا آنے دو، یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ حکیم صاحب سے کہا گیا۔ کہنے لگے اللہ اللہ اتنا بڑا سخت مادہ جس کے نکلنے سے مر گیا۔ اگر رہتا تو نہ معلوم کیا آفت ہوتی۔ حضرت ایسی ہی بعض شیوخ کی حالت ہے۔ کہ بس چڑھ جائے سولی پر اللہ بھلا کرے گا ایسوں ہی کی نسبت فرماتے ہیں۔

ع
دست ناقص دست شیطان ست دولد

یعنی جو شیطان سے بیعت کا نتیجہ ہے۔ وہی ایسے شیخ کی بیعت کا انجام ہے۔ تو غیر کامل سے ظاہر نہ کرے۔ کامل سے چھپائے نہیں۔

محقق کی تربیت

غرض چور سے پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کی۔ اس نے کہا ہاں کی کیوں کی۔ کہا جب وقت چوری کا آتا ہے۔ تو نفس کہتا ہے چل چوری کر۔ میں کہتا ہوں اچھا چل کریں گے۔ تھوڑی دیر تک جوتیاں الٹ پلٹ کرتا ہوں۔ تو طلب وتقاضا بجھ جاتا ہے اگر آپ منع کریں گے۔ تو پھر چوری

کروں گا شیخ نے کہا کہ تم پیرا پھیری کیا کرو۔ ذاکرین سے بھی کہہ دیا کہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے

شیخ سے بڑھ کر کہتا ہوں۔ کہ اس وقت پیرا پھیری اس کے لیئے واجب تھی۔ یہی راز ہے امام غزالیؒ کے اس قول کا کہ وہ فرماتے ہیں جب تسبیح سے جی گھبرائے۔ تو واجب ہے ہنسنا بولنا۔ اس وقت کے علماء نے گو ان کی کتاب آگ میں جلوائی۔ مگر بعد میں وہ سونے سے لکھی گئی۔ امام غزالیؒ کے فتوے عجیب غریب ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ مکہ معظمہ کے متعلق مضامین شوقیہ کا بیان کرنا ایسے شخص کے سامنے جس کو حج اس لیئے جائز بھی نہیں (کہ اہل وعیال سے فرصت نہیں) حرام ہے۔ اب وحشت ہوتی۔ کہ مکہ کے فضائل بیان کرنے کو حرام فرماتے ہیں۔ اس واسطے حرام فرماتے ہیں کہ وہ سُن کر چل پڑے گا اور گنہگار ہوگا اور اس کے گناہ کا سبب یہ فضائل بیان کرنے والا ہوگا۔ حضرت محقق ہونے کی ضرورت ہے۔

ایسے امور حضورؐ سے بھی ثابت ہیں بنی ثقیف جس وقت مسلمان ہونے آئے۔ تو حضورؐ سے یہ شرط کی۔ کہ ہم مسلمان تو ہوتے ہیں۔ مگر نہ تو زکوٰۃ دیں گے، نہ جہاد کریں گے آپ نے فرمایا اچھا۔ لوگوں کو بڑی وحشت ہوئی۔ کہ ترک فرض کی اجازت دے دی۔ آپؐ نے فرمایا مسلمان تو ہونے دو مسلمان ہو کر سب کچھ کریں گے۔

ایک بزرگ کی خدمت میں ایک ڈوم حاضر ہوا عرض کیا میں مرید ہونا چاہتا ہوں۔ مگر طبلہ سارنگی نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت نے فرمایا۔ اس شرط سے مرید کرلیں گے کہ جماعت کی نماز کبھی مت چھوڑنا۔ اس نے کہا بہت اچھا۔ قسم کھالی۔ ایک جگہ مجلس نشاط تھی۔ وہاں یہ بھی تھا جب اذان کی آواز آئی۔ طبلہ سارنگی چھوڑا۔ اذان کی آواز پر چلے تمام مجلس بے لطف

اب تمام میں شہرت ہوئی کہ اس کو بلانے سے مجلس بے لطف ہو جاتی ہے رفتہ رفتہ لوگوں نے بلانا ہی چھوڑ دیا تو ان حضرت نے طبلہ سارنگی نہیں چھوڑا مگر طبلہ سارنگی نے انہیں چھوڑ دیا سبحان اللہ طبیب ایسے ہوتے ہیں۔ کہ زمین تلخ تھی مگر اس پر شکر لگا کر اسے شیریں کر دیا۔

ایک شخص نے حضرت سے بیعت کی اور شرط کی۔ کہ نماز نہیں پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا مگر تھوڑا سا اللہ کا نام لے لیا کرنا۔ عرض کیا بہت اچھا۔ اور بیعت ہو گئے۔ نماز کا وقت آیا۔ پکا ارادہ تھا۔ کہ نماز نہ پڑھوں گا۔ بدن میں خارش ہونے لگی۔ ہزار تدبیریں کیں مگر کسی طرح نہ تھمی۔ بس ٹھنڈا پانی جو لگایا تو کسی قدر سکون ہوا۔ مگر بالکل رفع نہ ہوئی لوگوں نے کہا وضو تو کر چکے۔ نماز پڑھ لو شاید رک جائے۔ اب جو نماز شروع کی۔ سکون بڑھتا گیا۔ جوں ہی ختم ہوئی۔ بالکل سکون ہو گیا۔ بس جہاں وقت نماز کا آیا خارش شروع ہوئی ادھر نماز شروع کی ادھر خارش رک گئی۔ میں نے جس وقت انہیں دیکھا پکے نمازی اور تہجد گزار تھے۔ یہ تو برکت تھی۔ مگر تدبیریں بھی ہوتی ہیں۔

قادر بخش خاں رئیس نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مولانا مظفر حسین صاحب جب گڑھی تشریف لائے۔ انہیں معلوم ہوا خان صاحب کے پاس گئے۔ اور فرمایا۔ کہ مجھے آپ سے کچھ مختصر سا کہنا ہے۔ انہوں نے کہا فرمایئے فرمایا۔ کہ آپ نماز نہیں پڑھتے نماز پڑھا کیجئے۔ خان صاحب نے کہا۔ سچی بات ہے مجھے ڈاڑھی چڑھانے کا شوق ہے۔ وضو کرنے سے سب بال برابر ہو جاتے ہیں اور بے وضو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ فرمایا بے وضو ہی پڑھ لیا کیجئے۔ اجازت ہے۔ خان صاحب نے ایک وقت کی نماز تو بے وضو پڑھی۔ جب دوسرا وقت آیا۔ خیال پیدا ہوا کہ کیا بے وضو پڑھیں۔ محنت بھی کریں اور نفع کچھ بھی نہ ہو۔ بس ایک وقت بے وضو پڑھ کے دوسرے

وقت سے باوضو نماز پڑھنے لگے۔ اس طرح سے وہ نمازی بن گئے اور ڈاڑھی چڑھانا بھی چھوٹ گیا۔ حضرت تو ایک چنگاری لگا گئے تھے تو بزرگوں کی یہ بات بے ناقصین کیا سمجھیں گے۔ گو پیری مریدی کرنے لگیں۔ ے

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

درنیابد حال پختہ ہیچ خام

پس سخن کوتاہ باید والسلام

اور ایسے ہی مبصر کا کام ہے۔ کہ بچوں کو ہر بات سے نہ روکے۔

ایک حکایت ہے۔ کہ ایک شخص کے گھوڑے میں یہ مرض تھا۔ کہ لید کر کے پلٹ کے اسے سونگھتا تھا۔ جب آگے بڑھتا تھا ایک شخص مسافر سوار ملے کہا میں اس کا یہ عیب نکال دوں گا اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے پیچھے چلے۔ گھوڑے نے اپنی عادت کے موافق جہاں لید کر کے اُسے سونگھنے کا قصد کیا۔ ان مسافر نے جو کر پیچھے تھے۔ منہ پر ایک چابک رسید کیا۔ گھوڑا سیدھا سیدھا آگے کو ہولیا۔ دس بارہ کوس اسی طرح قطع ہوئے اور پھر اُس نے دو چار مرتبہ مار کھانے کے بعد ایسا نہیں کیا سمجھے۔ کہ اب ٹھیک ہو گیا۔ آگے اس مسافر کا رستہ بدلتا تھا۔ وہ جُدا ہو کر چلا گیا۔ اب جو چلے تو اس نے دیکھا کہ اب وہ کوتوال تو ہے نہیں۔ لوٹا اور تمام لیدوں کو سونگھتا ہوا چلا گیا۔ ساری منزل گویا کالعدم ہو گئی۔ انہوں نے کہا اچھا درست کیا۔ اس سے تو پہلے ہی اچھا تھا۔ کہ اتنا حرج تو نہ ہوتا۔ بات کیا تھی۔ کہ قوت شامہ میں تقاضا جمع تھا۔ جب اُسے موقع ملا۔ اس نے اُسے پُورا کیا۔

اسی طرح اگر بچوں کو ہر شرارت سے روک دیا جائے گا تو ان کے قوت متخیلہ میں اس کا تقاضا جمع رہے گا جب موقع ملے گا۔ ایک دم سے

سب کی کسر نکالیں گے۔ تو اب آپ نے دیکھا کہ یسّرا کا کیا راز ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تو ہے فعلاً اور بشّرا ولا تنفّرا یہ ہے قولاً یہ عجیب علاج ہے۔

اثر مضامینِ رحمت

خصوص اب تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ رحمت و بشارت کے مضامین ترہیب سے زیادہ نافع ہوتے ہیں میں نے ایک رسالہ شوقِ وطن لکھا ہے۔ کہ لوگ طاعون سے بھاگنے لگے تھے۔ اس کے دیکھنے کے بعد موت کا خوف باقی نہیں رہتا واقعی اگر شوق ہو تو کیوں بھاگے۔ بلکہ آپ کے شوق میں تو یہ حالت ہو کہ ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویران بروم
راحت جاں طلبم وزپئے جانان بروم
نذر کردم کہ گر ایں غم بسر آید روزے
تا درِ میکدہ شادان و غزلخوان بروم

پھر موت سے کیا اندیشہ۔ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ مومن کے لیئے دُنیا کے عیش و آرام سے آخرت کی دوزخ بھی اچھی ہے۔ اس کے دیکھنے کے بعد لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے موت سے وحشت تو کیا اور شوق پیدا ہو جاتا ہے اور اسی کو عراقی فرماتے ہیں ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

کہ گویا موت کے لیئے تیار ہو گئے۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ کہ بشارت سے بہت نفع ہوتا ہے۔ یہ اسلام کا ہے سے پھیلا۔ یہ پھیلا تبشیر سے تالیفِ قلب سے، حسنِ تدبیر سے نہ کہ شمشیر سے کیوں

صاحب اگر بزورِ شمشیر پھیلا تو اتنے شمشیر زن کہاں سے آئے تھے اور پھر وہ کیوں کر مسلمان ہوئے وہ تالیفِ قلب ہی سے مسلمان ہوئے۔ حضرت صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل ان کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوتے تھے۔

ترغیبِ صحبت

یہ راز کے اندر یہ بھی داخل ہے۔ کہ اپنی اصلاح پوری طرح کر لو کہ دوسرے کے دیکھنے سے اصلاح ہو جاوے۔ میں جو ترغیبِ صحبت کی دیتا ہوں۔ اس میں یہی راز ہے کہ دیکھنے سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ کہ خواہ مخواہ لوگوں سے اپنے شیخ کی ثنا و صفت کی جاوے۔ میں اس کو استخواں فروشی سمجھتا ہوں یہ مہمل بات ہے۔ اس میں دوسرے کو شبہ ہو جاتا ہے۔ کہ یہ گرگے انہیں کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ بس تعریف کا اچھا طریقہ یہ ہے۔ کہ اپنی حالت کو درست کر لو کہ لوگ تمہارے مربی کی تعریف کریں کہ ان کی صحبت میں یہ اثر ہے۔ ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم!
ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

جب ایک شخص کی صحبت سے تمہاری حالت درست ہوئی تو یہ

طریقہ کھینچنے کا ہے ہرگز یہ طریقہ اچھا نہیں کہ لوگوں کو کھینچو یہ گروہ بندی ہے ہاں اگر کوئی خود رغبت کرے تو مضائقہ نہیں۔ اب تک اس طریقے کی بھلائی ذہنوں میں جمی ہوئی تھی اس لیئے میرے یہ الفاظ ناگوار ہوئے ہوں گے۔ مگر کیا کروں بتجربہ سے مجبور ہوں کہ اس طریقے میں بہت سی خرابیاں معلوم ہوئیں تو بہر حال ایک طریقہ اصلاح کا یہ ہے کہ خود اپنی حالت درست کرلو

ناصح غیر عامل

ایک بڑھیا اپنے لڑکے کو ایک بزرگ کی خدمت میں لائی اور عرض کیا کہ حضرت یہ گڑ بہت کھاتا ہے اسے نصیحت فرما دیجئے ان بزرگ نے فرمایا کل لانا۔ دوسرے دن بڑھیا اس لڑکے کو لائی۔ ان بزرگ نے نصیحت فرمادی۔ کہ میاں گڑ بہت مت کھایا کرو۔ نقصان کرتا ہے۔ اس کے بعد اس لڑکے نے گڑ کھانا چھوڑ دیا خدام نے پوچھا کہ حضرت! ایک دن کی تاخیر میں کیا مصلحت تھی۔ فرمایا کہ جب تک مجھے بھی گڑ کھانے کی عادت تھی۔ اب میں نے وہ عادت چھوڑ دی اگر اس وقت کہتا تو اثر نہ ہوتا۔ اب میرے لہجہ میں قوت زبان میں برکت قلب میں طاقت پیدا ہو گئی۔ اب تجربہ کر لیجئے۔ کہ ناصح غیر عامل کا لہجہ نرم ہوتا ہے، نہ برکت ہوتی ہے نہ قوت ہوتی ہے۔ اس سے اثر بھی نہیں ہوتا اگر کوئی غیر عامل بتکلف اپنے لہجہ میں قوت پیدا کرلے تو اس کی وقاحت اور بے شرمی ہے۔ اسی ضعف کو کسی نے کہا ہے۔ ؎

احب مناجاۃ الحبیب باوجہ

ولکن لسان المذنبین کلیل

مجبور ہوں سے باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر خطاوار ہوں اس لیئے

زبان یاری نہیں دیتی۔

ایک اور بات بھی تو ہے۔ جب اس طرح سے کہا جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ بھی کیا کرتے ہیں تو جائز بھی نہ ہو گا کہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں:۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

طالب علموں کے کام کی بات ہے۔ یہ معنی نہیں جو خود نہ کرے وہ کہے بھی نہیں۔ کیونکہ لعن تامرون نہیں فرمایا۔

نکتہ اس میں یہ ہے کہ امر ہوتا ہے انشاء اور یہاں ہے قول جو اخباری ہے اب معنی یہ ہوئے کہ لم تخبرون عما لا تفعلون۔

چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ الآیۃ

شانِ نزول دیکھ لو شانِ نزول اس کا یہ ہے کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ اگر ہم کو معلوم ہو جاوے جس سے خدا راضی ہو۔ تو ہم بھی کریں نازل ہوا کہ کرو۔ نہ کر سکے بس وہ لوگ دعوےٰ ہی کرنے کا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ انہوں نے فقط دعوےٰ کیا تھا کسی کو نصیحت تھوڑا ہی کی تھی۔ بس خوب سمجھ لو کہ نصیحت کرنا تو فی نفسہٖ جائز ہے مگر اس طرح سے ناجائز ہے کہ باوجود عامل نہ ہونے کے عامل معلوم ہو اس حیثیت سے متضمن کذب ہے نہ اس حیثیت سے کہ نصیحت ہے اب اکثر لوگ اس کی تفسیر غلط سمجھتے ہیں چنانچہ مولوی صاحب سے کوئی وعظ کو کہے۔ تو یہ آیت پڑھ دیتے ہیں

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

بھائی اگر تم عامل نہیں بھی ہو تو وعظ کہنے میں کیا حرج ہے۔ ہاں اس طرح نہ کہو کہ عامل معلوم ہو کہ کذب اور کبر ہے اسی طرح اگر کوئی اپنی

حالت ایسی بنائے۔ جس سے تارک معلوم ہو تو اسی حالت کا ذب کے اظہار کا گناہ ہوگا اسی طرح چاہے حال ہو چاہے قال۔ جو مالا تفعلون کے خلاف ہوگا ناجائز ہوگا۔ تو ایسے طور پر نصیحت کرنا بھی جائز نہیں اور اس طرح سے نصیحت کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ کہ عامل نہ معلوم ہو۔ ہاں دوسرے کو ایسی نصیحت سے کم نفع ہوگا

چنانچہ مشائخ کہتے ہیں جو شیخ ذکر و شغل نہ کرتا ہو اس کی تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ اسی واسطے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے:۔

وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ۔

کہ خلوت اختیار کیجئے۔ کہ یہاں تعور کے اعتبار سے بھی کوئی نہ ہو تھوڑا سا بھی وقت خلوت کا اگر کوئی مقرر کر لے تو تعلیم میں برکت ہوتی ہے اور اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ تو پیروں کی خلوت بھی یسرا میں داخل ہے۔

علمی نکتہ

آگے فرماتے ہیں:۔

بشرا و لا تنفرا۔

یہاں پر ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی ذہن میں آئی کہ تبشیر کے مقابل تو انذار آتا ہے۔ تنفر کا لانا بظاہر بلاغت کے خلاف معلوم ہوتا ہے یا تو انذرا و لا تنفرا فرماتے یا بشرا و لا تنذرا فرماتے۔ کہ مقابلہ درست ہو جاتا۔ آج ہی یہ بات سمجھ میں آئی کہ بہت بڑی بات کی طرف اشارہ فرمادیا۔ بات یہ ہے۔ کہ بشرا کے وہ معنی مراد لیئے ہیں۔ جو تنفرا کے متقابل ہیں۔ نہ معنی جو لا تنذرا کے متقابل ہیں تو تبشیر اس مقام پر تنفیر کا تو مقابل ہے انذار کا مقابل نہیں کیونکہ انذار کو بھی شامل ہے انذار کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ وحشت ہو ایک یہ کہ الفت ہو۔ پہلی قسم تنفرا میں داخل

ہے دوسری قسم بشرا میں داخل ہے۔ مثلاً انذار سے یوں جی خوش ہوتا ہے۔ کہ جب مردہ کو قبر میں رکھ دیتے ہیں تو جنت سے پہلے دوزخ دکھلائی جاتی ہے۔ کہ اگر اعمال اچھے نہ ہوتے اور اصلاح نہ ہوتی تو یہ ٹھکانا تھا۔ تو اس جہنم دکھلانے کو دخل خوش کرنے میں نہیں تو کیوں دکھلائی حضرت جہنم دکھلا کر خوشی اور بڑھادی۔ اب جنت کو دیکھ کر زیادہ خوشی ہو گی۔

الحمد للہ الذی نجانی۔

اسی طرح جو دُنیا کے رنج وغم دیکھ چکے ہیں۔ وہ کہیں گے:۔

الحمد للہ الذی اذھب عنی الحزن۔

حدیث میں ہے کہ جب تمام اہل ایمان جنت میں چلے جائیں گے اور جنت نہ بھرے گی۔ تو حق تعالیٰ جنت کے لیئے ایک نئی مخلوق اور پیدا کریں گے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے۔ کہ بھئی! اُن سے تو ہم زیادہ مزہ میں ہیں۔ کہ انہوں نے کوئی چیز جنت کے مقابل دیکھی ہی نہیں۔ انہیں اس کی کیا قدر اور کیا خوشی۔

بہر حال انذار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس سے لوگ نا اُمید ہو جاتے ہیں اور ایک یہ کہ انذار اور اس کے ساتھ ہی اس سے بچنے کی تدبیر بھی بتا دی جاوے۔ مثلاً سلطنت کا ایک حکم اور اس کے ساتھ ہی اس سے بچنے کی تدبیر بھی بیان کردے۔ اس کو محقق سمجھ سکتا ہے۔ غیر محقق نے چغلی غیبت وغیرہ کا عذاب تو بیان کر دیا۔ مگر یہ نہ بتایا۔ کہ اس مرض سے نجات کیونکر ہو سکتی ہے۔ اور ایک محقق شیخ کامل جہاں عذاب بیان کرے گا۔ وہاں اسباب اس بات سے بچنے کے بھی بیان کرے گا۔ مثلاً امراض مذکورہ سے بچنے کے لیئے یہ تدبیر بتائے

گا۔ کہ بولو تو سوچ کر بولو۔ کہ کسی کی حکایت تو نہیں۔ جس میں غیبت ہو یا شکایت تو نہیں جس میں چغلی ہو۔ تو دیکھو کہا انہوں نے بھی مگر اس طرح کہ نا امید نہیں کیا اور اہل ظاہر اس طرح کہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہو کہ ہمیشہ کے لیے مردود ہو گیا، شیطان بن گیا اور اہل باطن برابر تسلی دیتے رہتے ہیں کہ فکر مت کرو۔ اس سے بچنا بہت آسان ہے۔ اسی طرح نظر بد بدنگاہی اہل ظاہر کے نزدیک اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہی نہیں اور اب وہ شخص جہنم سے نہیں بچ سکتا اور اہل باطن تدبیر بھی بتاتے ہیں۔ کہ تم عذاب کا خیال کر لو تو یہ مرض جاتا رہے گا۔ سو ایک انداز تو یہ ہے جس کا حاصل یہ ہے۔ ؎

درشتی و نرمی بہم می رسد
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

اس سے امید رہتی ہے۔ غرض ایک انداز تو یہ ہے۔ کہ بالکل مایوس کر دیے جائیں اور ایک وہ کہ جس میں نجات کی تدبیر بھی ہو یہ جائز۔ تو حضور نے بشرا میں یہ بات تبلادی حاصل یہ ہوا کہ ایسی بات کہ جس سے تنگی پیدا ہو مت بتاؤ۔

مصلحین کے باہمی حقوق

خیر یہ تو وہ حقوق ہیں۔ کہ دوسرے کی اصلاح کے وقت جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اب اخیر کا جملہ رہ گیا۔ اس میں یہ تبلادیا۔ کہ مصلحین باہم کیا برتاؤ کریں۔ تو واقعی یہ طبیب کامل کا کام ہے۔ کہ ہر پہلو پر نظر رکھے نہ دوا میں بالکل برودت ہی ہو۔ نہ نرا روغن بادام ہی ہو۔ جیسے آج کل کہ یا اصلاح نہیں کی یا کی تو اس طرح کی۔ کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اصلاح کا قصد کیا تو امارت کی سوجھی۔ کہ ریفارمر بن بیٹھے۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مصلحین سے حسد ہے۔ اب چاہتے ہیں۔ کہ کوئی اور پیر یا مولوی نہ رہے۔ جو کچھ ہوں وہ ہم ہی ہوں۔ صحابہؓ کی یہ حالت تھی۔ کہ ان سے لوگ مسئلہ پوچھتے ہیں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ ان سے پوچھئے وہ زیادہ جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان سے پوچھئے۔ وہ زیادہ جانتے ہیں۔ یہ حالت کیوں تھی۔

ع ولیکن مدتے باگل نشستم

سب صحبت کا اثر تھا اور آج ریفارمر کہلاتے ہیں۔ ان کی یہ شان ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اور مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

چوں گزیدہ می شوی سنگ می شوی
چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

اسی طرح یا تو اصلاح کی فکر ہی نہ تھی یا فکر ہوئی تو دق کرنا شروع خیر ان کو تو جانے دیجئے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ کہ مشائخ کے یہاں مشائخ کی غیبت ہوتی ہے۔ ایک تو غیبت اس لئے کرنا کہ لوگ گمراہی سے بچیں۔ اس میں تو مضائقہ نہیں اور اس کو حقہ پیچوان کے درجہ میں رکھنا یہ بہت برا ہے۔ آج کل معتقدین کی یہ حالت ہے کہ اپنے مشائخ کی مجلس میں یا دوسرے مشائخ کی غیبت کریں گے یا اپنے شیخ کے کمالات کی حکایات گو وہ خلاف واقع ہی ہوں۔ بیان کریں گے۔ کہیں ان کے مکاشفات کی فہرست کہیں کرامات کی تفصیل اگرچہ بیچارے شیخ اپنے کشف کا انکار بھی کریں۔ مگر یہ نہیں مانتے۔

ایک بزرگ سے ذرا فاصلہ پر بیٹھے ہوئے دو معتقد آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کہ فلانی مسجد جو بنی ہے۔ مولانا کو کشف ہوا تھا۔ ان بزرگ نے سن لیا اور فرمایا۔ کہ میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ مجھے کشف نہیں ہوتا تو وہ صاحب دوسرے سے کہتے ہیں بڑے کبو ہوتا ہے۔ لیجئے! شیخ بقسم اپنے کشف کا انکار کرتے ہیں۔ مگر معتقد صاحب نہیں مانتے۔ واقعی ایسے ہی مریدوں نے بعض پیروں کو بگاڑ دیا۔ ایک تو کشف کرامت منسوب کر کے ان کو بد دماغ بنا دیا۔ دوسرے بڑا یا کہ جب شیخ کے پاس آؤ تو اور کچھ نہ سہی تو پھول ہی لے کر آؤ۔ اس سے بد نیت بنا دیا اور اس کے بارہ میں ایک اردو کی آیت بنا لی۔ کہ :۔

"خالی جاوے خالی آوے"

سو سمجھ لو اگر روپے سے خالی جاوے تو کچھ حرج نہیں اور نہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ روپیہ پیسہ سے خالی جاوے تو خالی آوے۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ اگر خلوص و طلب سے خالی جاوے تو خالی آوے۔ تو جناب پیروں کو اس کا انتظام کرنا چاہیئے کہ ہمیشہ ہدیہ نہ لیا کریں۔ کہ جب مرید کا منہ دیکھا خیال پیدا ہوا کہ کچھ ہدیہ لایا ہو گا۔ اس سے یہ ہو گا۔ کہ خدا پر نظر نہ رہے گی مرید پر نظر رہا کرے گی افسوس! پیر تو اس کے دین کو درست کرے اور یہ اس کے صلہ میں پیر کا دین بگاڑتا ہے۔

پھر تو پیر کی وہ حالت ہو جاوے گی۔ کہ ایک مرید نے اپنے پیر سے خواب بیان کیا کہ آپ کی انگلیوں میں شہد بھرا ہوا ہے اور میری انگلیوں میں گوہ۔ پیر بولے تو دنیا دار ہے اور ہم دیندار۔ مرید بولا ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ یہ بھی دیکھا کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں۔ اور آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں۔ خیر یہ خواب ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ نقشہ ہے رسمی پیر اور مرید کے حال کا مطلب یہ تھا۔ کہ مرید پیر سے دین حاصل

عمر فاروق@ون اردو

کر رہا ہے اور پیر مرید سے دنیا حاصل کر رہا ہے۔ تو بھی اپنے پیر کو ایسا ہی بناؤ گے ہمارے حضرت کے یہاں یہ دستور تھا۔ کہ کوئی لاتا تھا اور کوئی لے جاتا تھا۔ ایک امیر نے حضرت کی خدمت میں چھ ہزار روپے پیش کیئے۔ حضرت نے دوسرے حاجت مند کو دے دیئے۔ حضرت یوں بھی روپیہ دو روپئے برابر دیتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے۔ کہ میں بعض آدمی سے جو اس لیئے ہدیہ لے لیتا ہوں کہ یہ شخص حرم کے ثواب سے محروم نہ ہو اللہ اکبر اس میں بھی ہمارے ہی نفع کا خیال۔

ایک شخص نے حضرت کے یہاں ایک ہدیہ پیش کیا۔ دوسرے روز اور پیش کیا۔ تیسرے روز اور پیش کیا حضرت نے مزاحاً فرمایا۔ کہ تھوڑا اس لیئے روزانہ دیتے ہیں۔ تاکہ ہر روز جی خوش ہو۔ اس لطیف عنوان سے ان کی پالیسی پر مطلع فرما دیا۔

غرض جب پیر کے پاس جاؤ تو ہدیہ کی پابندی نہ ہو۔ اس میں دونوں طرف خرابی ہے۔ مرید کے لیئے تو یہ کہ اگر ہدیہ نہ ہو تو چاہے کیسی ہی ضرورت ہو۔ پیر کے پاس نہیں جا سکتے اور پیر کے لیئے یہ کہ پھر توکل نہ رہے گا۔ مرید پہ نظر رہا کرے گی۔

بہرحال حب مال و جاہ کی طلب و حُب غالب ہوتی ہے۔ تو دوسروں کی نفی اور تحقیر و تنقیص کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی کا علاج فرماتے ہیں۔

تطاوعا ولا تختلفا

یہاں بھی اس اصولِ بلاغت کے موافق یا تو تطاوعا ولا تعصیا ہوتا یا اتفقا ولا تختلفا ہوتا۔ مگر اس میں بھی وہی نکتہ ہے۔ کہ بجائے اتفقا کے تطاوعا فرما کر اتفاق کا مبنی بتا دیا۔ کہ وہ تطاوع ہے۔ کہ جب ہر ایک دوسرے کو اپنا مطاع و معظم سمجھے گا اتفاق لازم ہوگا

الحمدللہ! آج حاجی صاحب کے قول کا مبنی بھی معلوم ہو گیا کہ اتفاق تواضع سے ہوتا ہے اور جب اختلاف ہو گا تکبر سے ہو گا۔ پس فرماتے ہیں کہنا مانو یعنی ہر ایک دوسرے کو بڑا سمجھو۔ پھر سبحان اللہ یوں نہیں فرمایا کہ امتثلا بلکہ فرمایا تطاوعا طوع کہتے ہیں خوشی سے کہنا ماننے۔ مطلب یہ کہ خوشی سے کہنا مانو۔ یہ کاشف ہے مولانا محمد یعقوب صاحب کے قول کا کہ لوگ تواضع کو ذریعہ کبر بناتے ہیں کہ ظاہر میں متواضع بنتے ہیں۔ تاکہ لوگ متواضع سمجھیں پس ایسا شخص امتثال تو کرے گا۔ مگر طوع نہ ہو گا۔ پس ایک اتفاق ضابطہ کا اتفاق ہے۔ مگر دل سے نہیں۔ تو تطاوعا سے اس کا امر فرما دیا۔ کہ خوشی سے اتفاق رکھو۔ کہ یہ قلب کا کام ہے۔ پس حضرت کا قول نہایت واضح ہو گیا اور یہ کہ قلب کا کام ہے۔ دلیل اس کی یہ آیت ہے:۔

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ۔ الآیۃ۔

یعنی حق تعالیٰ کی وہ شان ہے۔ کہ قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا۔ آگے فرماتے ہیں:۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ۔

اگر آپ تمام روئے زمین کے خزانے صرف کر دیتے تو الفت نہیں پیدا کر سکتے تھے اے وہ لوگو! جو اتفاق اتفاق پکارتے ہو اتفاق اس طرح نہیں پیدا ہوتا۔ صرف چالیس دن کسی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ تو تمہیں طریقہ معلوم ہو۔ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

اور طریقہ یہ ہو گا۔ کہ تمہارے دل سے جو کہ محل ہے اتفاق کا خناس جو بہ رنگ دین و دنیا ظاہر ہوتا ہے۔ دور ہو کر اس میں خلوص پیدا ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر سوسائٹی اور انجمن مبارک ہو۔ ورنہ ایسی انجمن اور

ایسے ارکان کی یہ مثال ہے۔ ؎

گربہ میر و سگ وزیر موش را دیوان کنند

ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

تو یہ آداب ہیں اصلاح کے سبحان اللہ! اس قدر چھوٹے لفظوں سے اس قدر مضمون مستنبط ہوا۔ میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں بیان کیا ہاں میں نے صرف اتنا کیا کہ مضمون کے چہرہ سے نقاب اُلٹ دی۔ اب معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ یہ مضمون نمکین نہیں ہے۔ ورنہ اس میں لوگوں کو جوش آتا رقت طاری ہوتی اور تلخ بھی نہیں ہاں شیریں ہے اب حق تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ اس شیریں کو ہمارے حق میں گوارا فرمائے اور ہماری ساری تلخیاں دُور کر دے۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالٰی علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

عمر فاروق@ون اردو

الاستقامت

۵ رجادی الاُخریٰ سنہ ۱۳۴۰ھ بعد از نماز جمعہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "استقامت" کے بارے میں یہ بیٹھ کر اڑھائی گھنٹے تک بیان فرمایا۔

سامعین کی تعداد ۲۵ تھی۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

جس قدر دعوت الی اللہ اور اعمال صالحہ اور انشراح باظہار العبدیت میں ترقی ہو گی۔ اسی قدر ان ثمرات میں ترقی ہو گی۔ پھر ان ثمرات عالیہ کے لیئے ترقی کی طلب کیوں نہ ہو؟ ضرور ہونا چاہیئے۔ خصوصاً جب کہ ترقی کے ذرائع بھی میسر ہوں۔ ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست
خم و خمخانہ بامہر و نشاں ست

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

عمر فاروق@ون اردو

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

تمہید

آج کے بیان کی کوئی خاص ضرورت معتدبہ نہیں محض استحسان کے درجہ میں بیان ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بعض مہمان مستورات کی درخواست پر گھر میں وعظ ہوا تھا یہاں کے لوگوں کو (یعنی خانقاہ والوں کو) اس کی اطلاع نہیں ہوئی یا ہوئی۔ مگر وقت پر اطلاع ثانی کے منتظر رہے اور اطلاع وقت پر کی نہیں گئی۔ اس لئے شریک نہ ہو سکے۔

اور میں نے وقت پر قصداً اطلاع نہیں کی کیوں کہ اس سے بعض لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ شرکت کی طلب یا درخواست ہے۔ جس سے بعضے اپنے کاموں کا حرج کر کے شرما شرمائی شریک ہوتے ہیں اور وہ دن بھی تعطیل[1] کا نہ تھا اس لئے اکثر اپنا حرج ہی کر کے آتے۔ ان وجوہ سے میں نے اطلاع نہیں کی پھر مجھے معلوم ہوا کہ ختم وعظ پر جب یہاں خبر ہوئی کہ آج گھر میں وعظ تھا۔ تو سب کو افسوس ہوا۔ تو میں نے خیال کر لیا تھا۔ کہ اس کی تلافی قریب ہی زمانہ میں کسی دن کر دوں گا۔ چنانچہ آج جمعہ تھا۔ تو ارادہ ہوا کہ آج اس قرض کو ادا کروں

اور اس کا مقتضا یہ تھا۔ کہ آج بھی وہی بیان ہوتا جو زنانہ میں ہوا تھا یا اُن ہی آیات کا بیان ہوتا گو مضمون یا عنوان دوسرا ہوتا مگر اس مضمون

---

[1] خانقاہ میں یہ قانون ہو گیا تھا کہ حضرت کا بیان اگر جمعہ کے دن کے علاوہ کسی دن بستی میں یا قرب وجوار میں ہو تو مدرسہ کی تعطیل کر دی جاتی۔ کیونکہ یہاں مدرسہ سے تکمیل درسیات مقصود نہیں۔ بلکہ اصل مقصود اصلاحِ باطن ہے اس کی خانت کے لئے بقدرِ ضرورت تعلیم کا سلسلہ بھی ہے اور یہ مقصود حضرت کے مواعظ میں بوجہ اکمل حاصل ہوتا ہے۔ یہ قانون طلبہ و مدرسین کی درخواست پر ہوا تھا۔ ۱۲ جامع

عمر فاروق @ ون اردو

کا بعینہٖ اعادہ تو اس لیئے نہ کیا۔ کہ وہاں مستورات کا مجمع تھا وہاں ان کے مناسب مضمون اختیار کیا گیا تھا اور عنوان بھی ان کے مناسب تھا۔ مگر اتفاق سے مضمون ایسا بیان ہوا۔ جو مردوں کی بھی ضرورت کا تھا۔ کیوں کہ بجز خاص خاص مسائل کے اکثر مسائل مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں اس لیئے مضمون تو وہی بیان ہوگا۔ مگر عنوان دوسرا ہوگا جو اس مجمع کے مناسب ہوگا۔

اور آیات کا اعادہ اس لیئے نہ کیا۔ کہ اس وقت اسی مضمون کے متعلق دوسری آیات ذہن میں آگئیں جن میں اس مضمون کی تکمیل تھی کیونکہ قرآن کے مضامین ملتے جلتے ہیں چنانچہ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں:۔

كِتَابًا مُّتَشَابِهًا۔

اس لیئے ایک مضمون کے لیئے چند در چند آیتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ پس میں نے پہلی آیات کا اعادہ مناسب نہ سمجھا بلکہ جب اس مجمع کی خصوصیت سے عنوان بدلا گیا تو آیات بھی دوسری اختیار کی گئیں۔

میں نے پہلے یہ بیان کیا تھا۔ کہ نبوت تو ختم ہو چکی ہے مگر ولایت نہیں ختم ہوتی اور ولایت ہر شخص کو اسلام کی برکت سے حاصل ہو سکتی ہے آج میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ استقامت کہ لازم ولایت ہے دشوار نہیں۔ بلکہ سہل ہے اور یہ ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے اور جو لوگ استقامت کو دشوار سمجھتے ہیں اس کا منشا افراط و مبالغہ ہے۔

فضائلِ ایمان

تعیینِ مضمون کے بعد اب تفسیر آیات شروع کرتا ہوں ان آیات میں اصل مقصود فضائلِ ایمان کا بیان ہے۔ مگر اس کے لیئے کچھ شروط ہیں۔ جن میں سے بعض پر نفسِ ایمان موقوف ہے اور بعض پر کمالِ ایمان

موقوف ہے۔ ان شروط کو بھی یہاں پیش کیا گیا ہے۔

ماقبل سے ان آیات کا ربط یہ ہے کہ اس سے پہلے حق تعالیٰ نے کفار کی بدحالی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے یہ آیات ہیں:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ٥ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ٥

ترجمہ:۔ اور یہ کافر (باہم) یوں کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور (اگر پیغمبر سنانے لگیں تو) اس کے بیچ میں غل مچادیا کرو شاید (اس ترکیب سے) تم ہی غالب رہو (اور پیغمبر ہار کر چپ ہو جاویں) سو (اس نالائق حرکت اور ایسے ارادہ کے بدلہ میں) ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھاویں گے اور ان کو ان کے (ایسے) بُرے بُرے کاموں کی سزا دیں گے۔ یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی۔ یعنی دوزخ ان کے لیئے وہاں ہمیشگی کا مقام ہوگا اس بات کے بدلہ میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور (جب مبتلائے عذاب ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھلا دیجئے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہم ان کو اپنے پیروں کے تلے مل ڈالیں تاکہ وہ خوب ذلیل ہوں۔

کفار کی بدحالی بیان فرما کر حق تعالیٰ مسلمانوں کی خوش حالی بیان فرماتے ہیں جس کے ساتھ ایمان کے فضائل اور اخلاقِ جمیلہ کی تعلیم بھی مذکور ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار اور مؤمنین کی حالت ساتھ ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ کبھی اول مؤمنین کی حالت بیان ہوتی ہے تو اس کے

بعد ساتھ ہی کفار کا حال بھی مذکور ہوتا ہے اور کبھی برعکس تاکہ ترغیب و ترہیب دوش بدوش رہیں بعبارتِ دیگر یوں کہیئے تاکہ جمال و جلال کی تجلی ساتھ ساتھ ہوتی رہے۔ اس سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے متعلق میں اپنا ایک امرِ وجدانی عرض کرتا ہوں۔ مجھے چند روز سے یہ بات محسوس ہوتی ہے اور بچپن سے بھی مجھے اس کا احساس تھا۔ مگر اب چند روز سے زیادہ احساس ہے۔ کہ مجھے قرآن کے دو صفحوں پر تر نور سا محسوس ہوتا ہے اور اس کے بعد دو صفحے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے اُن پر سایہ پڑا ہوا ہے مثلاً سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی چند آیات شروع کے دو صفحوں پر ہیں۔ مجھے یہ زیادہ روشن محسوس ہوتی ہیں اور اس کے بعد کے دو صفحے ایسے ہیں کہ گویا اُن پر ظل پڑا ہوا ہے اسی طرح سارے قرآن میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

چند روز سے مجھے اس کی علت یہ ذہن میں آئی۔ کہ یہ جمال و جلال کی صورت منکشف ہوتی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں ترغیب و ترہیب ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ تو جہاں ترغیب ہے وہاں تجلی جمالی ہے۔ جو زیادہ واضح ہے اور جہاں ترہیب ہے وہاں تجلی جلالی ہے۔ جو کسی قدر مستور حجاب لیئے ہوئے ہے۔ خواہ کوئی اسے میرا وہم سمجھے۔ مگر میرے خیال میں یہی آیا ہے۔ واللہ اعلم۔

چنانچہ اس مقام پر پہلے جلال کا ذکر ہے اب اہلِ جمال کا ذکر ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے۔ اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہوتے آتے ہیں کہ ڈرو مت اور اس جنّت کے ساتھ خوش رہو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

مُبالغہ فی التقویٰ

اب سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہاں استقامت سے کیا مُراد ہے۔ بعض لوگ اس کی تفسیر میں غلطی کرتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہمارے اندر دو مرض ہیں۔ افراط تفریط۔ اہل تفریط نے استقامت کی تفسیر میں بھی تفریط کی ہے اور اہل افراط نے اس کی تفسیر میں غلو کیا ہے۔ پس ہم کو اپنے اندر اعتدال پیدا کر کے اپنی اصلاح کرنا چاہیئے۔ ہر چند کہ افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔ مگر افراط زیادہ مذموم ہے۔ کیونکہ اہل تفریط تو اپنی کوتاہی کو اکثر سمجھتے بھی ہیں۔ گو سستی ہی کی وجہ سے کوتاہی کریں اور ان کو اپنی غلطی پر بھی تنبہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے علم و عمل کو ناقص سمجھتے ہیں مگر اہل افراط اپنے افراط کی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ افراط کو محمود اور کمال تقوٰے سمجھے ہوئے ہیں اور چونکہ اکثر افراط اعتقادی میں زیادہ مبتلا ہیں اسی لیئے بعض لوگ استقامت کا نام سُن کر یہ سمجھے ہوں گے کہ استقامت کوئی بڑی دشوار چیز ہے جس کی وجہ وہی ہے۔ کہ بہت لوگ تقوٰے میں مبالغہ کرتے ہیں اور وہ اسی کو استقامت سمجھتے ہیں اور اس کو محمود سمجھتے ہیں اور بظاہر یہ محمود معلوم بھی ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں محمود نہیں۔ کیوں کہ مبالغہ کی وجہ سے کسی وقت یہ شخص مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک تقوٰے کا جو اعلیٰ درجہ ہے۔ اس کی تحصیل دُشوار ہے اور ادنیٰ درجہ کو یہ ناکافی سمجھتا ہے۔ اس لیئے اخیر میں اس کو مایُوسی ہو جاتی ہے۔ جس کا انجام تعطل ہے۔

مثلاً بعض واعظوں سے لوگوں نے تقوٰے کے قصے سُنے ہوں گے اور ہم نے بھی بچپن میں ایسے قصے دیکھے ہیں۔ جیسے ایک شخص

کا قصہ ہے۔ کہ وہ طعام حلال کی تلاش میں کسی بزرگ کے پاس آیا اور کہا میں آپ کے پاس طعام حلال کی طلب میں آیا ہوں۔ یہ سُن کر وہ رونے لگے اور فرمایا کہ ہاں اب تک تو میرا کسب حلال تھا مگر اب نہیں رہا کیونکہ ایک دن میرے بیل دوسرے شخص کے کھیت میں چلے گئے تھے۔ اس کی مٹی بیلوں کے پیر کو لگ گئی اور میرے کھیت میں مل گئی۔ اب مجھے شبہ ہو گیا ہے ایسے قصے سُن کر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ بس تقوے نے بہت دُشوار ہے۔ حالانکہ یہ قصہ شریعت کے بھی بالکل خلاف ہے اور عقل کے بھی۔

عقل کے خلاف تو اس لیئے کہ بیلوں کے پیر کو جو مٹی لگ جاتی ہے وہ تھوڑی سی دُور چلنے سے جھڑ جاتی ہے۔ تو کیا یہ ضرور ہے کہ دوسرے کے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں مل گئی ہو۔ پھر اگر دوسرے کے کھیت کی مٹی ان کے کھیت میں مل گئی ہو تو ایسے ہی ان کے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں جا ملی ہو گی تو برابر سرابر معاملہ ہو گیا پھر اگر اتنی مٹی سے شبہ ہو جایا کرے تو چاہیئے کہ جانوروں کو ہر وقت بند رکھا جائے، کہیں چلنے پھرنے نہ دیا جائے حالانکہ جانور بند نہیں رہ سکتے۔

اور شریعت کے خلاف اس لیئے ہے کہ علمائے شریعت نے ایسے مبالغہ کو قابلِ تعزیر سمجھا ہے۔ مثلاً کوئی شخص ایک دانہ گندم کی تعریف و تشہیر کرتا پھرے۔ کہ یہ دانہ کس کا ہے۔ تو فقہاء کہتے ہیں کہ اسے یعنی اس شخص کو سزائے تعزیری جائے کیونکہ شریعت نے اس قلیل مقدار کو قابلِ تعریف اور داخلہ لقطہ نہیں بنایا۔ کیوں کہ یہ مال نہیں۔

اور حدیث میں جو حضورؐ کا ارشاد آتا ہے کہ بعض دفعہ راستہ میں مجھے ایک چھوارہ پڑا ہوا ملتا ہے۔ تو میں اس کو کھانا چاہتا ہوں۔ مگر اس خیال سے نہیں کھاتا۔ کہ مبادا صدقہ کا ہو کیونکہ صدقہ آپؐ کے

لیے حرام تھا، جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قلیل بھی مال ہے۔
سو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چھوارہ عادۃً منتفع بہ ہے۔ اس لیے وہ مال ہے اور ایک دانہ گندم منتفع بہ نہیں۔ اس لیے وہ مال نہیں۔ غرض شریعت نے ایسی قلیل مقدار کو لقطہ نہیں بنایا اور یہ شخص اس کو لقطہ بناتا ہے۔ گویا یہ اپنی طرف سے نئی شریعت ایجاد کرتا ہے اسی طرح اگر بیل کے پیر کو مٹی لگ جائے تو وہ کوئی قیمتی چیز نہیں چنانچہ اتنی مٹی کی بیع جائز نہیں اور جب قیمتی نہیں تو اس کا ضمان بھی نہیں۔ پھر اس کے کھیت میں ملنے سے شبہ کیوں ہو گیا اور اگر بالفرض ضمان بھی لازم ہوتا۔ تو اس کا ضمان ادا کر دینا کافی تھا۔ تم نے اپنے کھیت میں سے اتنی ہی مٹی دوسرے کے کھیت میں ڈال دی ہوتی۔ اس سے کھیت کا غلہ اور پیداوار کیوں حرام ہو گیا۔ پس یا تو یہ قصہ موضوع ہے۔ یا یہ لوگ اہل حال ہیں۔ جو معذور ہیں یا وہ شریعت سے ناواقف ہوں گے اس لیے ایسے اقوال حجت نہیں اور واعظوں کو ایسے قصے بیان کرنا جائز نہیں۔ اس قسم کے قصوں سے لوگ یہ سمجھ گئے۔ کہ تقویٰ بہت دشوار ہے اور جب تقویٰ اور استقامت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ حلال خالص مل نہیں سکتا تو۔ ؎

چوں آب از سر گذشت
چہ یک نیزہ چہ یک دست

جب حرام کھانے سے مفر نہیں۔ تو تھوڑا کھایا تب کیا بہت کھایا تب کیا۔ بس اب بے احتیاطی شروع ہو گئی۔ اول ایک بے احتیاطی ہوئی پھر دوسری، پھر تیسری پہلے تو شبہات سے بچنے کا اہتمام تھا اب حرام صریح سے بھی باک نہیں یہ انجام ہے مبالغہ اور غلو کا۔

حدودِ تقویٰ

اسی لیئے شریعت نے غلو سے منع کیا ہے قرآن میں بھی امر ہے
لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ۔
(یعنی اپنے دین میں غلو نہ کرو) اور احادیث میں بھی اس کی سخت ممانعت ہے۔

من شاق شاق اللہ علیہ۔

کیوں کہ اس میں حدود سے تجاوز ہے اور حدود سے تجاوز کرنا طاعت نہیں بلکہ معصیت ہے۔ صاحبو! شریعت نے ہر چیز کے حدود مقرر کیئے ہیں۔ نماز کیسی اچھی چیز ہے۔ مگر اس کے لیئے بھی حدود ہیں۔ کہ طلوع و غروب کے وقت نماز حرام ہے۔ مثلاً پھر تقوے اور استقامت کے لیئے حدود کیوں نہ ہوں گے۔ یقیناً اس کے لیئے بھی ایک حد ہے۔ اس سے آگے جو تقوے ہو، وہ ممنوع ہے۔ اسی واسطے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

زہد و ورع کوش و صدق و صفا
ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

یعنی ایسا تقوے نہ کرو۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ جائے۔ یعنی ایسا غلو نہ کرو کہ ایسا تقوے کرنے لگو۔ کہ حضورؐ نے بھی ویسا تقوے نہ کیا ہو۔

حدیث میں حضور کا دستور العمل تو یہ آیا ہے۔

ما خُیِّرَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما۔

کہ حضورؐ کو اگر ایک امر میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا تھا تو

آپ سہل کو اختیار فرماتے تھے۔ یعنی طرق مقاصد میں مشقت کو اختیار نہ فرماتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر مشقت ڈالنا مطلقاً محمود نہیں مگر بعض لوگ نفس پر مصیبت ڈالتے ہی کو مقصود و محمود سمجھتے ہیں یعنی وہ صورت اشد کو ہی مطلقاً افضل سمجھتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب اسی خیال کے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جس عمل میں مشقت ہو وہی افضل ہے۔ میں نے کہا یہ مطلقاً نہیں بلکہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہے اور پھر اس کے بھی حدود ہیں اور وسائل میں تو سہل صورت مطلقاً افضل ہے وہ نہ مانتے تھے میں نے کہا بہت اچھا۔ پھر وضو کے لیے پانی لانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تھانہ بھون کے کنویں سے لایا جاوے دوسرے یہ کہ جلال آباد و لوہاری سے لایا جاوے۔ تو آپ یہاں سے پانی لے کر وضو نہ کریں بلکہ جلال آباد یا لوہاری سے لائیں۔ کیونکہ اس میں مشقت ہے اور مشقت کا کام افضل ہے۔ اس مثال کے بعد انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ پس یاد رکھو۔ کہ مشقت میں مطلقاً اجر نہیں۔

بعض صحابہؓ نے ایک دفعہ اعمال شاقہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ایک نے کہا میں رات بھر نہ سویا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں نکاح نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں عمر بھر گوشت نہ کھاؤں گا اور ان سب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز معتدل سن کر یہ بھی کہا کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی مشقت برداشت نہیں فرماتے مگر آپ کا مرتبہ بڑا ہے۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہم کو ضرورت ہے۔ اسی طرح ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی رخصت پر عمل کیا۔ تو بعض صحابہؓ نے اس سے تنزہ کیا اور یہ سمجھا کہ حضورؐ کو عزائم پر عمل کرتے

کی ضرورت نہیں آپ تو کمال کو پہنچ چکے ہیں مگر ہم کو عزیمت ہی پر عمل کرنا چاہیئے۔ رخصتوں سے احتیاط کرنا چاہیئے حضورؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو سخت ناگواری ہوئی فرمایا:۔

مابال اقوام یتنزھون مما اصنع وانا اخشاکم للہ و اتقاکم للہ۔

لوگوں کا کیا حال ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں۔ وہ اس سے احتیاط کرتے ہیں۔ حالانکہ میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور سب سے بڑھ کر متقی ہوں۔ غرض ہر چیز کے لیئے حدود مقرر ہیں۔ جن سے آگے بڑھنا جائز نہیں۔ وسائط ہیں تو حدود کیوں نہ ہوں گے جب کہ مقاصد میں بھی حدود ہیں۔ مقاصد ظاہری و موقت جیسے نماز و روزہ ہیں تو سب کو معلوم ہے۔ مقاصد باطنی و مستمرہ جیسے شوق و خوف ہیں کہ مقصود ہیں اور جیسے ذکر لسانی ہیں کہ مقصود مستمر ہے۔ ان میں بھی تحدید ہے۔ مثلاً ذکر لسانی ہے کہ غلبہ نعاس کے وقت اس میں سکوت مامور بہ ہے۔

افراط کی خرابی

اور مثلاً شوق و خوف یہ مقاصد باطنہ میں سے ہیں۔ مگر احادیث سے غور کے بعد ان کے لیئے بھی حدود معلوم ہوتے ہیں الحمدللہ حق تعالیٰ نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے۔

چنانچہ حدیث کے ایک جملہ سے میں نے خوف کی حد سمجھی ہے اور ایک سے شوق کی حدیث میں آتا ہے:۔

اللھم انی اسئلك من خشیتك ما تحول به بینی و بین معاصیتك۔

آپ دعا میں فرماتے ہیں۔ کہ اے اللہ میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں۔ کہ جو میرے اور میرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے۔ اس میں حضورؐ نے خوف کے لیئے ایک حد بیان فرمائی ہے اور اسی حد کے موافق حصول خوف کی دعا ہے۔ حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ جب خوف مقصود ہے تو جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ مگر غور کرنے سے اس قید کا نفع یہ معلوم ہوا کہ اگر خوف حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ تو تعطل کا سبب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو رحمتِ الٰہی سے مایوسی ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ناشکری تو ابتداء ہی میں ہونے لگتی ہے۔ جس شخص پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے وہ اپنے اعمال کو حقیر اور لاشئے سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔ اجی ایں کیا نمازی ہوتا میری تو نماز اور عدم نماز برابر ہے۔

بس وہ ایسی تواضع کرنے لگتا ہے۔ جیسی ہم نے سفر الہ آباد سے کانپور آتے ہوئے چند جنٹلمینوں کی تواضع دیکھی تھی ریل میں میرا اور ان کا ساتھ ہو گیا۔ بڑے ہی چھچھورے اور بھکڑ تھے۔ بعضوں کی تہذیب محض ظاہری ہی ہوتی ہے۔ ان سب نے مل کر ایک ناآشنا منصف کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا اس کو بنانا شروع کیا۔ ایک نے دسترخوان بچھایا اور کہا آیئے منصف صاحب آپ بھی کچھ گوہ موت کھا لیجئے۔ دوسرے نے کہا توبہ کرو توبہ۔ کھانے کی بے ادبی کرتے ہو۔ کہنے لگا اس میں کھانے کی بے ادبی نہیں۔ بلکہ اپنی تحقیر ہے۔ اپنے کھانے کو کھانا کہنا تکبر ہے۔ اپنی نسبت سے اس کو گوہ موت ہی کہنا چاہیئے۔ مگر غنیمت ہے میرے حال پر انہوں نے عنایت رکھی۔

ایک صاحب جو مجھ کو اسٹیشن پر پہنچانے آئے تھے۔ اُن کو دھمکا گئے تھے۔ اس لیئے مجھے تو کسی بات میں مخاطب نہیں کیا۔ اسی طرح

زیادہ خوف والے اپنے اعمال کی بے قدری کرتے ہیں اور تواضع میں اپنی نماز روزہ کو بے کار و فضول کہتے ہیں۔ جیسے ان لوگوں نے تواضعاً کھانے کو گوہ موت کہا تھا۔ اے صاحب اگر نماز کی آپ کو اتنی توفیق بھی نہ ہوتی۔ جو اَب ہو رہی ہے تو بتلایئے کہاں جا کر سر ٹیکتے۔

ع بلا بودے اگر اینہم نبودے۔

صاحبو! اعمال کی بے قدری بُری بلا ہے۔ اعمال فی نفسہ سب محمود و مقبول ہیں۔ ہاں ہماری حیثیت سے وہ کچھ بھی نہیں مگر نعمت الٰہی ہونے کے اعتبار سے بڑی چیز ہیں۔ پھر اس بے قدری کا انجام یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص جب اپنے اعمال کو مغفرت کے لیئے ناکافی سمجھتا ہے تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے یہی تعطّل ہے۔

اسی طرح شوق میں حضورؐ نے حدود بیان فرمائی ہیں۔

اللھم انی اسئلك شوقا الی لقائك فی غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة۔

اس میں دو قیدیں ہیں کہ اے اللہ مجھے ایسا شوق عطا ہو۔ جس میں ضراء مضرہ نہ ہو (یعنی ضرر ظاہری) اور فتنہ مضلہ نہ ہو (یعنی ضرر باطنی) کیونکہ غلبۂ شوق میں کبھی جسم کو بھی ضرر پہنچ جاتا ہے۔ کہ شوق میں بے چین ہو کر گھلنے لگتا ہے اور باطنی ضرر بھی ہو جاتا ہے۔ کہ بعض لوگ حدادب سے نکل جاتے ہیں جیسے غلبۂ شوق میں بعض عشاق محبوب کے پیروں میں گر پڑتے ہیں اور اس کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں۔ بعضے زبردستی اس کا ہاتھ کھینچ کر چومتے ہیں۔ بعض دفعہ باوجود کسی قابل نہ ہونے کے چند حالات و کیفیات عطا ہونے سے اپنے کو کامل سمجھنے لگتے ہیں۔

اہل اللہ ان واقعات کو جانتے ہیں۔ پھر حدود سے آگے نکلنے پر ان سے مواخذہ ہوتا ہے۔ اس وقت سمجھ جاتے ہیں۔ کہ یہ ہماری فلاں

حرکت کی سزا ہے چنانچہ ایک بزرگ نے دعا کی کہ اے اللہ میں تو دو روٹیاں اس وقت اور دو روٹیاں اُس وقت مانگتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا بس اُن پر یہ بلا نازل ہوئی کہ چوروں کے ساتھ شبہ میں پکڑے گئے اور جیل خانہ میں دونوں وقت دو دو روٹیاں ملنے لگیں بہت پریشان تھے کہ کس گناہ میں پکڑا گیا۔ الہام ہوا کہ تم نے دو روٹیاں مانگی تھیں عافیت کی قید نہیں لگائی تھی یہ اس کی سزا ہے اب توبہ کی اور عافیت کی دعا کی فوراً حاکم اعلیٰ کا حکم جیلر کے نام پہنچا کہ فلاں شخص غلطی سے پکڑے گئے۔ فی الفور رہا کر دیئے جاویں۔ تب چھوٹے۔ بعض دفعہ تو قیود نہ لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے۔ جب وہ ضروری ہوں اور بعض دفعہ قیود لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے۔ جب وہ فضول ہوں۔

چنانچہ ایک صحابی زادے نے اس طرح دعا کی تھی:۔

اللھمّ انی اسئلک القصر الابیض عن یمین الجنۃ۔

(اے اللہ! میں سفید محل مانگتا ہوں جو جنت کی دائیں طرف ہو) اُن کے والد صاحب نے جو صحابی تھے فرمایا:۔

یا بنی سل اللہ الجنۃ ولا تعتد فی الدعا فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یحب المعتدین فی الدعا۔

صاحبزادے اللہ سے جنت مانگو اور دعا میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعاء میں حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔ تو دعا کے لیے بھی ایک حد ہے۔ شوق کے لئے ایک حد ہے

حدِ استقامت

اسی طرح استقامت کے لئے بھی ایک حد ہے۔ مگر بعض لوگ یوں

عمر فاروق@ون اردو

سمجھتے ہیں۔ کہ اعلیٰ درجہ کی استقامت ہونا چاہیئے ادنیٰ درجہ کی استقامت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نماز میں تطویل کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بھی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔ جس سے لوگ دیر تک دھوپ میں جلتے تھے۔ ان کے نزدیک استقامت کا یہی درجہ مطلوب تھا۔ کہ نماز میں خوب تطویل ہو اور اس میں غلو یہ کیا کہ جماعت میں بھی تطویل کرنے لگے۔ حالانکہ امام کو تخفیف کا امر ہے ایک شخص نے ان سے کہا کہ ایسی لمبی نماز سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے نماز مختصر پڑھانی چاہیئے تو آپ کیا فرماتے ہیں۔ کہ تم لوگ دھوپ سے ہی گھبرا گئے تو جہنم میں کیسے رہو گے سبحان اللہ! آپ مسلمانوں کو جہنم کی گرمی سہنے کی مشق کراتے تھے۔

ایسے ہی ایک صاحب سجدہ میں اکیس بار سبحان ربی الاعلیٰ کہتے تھے۔ تو جو شخص ایسی نماز کو استقامت سمجھے گا۔ وہ اس سے کم کو نماز ہی نہ سمجھے گا اس کا انجام یہ ہوگا۔ کہ اس کے پیچھے ایک دفعہ کوئی نماز پڑھ لے گا۔ تو پھر ہمیشہ کو چھوڑ دے گا اور خود اس شخص کو بھی اگر کسی وقت اس قدر اطمینان سے نماز پڑھنے کا موقعہ نہ ملے مثلاً ریل میں اتنا اطمینان میسر نہیں ہوتا۔ تو اس حالت میں یہ نماز ہی کو چھوڑ دے گا۔ یہ خرابی ہے افراط و غلو کی اور جو شخص غلو نہ کرے گا وہ ہر وقت جیسا موقعہ ہوگا ویسی ہی حسب رخصت شرعیہ نماز پڑھے گا۔ اس سے مقتدیوں کو بھی تکلیف نہ ہوگی اور خود یہ بھی عمل پر دوام کر سکے گا اور بڑی استقامت استدامت ہی ہے کہ عمل پر دوام ہو اور یہ مبالغہ سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ دوام ہمیشہ اعتدال سے حاصل ہوتا ہے۔

درجات استقامت

اب سمجھئے کہ استقامت کے چند درجے ہیں ایک اعلیٰ ایک

ادنیٰ ایک متوسط۔ اور یہ قاعدہ عقلیہ مسلم ہے۔

لا تشکیک فی الماہیات۔

حقائق و ماہیات میں تشکیک نہیں ہوتی۔ بلکہ تشکیک محض افراد میں ہوتی ہے پس ہر درجہ میں حقیقت استقامت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور جب استقامت ہر درجہ میں حاصل ہے۔ تو اس کی فضیلت بھی ہر درجہ میں حاصل ہے۔ جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں وہ اس کو اعلیٰ درجہ میں منحصر کرتے ہیں مگر یہ رحمتِ الٰہی کو تنگ کرنا ہے حالانکہ خدائے تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد دعا کی۔ ہ

اللھم ارحمنی ومحمدًا

ولا تشرك فی رحمتنا احدا

یعنی اے اللہ! مجھ پر رحم کیجئے اور حضور صلی اللہ علیہ پر اور ہمارے ساتھ رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کیجئے حضورؐ نے سن کر فرمایا۔

لقد تحجرت واسعًا۔

تو نے وسیع شے کو تنگ کر دیا۔ وہ بے بیچارہ یہ سمجھا ہو گا کہ سب پر رحمت ہوئی تو بٹتے بٹتے کم رہ جاوے گی۔

باقی حضورؐ کو بھی اس نے خاطر کی وجہ سے شریک کر لیا ہو گا کہ آپ کی برکت سے تو ایمان ہی نصیب ہوا آپ کو تو شریک کر لینا چاہیئے۔ باقی اور سب کی صاف نفی کر دی۔

مگر ان گاؤں والوں کی بے ادبی معاف ہے۔ کیوں کہ وہ جاہل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بدوی نے سورۂ والتین والزیتون سُنی تھی۔ اس کو خیال ہوا کہ حق تعالیٰ نے انجیر و زیتون کی قسم کھائی ہے۔ تو یہ ضرور مزے دار ہوں گے کھانا چاہیئے۔ چنانچہ اول انجیر خریدا تو مزے دار تھا کہنے لگا۔

صدقت ربنا۔ اے اللہ آپ نے سچ کہا پھر زیتون خریدا اور اُسے بھی کھالیا وہ کھٹا کھٹا تھا۔ تو کہنے لگا۔ واہ اللہ میاں (نعوذ باللہ) چکھنے سے پہلے ہی قسم کھالی یہ تو خدا تعالیٰ کے ساتھ برتاؤ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ برتاؤ تھا۔ کہ ایک دفعہ بہت سے اعرابی آپ کے سر ہو گئے۔ کہ ہم کو کچھ مال دلوایئے آپ نے وعدہ فرمایا کہا نہیں ابھی دلوایئے اور یہ کہہ کر آپ کی چادر زور سے کھینچ لی جس سے گردن مبارک پر نشان ہو گیا مگر آپ نے کسی کو کچھ نہیں دھمکایا۔ پس ہنس کر یہ فرمایا۔

ردائی ـــــ ردائی۔

ارے بھائی میری چادر تو دے دو۔

ہمارے مولانا فتح محمد صاحب کے پاس ایک ولائتی طالب علم پڑھتا تھا ایک مرتبہ کسی بات سبق میں آپ کو غصہ آگیا۔ تو مولانا سے کہتا ہے کہ تم کافر ہو۔ مولانا نے فرمایا کہ پھر کافر سے پڑھنے کیوں آئے۔ کہا کافر سے فن سیکھنا جائز ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں معافی چاہنے آیا اور کہا مولوی صاحب ہماری بات کا برا نہ ماننا تم ہمارا معشوق ہے ہم تمہارا عاشق ہے اور عاشق معشوق کو کہہ ہی لیا کرتا ہے۔ تو ایک محبت ولائتی بھی ہوتی ہے۔ جس میں گستاخی بھی جائز ہے۔

غرض جس طرح اس اعرابی نے رحمت کو تنگ کر دیا تھا۔ اسی طرح جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں وہ بھی رحمت کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت بس انہی کے واسطے ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ استقامت کا ہر درجہ استقامت ہے اور ہر درجہ کے لئے فضیلت ثابت ہے پس استقامت کے سیدھے سادے معنے وہ ہیں۔ جو اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں آیت یہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔

اور تفسیر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے یوں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے (یعنی مرتد نہیں ہوئے) البتہ قالوا۔ میں ایک قید بے شک ضروری ہے۔ یعنی قالوا بقلوبھم کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی ربوبیت و توحید کا اقرار دل سے کیا ہو۔ پس قواعدِ شرعیہ سے یہ قید ضروری ہے۔ کیونکہ بدون تصدیق بالقلب کے ایمان معتبر نہیں۔ پھر حق تعالیٰ کے اعتبار سے تو قلب کا ایمان کافی ہے مگر اجراء احکام کے لئے زبان سے کہنا بھی شرط ہے۔ جس میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ایمان کا علم ہو تو وہ اس کو اپنا آدمی سمجھیں۔ اس کے حقوق ادا کریں اور کفار اس سے الگ رہیں۔ اس کو اپنے اندر ملانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ تو ظاہری قواعد سے حکمت معلوم ہوتی ہے۔ اور قواعدِ باطن سے اس میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے۔ کہ جیسے باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے۔ اسی طرح ظاہر کا بھی اثر باطن پر ہوتا ہے۔ چنانچہ بچوں کے حفظِ قرآن کا طریقہ تکرار باللسان ہے۔ زبان سے جب لفظ کو بار بار کہا جاتا ہے۔ وہ دل میں جم جاتا ہے۔ اسی طرح ذکر باللسان کو زیادت اثر فی الباطن میں دخل ہے۔ پس ان الذین قالوا ربنا اللہ کے معنے یہ ہیں۔ الذین امنوا بالقلب وصدقوا باللسان۔ جنہوں نے دل سے خدا کو مانا اور زبان سے تصدیق کی اور ثم استقاموا کے معنی یہ ہیں کہ اقاموا علیہ ولم یرتدوا پھر اس پر جمے رہے اور مرتد نہیں ہوئے جزو اول قالوا ربنا اللہ میں احداث ایمان ہے اور جزو دوم ثم استقاموا میں ابقاء ایمان ہے۔ یہ معنے ہیں استقامت کے سیدھے سادے آگے اس پر تفریع ہے:۔

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔

کہ ان پر فرشتے اترتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں۔ کہ

آخرت کے احوال سے محروم ست اور دنیا کے فوت ہونے کا غم نہ کرو الخ یہ فضیلت ہر مومن کو جو مرتد نہیں ہوا حاصل ہو گی۔ کیوں کہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے اور یہاں جس فضیلت کا ذکر ہے۔ وہ مطلق استقامت پر متفرع ہے خواہ کسی درجہ کی استقامت ہو۔ مگر نہ معلوم ان واعظوں نے کہاں سے مخلوق کا گلا گھونٹ دیا اور استقامت کو اعلیٰ درجہ میں کس دلیل سے منحصر کر دیا۔ پس یہ تنہا ہی جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ اکیلے ہی قلانچیں مارتے پھریں گے۔ مگر جب یہ دوسروں کو محروم کرنا چاہتے ہیں تو خود بھی نہ جائیں گے۔ کیونکہ جب لوگوں کو کمال تقوےٰ سے قاصر ہونے کی وجہ سے یہ جنت سے محروم سمجھتے ہیں۔ تو اس کے مواخذہ میں بھی اول مستحق کیسے ہو جاویں گے۔

استقامت آسان ہے

بعض لوگوں کو بعض نصوص سے اس کا شبہ ہو گیا ہے کہ استقامت دشوار چیز ہے۔ چنانچہ بعض نے فَاسْتَقِمْ کَمَا أُمِرْتَ سے کَمَا أُمِرْتَ کی قید دیکھ کر یہ سمجھا ہے۔ کہ استقامت کوئی بڑی چیز ہے۔ جب ہی تو اس کو کما امرت کے ساتھ مقید کیا گیا ورنہ اس قید کی کیا ضرورت تھی اور یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ آگے وَمَنْ تَابَ مَعَكَ بھی ہے۔ جس سے مطلب یہ ہوا۔

استقم کما امرت ولیستقم من تاب معک کما امروا۔

کہ جس طرح کا آپ کو امر ہے۔ اس طرح آپ مستقیم رہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ جیسے ان کو امر ہوا ہے اس طرح وہ مستقیم رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب کو امر الٰہی کے موافق استقامت حاصل کرنے کا حکم ہے اس سے کم درجہ کافی نہیں۔

تو سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ لوگ قرآن کے سیاق و سباق میں غور نہیں کرتے۔ اس لیئے شبہ میں پڑ گئے اگر ماسبق و مالحق کو ملا کر اس آیت کو دیکھتے تو اشکال نہ ہوتا اصل بات یہ ہے۔ کہ یہاں اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اوپر یہ آیت ہے:۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝ وَإِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی سو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات نہ ہوتی۔ جو آپ کے رب کی طرف سے ٹھہر چکی ہے تو ان کا فیصلہ (ابھی) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ اس (فیصلہ) کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے اور بالیقین سب کے سب ایسے ہی ہیں۔ کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دے گا۔ بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے:۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ۔

جس سے ظاہر و متبادر یہ ہے۔ کہ اس آیت سے حضورؐ کا تسلیہ مقصود ہے۔ گو تسلیہ صریح نہ ہو۔ مگر اس میں تسلیہ کا مضمون ضرور ہے۔ کیونکہ ایسا مضمون تسلیہ صریحہ میں بھی مذکور ہے حق تعالیٰ کی عادت ہے۔ کہ کفار کی حالت بیان فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تسلی اس طرح کرتے ہیں کہ سب کو اپنے اپنے کام میں لگنے کا حکم فرماتے ہیں۔ کہ تم اپنے کام میں لگے رہو کفار کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نپٹ لیں گے چنانچہ یہی مضمون یہاں بھی ہے کہ اول کفار کا حال بیان فرمایا۔ کہ یہ لوگ پہلے انبیاء سے بھی اختلاف کر چکے ہیں۔ آپ کے ساتھ کفار کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں اور

ہم ان کو ابھی سزا دیتے۔ مگر ہماری طرف سے ایک بات ٹھہر چکی ہے اس لیئے دُنیا میں فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ باقی وقت معلوم پر سب کو اپنے اپنے کیئے کا بدلہ ملے گا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں - فاستقم کما امرت۔

یعنی جب اُن کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ تو آپ اور مسلمان کفار کی فکر میں نہ پڑیں بلکہ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ کر آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں۔ جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو حکم ہے۔

یہ حاصل ہے آیت کا۔ بھلا اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ استقامت کوئی ایسی دشوار چیز ہے جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو حدیث استقیموا ولن تحصوا سے شبہ ہوا ہے۔ جس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مستقیم رہو مگر تم سے احصانہ ہو سکے گا اور کہتے ہیں کہ دیکھو اس میں حضورؐ نے تبلادیا کہ استقامت پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتی اس کا احصا دشوار ہے مگر یہ مطلب بیان کرنے والا بعینہٖ اس کا مصداق ہے کہ:۔

حفظت شیئاً وغابت عنك اشیاء۔

صاحب! اگر ولن تحصوا کا متعلق وہی استقامت ہے جس کا امر کیا گیا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ حضورؐ ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں جو کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ تو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کے صریح خلاف ہے۔ کہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ استقامت حاصل کرو اور یہ بھی فرما رہے ہیں۔ کہ تم سے ہو نہ سکے گی۔ تو پھر جو کام ہو ہی نہیں سکتا اس کا امر ہی کس واسطے کیا گیا اس لیئے یہ مطلب غلط ہے۔

میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ:۔

استقیموا ما استطعتم ولا تتعمقوا فیہا فانکم لن تحصوھا ولا یشاد الدین احد الا غلبہ۔

یعنی جتنی استقامت تم سے ہو سکے حاصل کرو یہ تو مامور بہ ہے۔ باقی اس میں تعمق و مبالغہ نہ کرو کیوں کہ یہ مامور بہ نہیں اور تعمق و مبالغہ سے جس اعلیٰ درجے کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ تم سے نہ ہو سکے گا۔ اور یہ تو ان لوگوں کے خلاف ہے۔ کیوں کہ وہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کو مامور بہ کہتے ہیں۔

اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ درجہ جس میں تعمق و مبالغہ ہو مامور بہ نہیں ہے۔ باقی جو مطلب حدیث کا یہ لوگ سمجھے ہیں۔ وہ تو نص کے خلاف ہے۔ حق تعالیٰ نے وسعت سے زیادہ کہیں امر نہیں کیا اور ہر موقعہ پر جہاں اس قسم کا شبہ واقع ہوا۔ فوراً اشکال رفع کیا ہے۔ چنانچہ جب اتقوا اللہ حق تقاتہ (ترجمہ) اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے تو صحابہؓ کو اشکال ہوا کہ یہ کس سے ہو سکے گا اور ایسا تقوےٰ جو حق الوہیت کے شایان ہو کون کر سکتا ہے؛ تو اس پر فوراً یہ آیۃ نازل ہوئی۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا۔

یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا تم سے ہو سکے۔

بعض صحابہؓ نے اس کو پہلی آیت کے لیئے ناسخ فرمایا ہے۔ مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے تصریح کی ہے اور خوب ہی فرمایا ہے۔ کہ نسخ اصطلاح سلف میں بیان تغیر و بیان تبدیل دونوں کو عام ہے۔ پس بعض صحابہؓ کا اس کو پہلی ہی آیت کے لیئے ناسخ فرمانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس سے پہلی آیت کی تفسیر ہو گئی اور بتلا دیا گیا کہ حق تقاتہ سے مراد وہ تقوےٰ ہے۔ جو تمہاری استطاعت میں ہو۔ جتنا تقوےٰ تم سے ہو سکے وہ حق تقاتہ ہی میں داخل ہے۔ بحمد اللہ اشکالات سب رفع ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ یہاں جو فضائل اور بشارتیں استقامت پر متفرع ہیں

وہ ہر مسلمان کو حاصل ہوں گی؛ کیوں کہ استقامت کا ایک درجہ ہر مومن کو حاصل ہے۔

مگر اس پر اب شاید یہ اشکال ہو۔ کہ اگر اس آیت میں استقامت کے یہی معنی ہیں کہ بس ایمان حاصل ہوا اور ایمان کے بعد مرتد نہ ہو۔ تو آگے اس استقامت کے بہت سے فضائل مذکور ہیں۔ کہ ان اہل استقامت پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ بشارت سناتے ہیں خوف وحزن کو رفع کرتے ہیں فرشتے ان کے رفیق ہوتے ہیں۔ اس میں صالح اور فاسق سب برابر ہو جائیں گے اور اگر فاسق کو بھی یہ فضائل حاصل ہو گئے تو اس کو اور کیا ضرورت رہی بس ایک شخص اٰمنت باللہ زبان سے اور دل سے کہہ لے اور اس پر جما دہے۔ پھر جو چاہے اعمال کرتا رہے اس کے لیئے رحمت بھی ہے۔ بشارت بھی ہے۔ فرشتوں کی رفاقت بھی ہے۔ حزن وخوف سے بے فکری بھی ہے۔

اس اشکال کا جواب میں ایک قاعدہ کلیہ سے دیتا ہوں جو ہر مقام پر کارآمد ہے کیونکہ یہ اشکال کچھ اسی آیت کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ بعض احادیث پر بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسے، من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ

وہ قاعدہ کلیہ میں نے اپنے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا ہے۔ کتابیں زیادہ دیکھنے کی مجھے عادت نہیں اگر کسی کو وسعت نظر کا شوق ہو۔ ان کو یہ شوق مبارک ہو ہمیں تو حق تعالیٰ نے اساتذہ ہی ایسے دیئے تھے۔ جنہوں نے بہت سی کتب سے مستغنی کر دیا۔ کیسا ہی اشکال ہو۔ اُن کی چند باتوں سے جو یاد ہیں رفع ہو جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔ کہ شارع نے جو اعمال کے فضائل بیان کیئے ہیں۔ وہ گویا خواص اعمال ہیں اور خواص اشیاء کا ظہور عقلاً ارتفاع موانع سے مشروط ہوتا ہے؛

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ادویات کی خاصیت بیان کرے تو ہر عاقل اس کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ اگر اس کے مخالف کوئی مضر چیز نہ کھائی جائے۔ تو یہ نفع ظاہر ہوگا۔ پس اگر کوئی خمیرہ گاؤزبان عنبری پر دو تولہ سنکھیا بھی کھالے اور مرجائے۔ تو اس سے خمیرہ کے خواص غلط نہ ہوجائیں گے۔ اسی طرح لا الٰہ الا اللہ دل سے کہنے اور اس پر مستقیم رہنے کی بھی خاصیت ہے۔ کہ اس سے ملائکہ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ بشارت سنائی جاتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کے منافی کوئی کام نہ کرے۔ مثلاً لا الٰہ الا اللہ کے بعد ان اللہ ثالث ثلثہ یا المسیح ابن اللہ وغیرہ نہ کہے۔ اگر کلمۂ ایمان کے بعد کلمۂ کفر بھی کہہ دے گا تو اس کی وہی مثال ہو گی جیسے خمیرہ کے بعد سنکھیا کھالے۔

پھر منافی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو پورا منافی ہو جیسے کلمۂ ایمان کا مقابلہ کلمۂ کفر ہے۔ یہ تو مبطل خاصیت ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کی خاصیت کو بالکل باطل و زائل کر دے گا اور ایک وہ جو پورا منافی نہ ہو بلکہ فی الجملہ منافی ہو جیسے کفر کے علاوہ اور معاصی ہیں ان سے کلمۂ ایمان کی خاصیت باطل تو نہیں ہوتی مگر کمزور ہو جاتی ہے۔ نفع دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے خمیرہ گاؤزبان کے ساتھ کھٹائی اور تیل اور گڑ اور سرکہ اور بینگن بھی کھائے جائیں۔ کہ ان اشیاء سے خمیرہ کی قوت کمزور ہو جائے گی اور نفع دیر میں ظاہر ہوگا۔

اس تقریر سے ایک اور شبہ کا جواب معلوم ہوگیا۔ وہ یہ کہ میں نے جو اوپر کہا تھا۔ کہ یہ فضائل خواص اعمال ہیں اور خواص کا ظہور رفع موانع کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ اس پر کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت ابوذرؓ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موانع اور مضرات کو بھی پیش کیا تھا۔ کہ :۔ یا رسول اللہ وان زنی وان سرق۔

مگر حضورؐ نے اُن کو مضر نہیں مانا۔ یعنی جب آپؐ نے فرمایا۔ کہ جو کوئی لا الٰہ الا اللہ کا معتقد ہو کر مر جائے وھو لا یشرك باللہ اس حال میں کہ وہ شرک نہ کرتا ہو۔ تو یہ شخص جنت میں جائے گا۔ اس پر حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! چاہے اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو آپؐ نے فرمایا:۔ وان زنی وان سرق۔

ہاں اگرچہ اُس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان خواص کا ظہور بدپرہیزی سے بچنے کے ساتھ مقید نہیں۔

تقریر گذشتہ سے یہ اشکال اس طرح حل ہوا کہ اس حدیث میں حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ زنا و سرقہ لا الٰہ الا اللہ کی خاصیت کے لیئے مبطل نہیں حضرت ابوذرؓ اس کو مبطل سمجھتے تھے۔ حضورؐ نے اس کی نفی کر دی۔

رہا یہ کہ یہ اعمال کسی درجہ میں بھی لا الٰہ الا اللہ کی خاصیت کے منافی اور مضر نہیں۔ یہ اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زنا و سرقہ وغیرہ لا الٰہ الا اللہ کی خاصیت کے لیئے مضعف اور اس کے ظہور کے لیئے مؤخر ہیں یعنی ایسا شخص جنت میں تو ایمان کی برکت سے چلا جاوے گا مگر دیر میں جائے گا۔ یا یہ کہا جائے۔ کہ ایمان کی خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے۔ مگر جب مفرد دوسرے اجزاء سے مرکب ہو جاتا ہے۔ تو مرکب کا مزاج دوسرا ہو جاتا ہے۔ پس اگر ایمان اعمال صالحہ کے ساتھ مرکب ہوا تو اس وقت مجموعہ کا مزاج اور ہوگا۔ اس وقت ایمان کی خاصیت تیز اور قوی ہو گی کیوں کہ یہ اجزاء لا الٰہ الا اللہ کے مناسب ہیں اور اگر اعمال سیئہ سے مرکب ہوا تو مجموعہ کا مزاج دوسرا ہو گا۔ یا یہ کہا جائے کہ خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے مگر عارض و موانع

کی وجہ سے ویسے ہو جائے گی پس اب یہ دعوے محقق ہو گیا کہ یہاں جس فضیلت استقامت کا ذکر ہے۔ وہ مطلق استقامت علی الایمان ہی کی فضیلت ہے خواہ کسی درجہ کی ہو۔

فضائلِ استقامت

اب ان فضائل کو سنیئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ. کہ اُن پر رحمت و بشارت کے فرشتے اتریں گے۔ در منثور میں زید بن اسلم سے مروی ہے۔ کہ نزولِ ملائکہ تین وقتوں میں ہوگا۔ اول تو مرتے ہوئے بشارت دیں گے۔ چنانچہ حدیث مرفوع میں بھی ہے۔ کہ مومن جب مرتا ہے۔ تو رحمت کے فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

اُخْرُجِيْ ايتها النفس المطمئنة الی روح و ریحان ورب غیر غضبان۔

(ترجمہ) اے نفس مطمئنہ نکل طرف راحت اور بہار کے اور طرف ایسے پروردگار کے جو ناراض و غضبناک نہیں ہے۔ اس وقت مسلمان لقاء اللہ کا مشتاق ہو جاتا ہے۔

اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ مسلمانوں کو تو مرتے ہوئے بہت کرب ہوتا ہے۔ یہ تو خوشی کے ساتھ جانے کی علامت نہیں اس کا جواب یہ ہے۔ کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک جسم ایک روح تو کرب نزع میں مومن کے جسم کو تو تکلیف ہوتی ہے مگر روح کو لذت حاصل ہوتی ہے۔

لہ ان تینوں جوابوں میں جو فرق ہے۔ اہل علم اس کو تامل کے بعد سمجھ سکتے ہیں۔ اول صورت میں تو فعل ہی ضعیف ہو گیا۔ دوسری صورت میں فعل ضعیف نہیں ہوا۔ دوسرے جزو کے سبب اثر ضعیف ہو گیا۔ تیسری صورت میں اثر بھی ضعیف نہیں ہوا۔ ظہور متوخر ہو گیا۔ ۱۲ منہ اشرف علی۔

جس کی ہم کو خبر نہیں ہوتی۔ کیونکہ روح مبصر نہیں اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو بغل میں لے کر ایسا زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں نکل آئیں تو اس کے جسم کو تو کلفت ہے۔ مگر دل سے وہ اس حال میں شادان و فرحاں ہوتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ اگر محبوب یہ کہے کہ تم کو کلفت ہوتی ہے تو لاؤ تم کو چھوڑ کر رقیب کو دبانے لگوں۔ تو وہ یہ کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یوں کہے گا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے!

پس شدت نزع اس شخص کے عاصی ہونے کی علامت نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ جب سے میں نے حضورؐ کی شدت نزع دیکھی ہے۔ اس وقت سے سہولت نزع کی تمنا نہیں رہی کیونکہ پہلے تو یہ خیال تھا۔ کہ سہولت نزع کوئی اچھی اور مطلوب شئے ہے مگر اب معلوم ہوا۔ کہ شدت بھی مذموم نہیں ورنہ حضورؐ کو کیوں ہوتی؟

دراصل شدت نزع کا مدار طاعت و معصیت پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے سبب دو ہیں ایک قوت جسم دوسرے کثرت تعلقات۔ کیونکہ موت کے وقت روح طبی جسم سے جدا ہوتی ہے۔ اگر جسم قوی ہے۔ تو روح کا طبی انفصال اس سے دقت کے ساتھ ہوگا۔ کیوں کہ وہ رگ رگ میں پیوستہ ہوتی ہے اور چونکہ روح مجرد کو بھی روح طبی کے واسطہ سے جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو اگر روح مجرد کو دنیا کی چیزوں کے ساتھ تعلق زیادہ ہوگا تو اس تعلق کا منقطع ہونا اسے ناگوار ہوگا۔ اس لیئے وہ جسم سے

اپنا تعلق دنیا میں قطع کرتی ہے اس کے بعد سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا جسم بھی قوی تھا اور آپ کی روح اقدس کو اپنی امت کے ساتھ تعلق بھی بہت تھا۔ وصال کے وقت آپ کو اپنی امت کی طرف سے فکر بھی اس لیئے شدت ہوئی جب حق تعالیٰ نے آپ کو امت کی طرف سے بے فکر کر دیا۔ اس وقت روح نے جسم سے تعلق منقطع کیا۔ اب اگر یہ تعلق محمود ہے تو شدت نزع محمود ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ میں ہوا اور اگر تعلق مذموم ہے تو شدت مذموم ہے اور اگر کسی کی روح کو اشیاء دنیا سے کچھ بھی تعلق نہ ہو تو نزع میں سہولت ہو گی چاہے میت کافر ہی ہو۔ جیسے کوئی جوگی تعلقات واجبہ و غیر واجبہ سب کو قطع کر دے تو اس کو نزع میں سہولت ہو گی۔ گو یہ سہولت محمود نہیں۔

اسی طرح اگر کسی کا جسم بہت کمزور ہو۔ اس کو بھی نزع میں آسانی ہو گی اور یہ بھی کچھ کمال نہیں چنانچہ مدقوق کا جسم بہت کمزور ہو جاتا ہے اس کو نزع سہل ہوتا ہے۔ کہ پاس والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ روح کب نکل گئی۔ چاہے مدقوق مومن ہو یا کافر بہرحال شدت نزع کو بشارت ملائکہ سے کچھ منافات نہیں ہر مومن مرتے ہوئے فرشتوں کی بشارتیں سن کر خدا سے ملنے کا مشتاق ہو جاتا ہے۔ گو جسم سے جان نکلنے میں کلفت ہی کیوں نہ ہو۔

اس وقت اس کی وہ حالت ہو گی جیسے کسی شخص کو اس کا محبوب کھڑکی میں نکلنے کو کہے کہ اس ایک تنگ کھڑکی میں سے نکل کر ہمارے پاس آؤ۔ تو اس وقت وہ پتھر سے بدل کر اور دب جھک کر جانے کی کوشش کرے گا۔ گو اس حالت میں اس کے جسم پر خراش آجائے گا۔ مگر اندر سے اس کا دل وصال محبوب کا خیال کر کے خوش ہو گا بلکہ اس تکلیف پر بھی وہ خوش ہو گا۔ کیونکہ محبوب

اس کے سامنے ہے۔ وہ جانتا ہے کہ محبوب میری اس مشقت کو دیکھ رہا ہے کہ میں کس مصیبت سے اس کے پاس جانے کی کوشش کر رہا ہوں اس وقت وہ زبان حال سے یوں کہتا ہوا جائے گا۔ ؎

بجرم عشق توام میکشند و غوغا ئیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ئیست

واقعی محبوب کے حکم کی تعمیل میں یا اس کی محبت میں نگاہوں کے سامنے کتنی بھی تکلیف ہو سب آسان ہو جاتی ہے۔

اسی لیئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔

اپنے رب کے حکم کے لیئے (تکالیف پر) صبر کیجئے۔ کیوں کہ آپ ہمارے سامنے ہیں۔ ہم آپ کی سب حالت دیکھ رہے ہیں یہاں فانک باعیننا بڑھا کر صبر کو آسان کر دیا۔

ایک عاشق کو کسی شخص کے ساتھ محبت کے جرم میں لوگوں نے بہت مارا ننانویں کوڑوں پر تو اس نے ایک بھی آہ نہ کی سویں کوڑے پر اس کے منہ سے آہ نکلی۔ بعد میں کسی نے پوچھا کہ تو نے ننانوے کوڑوں میں تو آہ نہ کی۔ اخیر کے کوڑے پر آہ کی۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا۔ میرا حال دیکھ رہا تھا۔ اس لیئے مجھ کو کلفت کا احساس نہ ہوا۔ بلکہ اس میں مزہ آرہا تھا کہ محبوب دیکھ رہا ہے۔ کہ اس کی محبت میں میرا کیا حال ہے۔ اخیر کوڑے پر وہ چلا گیا۔ اس لیئے کلفت کا احساس ہوا۔

صاحبو! یہ تو اس کا محبوب تھا۔ جس کی نگاہ سے عاشق غائب ہو گیا اور ہمارا محبوب ایسا ہے۔ کہ کسی وقت کوئی چیز اس سے غائب نہیں ہے ہمارے ہر حال کو دیکھ رہا ہے پھر فانک باعیننا جس کے پیش نظر ہو۔ اس کو مصائب میں کیوں کلفت ہو۔ بہر حال شدت نزع کا شبہ رفع ہو

گیا غرض ایک تو یہ وقت ہے نزول ملائکہ کا جب کہ مومن مرتا ہے اور روح نکلنے کے بعد کی کیفیت حدیث میں آتی ہے۔

حتی انه لینادله بعضهم بعضا۔

یعنی فرشتے اس روح کو ایک دوسرے کو دیتے ہوئے لے چلتے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ میں لے کر جاؤں دوسرا چاہتا ہے۔ کہ میں لے کر جاؤں۔

دوسرا وقت اس کا قبر میں ہوتا ہے۔ کہ فرشتے آتے ہیں اور مردہ سے سوالات کرتے ہیں۔

من ربك ما دینك ومن هذا الرجل۔

تیرا پروردگار کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے اور یہ شخص کون ہیں۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) مومن تو جواب ٹھیک ہی دے گا پھر اس کو فرشتے بشارت دیں گے۔

نم کنومة العروس۔

تیسرا وقت حشر کا ہے۔ کہ اس وقت فرشتے آئیں گے اور قبر سے مومن کا استقبال کریں گے اور اس کو بشارتیں سنائیں گے اور تعظیم و تکریم کے ساتھ میدان حشر میں لے جائیں گے۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ پھر اس بشارت کے بعد میدان حشر میں مسلمانوں کو پریشانی اور خوف کیوں ہو گا۔ جیسا کہ ظاہر احادیث سے معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ وہ احادیث عام نہیں۔ خود حدیث میں آتا ہے۔ کہ مومن کو قیامت کا دن نماز کے وقت کے برابر معلوم ہو گا اسی کے مناسب میں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے سنا ہے فرماتے تھے۔ ؎

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست
عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

عشاق کو تو قیامت کا پچاس ہزار برس کا دن اتنا معلوم ہوگا جتنی نماز میں دیر لگتی ہے اور نماز بھی جلدی کی جیسا کہ ہم پڑھا کرتے ہیں اور اگر حضرت ابوبکر صدیق رض ہی جیسی نماز ہوئی تو خیر ذرا کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا اگر یہ کہو کہ ہم کو تو شبہ ہو گیا اگر حضرت ابوبکرؓ کی نماز کے برابر دیر لگی تو وہ تو بڑی لمبی لمبی نماز پڑھتے تھے۔ تو ارے بھائی ان کے دل سے پوچھو۔ کہ ان کو وہ گھڑیاں کیسی قلیل معلوم ہوتی تھیں اسی طرح موقف کا وقت بھی قصیر ہی معلوم ہوگا۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی۔ کہ جب رات آتی تو فرماتے :۔

هٰذه ليلة القيام۔

یہ کھڑے ہونے کی رات ہے۔ پھر رات بھر نماز میں کھڑے رہتے۔ صبح کے قریب رکوع و سجدہ کر کے نماز پوری کر لیتے۔ اگلا دن ہوتا تو فرماتے :۔ هٰذه ليلة الركوع۔

یہ رکوع کی رات ہے پھر رات بھر رکوع ہی میں رہتے کسی دن کہتے :۔

هٰذه ليلة السجود۔

یہ سجدہ کی رات ہے اور پھر رات بھر سجدہ میں رہتے اور صبح کے قریب فرماتے۔ کہ رات بہت جلدی گزر گئی۔ ارمان پورا نہ ہوا اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو بھی وہ دیر کچھ دیر نہ معلوم ہوتی تھی۔ تو بھائی تم نے نماز تولی ہے حضرت صدیق رضؓ کی اور وجدان لیا اپنا۔ یہ غلطی ہے اگر ان جیسی نماز کے برابر بھی دیر ہوئی۔ تو وہ بھی تم کو کچھ دیر نہ معلوم ہوگی بہرحال خواہ تمہاری نماز کے برابر دیر ہو یا اہل خشوع کی نماز کے برابر۔ مومن بہت جلد چھوٹ جائے گا۔ اس کو زیادہ طول محسوس نہ ہوگا۔ خصوصاً اگر کوئی ایسا عاشق ہوا۔ جس کا کچھ سلسلہ بھی نہ ہو۔ وہ تو وہاں بہت ہی بے فکر ہوگا۔ جیسے احمد جام

فرماتے ہیں نغبطھم الانبیاء والمرسلون۔

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

اکرام اہل استقامت

یہ عشاق قیامت میں نور کے ممبروں پہ بیٹھے ہوں گے۔ ان کو کچھ فکر نہ ہوگا حدیث میں ہے۔

کہ ان کی اس حالت پر انبیاء علیہم السلام بھی غبطہ کریں گے کیوں کہ انبیاء کی پیشی ہوگی ان سے سوال و جواب ہوگا مگر یہ سب امت ہی کے متعلق ہوگا خود ان کی ذات کے متعلق حساب و کتاب ان سے کچھ نہ ہوگا اور اپنی ذات کے لئے انبیاء کو کچھ تشویش نہ ہوگی۔ کیوں کہ وہ تو معصوم ہیں ہاں انبیاء کو امت کی فکر ہوگی اس لیئے ان بےفکروں پہ غبطہ کریں گے۔ کہ یہ بڑے چین میں ہیں۔ ان کو کسی کی بھی فکر نہیں۔

مگر اس سے ان اولیاء کی فضیلت انبیاء پر لازم نہیں آتی کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے حاکم ضلع جس وقت اپنے ماتحت حکام کے عملہ کا معائنہ کرتا ہے۔ تو اس وقت حاکم کو اور عملہ والوں کو فکر ہوتی ہے۔ عملہ والوں کو اپنے اپنے کام کی اور حاکم کو اپنے عملہ کی۔ کہ کہیں ان پہ کوئی جرم قائم نہ ہو جائے۔ اس وقت حاکم کے اردلی اور سائیں کو کچھ فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے سپرد عملہ کا کام ہی کچھ نہیں۔ اس وقت حاکم عملہ کو اپنے اردلی کی بے فکری پہ رشک ہو سکتا ہے۔ کہ یہ بہت بے فکر ہے۔ مگر معائنہ کے بعد حاکم حاکم ہے اور اردلی اردلی ہے۔ اسی طرح بعد فیصلہ کے انبیاء جب جنت میں جائیں گے۔ تو ان کے مراتب سب سے اعلیٰ ہوں گے۔ اس وقت یہ اولیاء ان پہ رشک کریں گے۔ غرض حشر میں بھی نزول ملائکہ ہوگا اور

ان کی بشارت سے خوف و حزن کچھ نہ ہوگا۔

اور تتنزل کا صیغہ تبلا رہا ہے۔ کہ یہ نزول تدریج یکے بعد دیگرے ہوگا۔ تاکہ زیادت مسرت و انشراح اور زیادت اکرام کا سبب ہو۔ جیسے ایک شخص مہمان ہو کر بادشاہ کے یہاں جائے تو اول تو اسٹیشن پر اس کا استقبال کرنے ایک جماعت آئے اور بشارت دے کہ بادشاہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر چل کر ایک اور جماعت آئے اور خوشخبری مبارک باد سنائے۔ کچھ دیر کے بعد تیسری جماعت آئے اور وہ بھی مبارک باد اور خوشخبری سنائے۔ تو اس میں زیادہ مسرت و اکرام ہے۔ دفعۃً ہجوم سے تو مہمان بعض دفعہ گھبرا جاتا ہے۔ اس لیئے وہاں ملائکہ کا نزول تدریجاً یکے بعد دیگرے ہوگا۔ پھر وہ سب کے سب یہ بشارت دیں گے۔ لَا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا۔

کہ آفاتِ قیامت سے تم اندیشہ نہ کرو اور دنیا کے چھوٹنے کا رنج نہ کرو کیونکہ آگے تمہارے لیئے امن و راحت اور نعم البدل ہے۔

وَاَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ

تم جنت کے ملنے پر خوش رہو۔ جس کا پیغمبر کی معرفت، تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا اور دنیا کو جنت سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ تو اب دنیا کے چھوٹنے کا کیا رنج۔

حقیقت دنیا

یہ تو ایسا ہوا جیسا کسی کو اشرفی مل جائے اور پیسہ بلکہ کوڑی کھو جائے تو اس سے کچھ بھی رنج نہ ہوگا۔ بلکہ تمنا کرے گا کہ ایسا پیسہ تو ہر روز کھو جایا کرے جس کے بدلہ میں اشرفی مل جائے۔ یہی توجیہ ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں الدنیا ملعونۃ وما فیھا ملعون الا ذکر اللہ وما والاہ او عالم او متعلم۔

کیونکہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے پاخانہ چنانچہ خواب میں اکثر دُنیا کی یہی صُورت دیکھی جاتی ہے کانپور میں ایک طالبعلم صاحب تھے انہوں نے خواب میں دیکھا کہ حق تعالیٰ شانہ عرش پر جلوہ افروز ہیں اور سب آدمیوں کا امتحان لے رہے ہیں ایک شخص پر سخت عتاب ہوا۔ یہ خواب دیکھنے والے کانپ اُٹھے۔ وہاں عرش کے ایک گوشہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی رونق افروز ہیں یہ عتاب کی حالت دیکھ کر حضورؐ کی خدمت میں عرض کرنے لگے۔ کہ یا رسول اللہ! آپ کچھ مدد فرمائیے۔ تو آپ نے فرمایا۔ تم امتحان کے وقت یوں کہہ دینا۔ کہ میں تو کچھ علم نہیں رکھتا۔ اسی اثناء میں ان کو بھی امتحان کے لئے پکارا گیا اور فرمایا۔ کہ لاؤ جلالین۔ اس نے عرض کیا۔ کہ یا اللہ میں تو جاہل ہوں۔ میں تو جلالین پڑھا ہوا بھی نہیں۔ اس پر تبسم فرمایا اور حکم ہوا۔ اچھا تمہارے لیئے ایک دن کی قید ہے اس حکم کے بعد اس کو ایک کوٹھڑی میں لے گئے جو پاخانہ سے بھری ہوئی تھی اور وہاں قید کر دیا اس خواب کی تعبیر یہی سمجھی گئی وہ کوٹھڑی دُنیا کی صُورت مثالی ہے ان کو دکھلا دیا گیا کہ جس دنیا میں تم منہمک ہو رہے ہو۔ پھر دیکھا کہ اس کوٹھڑی سے نجات ہوئی اور اس کو ایک نہر میں غسل دیا گیا اور پاک صاف کر دیا گیا۔ اس کی تعبیر نہر الحیات سمجھی گئی۔

اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہے۔ کہ وہ روز بستر پر پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ کمبخت تو جوان ہو کر بستر پر پیشاب کرتا ہے تجھے شرم نہیں آتی۔ کہا کیا بتلاؤں۔ خواب میں ہر روز شیطان آتا ہے کہ آؤ تم کو سیر کرا لاؤں۔ میں اس کے ساتھ چل کھڑا ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے پیشاب لگ جاتا ہے اس وقت میرے سامنے ایک پاخانہ نظر آتا ہے میں اپنے نزدیک تو اس کے قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں مگر وہ صبح کو بستر ملتا ہے پیشاب کو کہیں ہوں اور نکلتا کہیں ہے۔ وہی مثال

ہو گئی۔ ؎ جو تھے مژگان پُرخون سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ نے اس شعر کو ایک عجیب موقعہ پر لکھا ہے بعض فرق باطلہ کا مذہب ہے کہ استقرار بالمرآۃ سے بھی حمل قرار پا جاتا ہے مولانا نے اس پر لکھا ہے کہ واقعی کیوں نہ ہو اس کی وہی مثال ہے ؎ جو تھے مژگان پُرخون سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

یہ تو بیچ میں ایک لطیفہ تھا۔ تو اس شخص کی بیوی نے کہا کہ اب کے شیطان خواب میں آئے تو اس سے کہنا کہ یار تم ہمارے دوست ہو گئے ہو کچھ ہمارے ساتھ ہمدردی کرو کہ ہم تنگدست غریب آدمی ہیں کہیں سے بہت سا مال ہم کو دلوا دو۔

مرد نے کہا ضرور آج رات کو کہوں گا رات ہوئی اور خواب میں حسب معمول شیطان آیا اور اس نے بیوی کا پیغام اس سے بیان کیا شیطان نے کہا کہ مال تمہارے واسطے بہت اور جتنا چاہو لے لو شیطان ایک خزانہ پر اسے لے گیا اور بہت سا مال اس کی کمر پر لادا اور اتنا لادا کہ اس کے زور سے پاخانہ نکل گیا اب جو صبح کو اٹھے ہیں تو مال تو غائب مگر بستر پر پیشاب کے ساتھ پاخانہ بھی موجود۔

بیوی نے کہا یہ کیا۔ اس نے سارا قصہ بیان کیا بیوی نے کہا بس جی میں مال سے باز آئی تم پیشاب ہی کر لیا کرو یہ پاخانہ کی مصیبت کون سمیٹے تو یہ حقیقت ہے دنیا کی کہ پاخانہ یعنی وبال تو رہ جائے گا اور حظوظ غائب جب دنیا کی یہ حقیقت ہے تو پھر جنت میں پہنچ کر اس کے چھوٹنے کا کیا رنج وہاں تو کسی قسم کی بھی کلفت نہ ہوگی راحت ہی راحت ہے اس کے بعد فرشتے کہیں گے نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

کہ ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رفیق رہیں گے۔ یہاں بھی تمہارا ساتھ ہر قدم پر دیں گے۔ دنیا میں فرشتوں کی رفاقت دو طرح ہوتی ہے ایک تو وہ اعمالِ صالحہ انسان کے دل میں القا کرتے ہیں دوسرے مصائب کے وقت سکینہ و اطمینان نازل کرتے ہیں چنانچہ صبر کے وقت کلفت ضبط کے علاوہ قلب میں ایک قوت اور چین بھی ہوتی ہے یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جہاد میں بھی ملائکہ سکینہ نازل کرتے ہیں چنانچہ نص میں ہے۔ کہ بدر میں ملائکہ نازل ہوئے اور ان کا کام یہ تھا

فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا۔

کہ مسلمانوں کے قلوب کو قوتِ دین اور لڑائی میں ان کو ثابت قدم بنائیں گو قتال بھی ملائکہ سے ثابت ہے مگر اصل کام ان کا وہی تثبیت اور انزال سکینہ تھا۔ تیسری رفاقت یہ ہے کہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ نص میں ہے۔ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۔ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ ۔

انسان کے دشمن سانپ بچھو تو ہیں ہی۔ اس کے دشمن جنات بھی ہیں اور فرشتے جنات سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ حفاظت نہ ہو تو جنات اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دیں ہاں جب حق تعالیٰ ہی کوئی مصیبت بھیجنا چاہیں۔ تب وہ نہیں ٹل سکتی۔ اس وقت اس حفاظت کی صورت بدل دی جاتی ہے اور جنات یا حیوانات سے اس کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اور آخرت کی ایک رفاقت تو اوپر معلوم ہو چکی۔ کہ مرتے ہوئے اور قبر میں اور حشر میں گھر سے نکلتے ہوئے بشارتیں سنائیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک اور موقعہ پر بھی فرشتے حاضر ہوں گے یعنی جنت میں۔

يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ۔ ہر دروازہ سے مسلمانوں کے پاس سلام کرنے اور مبارک باد دینے آئیں گے۔

عمر فاروق @ ون اردو

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔

آگے ارشاد ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ۔

یعنی جنت کو عیش محدود نہ سمجھنا، اس کی یہ حالت ہو گی کہ جس چیز کو بھی تمہارا جی چاہے گا اس میں موجود ہے اور جو مانگو گے، تمہارے لیئے وہاں موجود ہے۔

اس پر ایک طالب علمانہ شبہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ لکم فیہا ما تشتھی انفسکم کے بعد لکم فیہا ما تدعون کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ مانگنا تو چاہنے کی فرع ہے جب وہاں ہر مشتہی موجود ہے تو اس سے ہر مدعی کا ہونا خود لازم آگیا پھر اگر کسی وجہ سے اس کو بیان کیا گیا تھا تو با قاعدہ بلاغت ابلغ کو مؤخر کرنا چاہیئے تھا کیونکہ ترقی ادنی سے اعلیٰ کی طرف ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف۔ اور یہاں اعلیٰ کو مقدم کیا گیا ہے یعنی ما تشتھی انفسکم کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشتہی اور مدعی ہی تو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ منہ سے مانگی اور دل کی چاہی مرادیں وہاں سب برابر ہیں۔ جیسے منہ مانگی مراد فوراً پوری ہو گی ایسے ہی دل کی چاہی مراد بھی فوراً پوری ہو گی۔ روایات میں ہے کہ جنتی کا دل کسی پھل کو دیکھ کر رغبت کرے گا۔ تو فوراً وہ پھل ٹوٹ کر سامنے آجائے گا اور اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل درخت پر پیدا ہو جائے گا اس تسویہ کو بیان کرنے کے لیئے دونوں کا ذکر ضروری تھا اور لکم فیہا ما تشتھی انفسکم کی تقدیم بھی اسی لیئے ہے کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنے میں زیادہ مبالغہ ہے۔ مثلاً کہا کرتے ہیں۔ کہ ہمارے یہاں اشرفی اور پیسہ برابر ہے۔ اس صورت میں ابلغ و اعلیٰ ہی کو مقدم کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہاں اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنا مقصود ہے۔ کہ مشتہی جنت میں مثل مدعی کے ہے ادنیٰ کو اعلیٰ

کے برابر کرنا مقصود نہیں کیوں کہ یہ مراد کے خلاف ہے۔ اب اشکال رفع ہو گیا۔

آگے فرماتے ہیں: نُزُلًا کہ یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہوگا بھک منگوں کی طرح کھانا وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ عزت و قدر دانی کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ اب جب ہر طرح سے اطمینان دلا دیا گیا تو قاعدہ ہے کہ اطمینان کے بعد وہم شروع ہوا کرتا ہے اور دور دور کی سوجھا کرتی ہے۔ اب جنتیوں کو یہ خیال ہوگا کہ میاں ہم تو اس قابل نہ تھے نہ ہمارے اعمال اس لائق تھے ہم نے تو بعضے بڑے بڑے گناہ بھی کیے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مہمانی تھوڑی دیر کے لیے ہو۔ پھر معاصی پر گرفت ہونے لگے۔ اس لیے فرماتے ہیں:۔

مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔

کہ گو تم اس قابل نہ تھے۔ مگر حق تعالیٰ بخشنے والے ہیں۔ انہوں نے تمہارے عیوب و نقائص کو معاف فرما کر یہ انعام کیا ہے۔ کیونکہ وہ بخشنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ جرم کو معاف فرما کر عنایت و رحمت بھی فرماتے ہیں وہ جس مجرم کو معافی دیتے ہیں اس پر انعام بھی فرماتے ہیں۔ خلعت و زادِ راہ بھی عنایت کرتے ہیں۔ یہاں تک تو استقامت کے ثمرات کا ذکر تھا۔

طریق تکمیل استقامت

اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ کہ یہ سب مطلق استقامت کا نتیجہ ہے اور وہ عام ہے۔ خواہ استقامت بدرجہ اعلیٰ ہو یا بدرجہ ادنیٰ۔ یعنی خلاصہ یہ ہے کہ نتائج نفس ایمان کے ہیں۔ مگر استقامت و ایمان اگر ادنیٰ ہے تو یہ ثمرات گو حاصل سب کے سب ہوں گے مگر درجہ ادنیٰ میں حاصل ہوں

گے اور اگر استقامت اعلیٰ ہے تو یہ ثمرات اعلیٰ درجہ میں حاصل ہوں گے۔ اس لیئے آگے اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کی ترغیب کے لیئے تکمیل استقامت اور تقویت ایمان کا طریقہ اس طرز سے بتلاتے ہیں:۔

چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے۔ جو بلاوے طرف اللہ کے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اس میں تکمیل ایمان کے لیئے تین اجزاء مذکور ہیں۔ ایک دعوت الی اللہ کہ دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے امر بالمعروف کرے۔ یعنی لوگوں کو اسلام کی دعوت دے اور مسلمانوں کو طاعات کی ترغیب دلائے۔ دوسرے یہ کہ خود بھی اعمال صالحہ اختیار کرے۔ محض نفس ایمان پر اکتفا نہ کرے۔ تیسرے یہ کہ یوں کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

اس تیسرے جملہ پر بظاہر یہ اشکال ہو گا۔ کہ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا۔ کے بعد اس کی کیا ضرورت رہی۔ کیوں کہ دعوت الی اللہ اور عمل صالح بدون اسلام کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو اس کے لیئے پہلی شرط ہے۔ پھر جو شخص اللہ کی طرف بلائے گا وہ خود بھی ضرور مسلمان ہو گا۔ اس سے خود اس کا مسلمان ہونا مفہوم ہو گیا۔

نیز اس سے پہلے بھی جو فضائل نفس ایمان کے مذکور ہیں وہ بھی اسلام کو مقتضی ہیں۔ بدون اسلام کے نہ جنت مل سکتی ہے۔ نہ بشارتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ تو اب وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ کو اخیر میں کیوں بیان کیا گیا؟ اس کو تو تکمیل استقامت میں دخل نہیں۔ بلکہ نفس استقامت ہی اس پر موقوف ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں اسلام من حیث ہو الاسلام کا قبول کرنا مراد نہیں۔ کیوں کہ واقعی یہ تو پہلے کلام سے مفہوم ہو چکا ہے بلکہ مقصود یہ ہے۔ کہ ان کو اپنے اسلام کے ظاہر کرنے سے عار نہیں آتا بلکہ فخر کے طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ بات نفس اسلام سے زائد ہے۔ یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کا اسلام کامل ہو۔ لہذا اس کو تکمیل اسلام میں دخل ہوا۔ کیونکہ بعض لوگ مسلمان تو ہوتے ہیں مگر ان کو کفار کے سامنے اظہار اسلام سے عار آتا ہے۔

چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ریل میں ایک بار نماز کا وقت آگیا تھا۔ مگر میں نے وہاں اس لیے نماز نہیں پڑھی کہ ہندوؤں کے سامنے اٹھنا بیٹھنا ہونے سے اسلام کی تحقیر ہوتی۔ کہ یہ لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے کہ اسلام میں یہ کیسی تعلیم ہے۔ یہ شیطان کی تلبیس تھی کہ اس نے اس ترکیب سے ترکِ نماز کو اس کے ذہن میں آراستہ کر دیا۔ ورنہ دراصل اس کو مخالفین کے سامنے عبادت کرنے سے استنکاف تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو بھرے مجمع میں یہ بات ظاہر کرنے سے عار آتی ہے کہ ہم فلاں کے شاگرد ہیں اور وہ ہمارا استاد ہے اور اگر کبھی کو اس سے بھی عار نہ آئے تو اپنے معتقدین کے سامنے استاد کی خدمت سے تو ضرور عار آتا ہے۔

ایک جنٹلمین مولوی کا قصہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک جلسہ میں تقریر کی مولوی فاروق صاحب چڑیا کوٹی بھی جو ان کے استاد تھے۔ جلسہ میں موجود تھے۔ جب وہ مولوی صاحب تقریر کر چکے تو مولوی فاروق صاحب نے ان کو پکارا کہ ارے فلانے ذرا میرے پیر دبانا اس وقت مولوی صاحب نے پیر تو دبائے۔ مگر ان کے چہرہ سے ناگواری ظاہر ہوتی تھی تو گو ان کو مولوی فاروق صاحب

کی شاگردی سے انکار نہ تھا مگر اس کے اظہار سے استنکاف تھا۔ اسی طرح بعضوں کو اپنے اسلام کے اظہار سے عار آتا ہے۔

اور اس کی فرع یہ بھی ہے۔ کہ جن مسائل اسلامی پر ملاحدہ اعتراض کرتے ہیں۔ بعض مسلمان ان مسائل کے اظہار سے عار کرتے ہیں اور ان میں تاویل و تحریف کر کے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مخالفین پر ان مسائل کی اصلی حقیقت ظاہر نہ ہو۔ جیسے غلامی کا مسئلہ اور معراج کا قصہ بعضے تو ان کا صراحتہ انکار ہی کر دیتے ہیں کہ اسلام میں یہ مسائل ہیں ہی نہیں جیسے ایک لطیفہ سنا ہے کہ ایک مولوی صاحب سے کسی نے سرین کی عربی پوچھی۔ ان کو معلوم نہ تھی۔ کہتے ہیں عرب میں سرین نہیں ہوتے۔ اس لیئے اس کی کچھ عربی نہیں اور بعضے صراحتہ انکار نہیں کرتے۔ لیکن اصلی صورت پر ان کو ظاہر بھی نہیں کرتے اس لیئے فرماتے ہیں:۔

وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

یعنی بندگی کے اظہار کو فخر سمجھے۔ کہ ہم حق تعالیٰ کے ایسے تابعدار ہیں کہ سب احکام کو بلا چون وچرا مانتے ہیں چاہے وہ عقل میں آئیں یا نہ آئیں اب اشکال رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا۔ کہ اس قول کو تکمیل استقامت میں بڑا دخل ہے۔

پس فرماتے ہیں۔ کہ تم نے مطلق استقامت کے فضائل تو سن لیئے اب اس کے بڑھانے میں کوشش کرو۔ جس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ امر بالمعروف کرو دوسروں کو اسلام کی طرف بلاؤ اور خود بھی اعمال صالحہ بجا لاؤ اور اپنے اسلام کو فخر کے طور پر دل کھول کر ظاہر کرو جس کو یہ باتیں حاصل ہو جائیں۔ اس سے اچھی کسی کی بات نہیں

دستورِ دعوت

آگے اسی کے متعلق ایک بات فرماتے ہیں. جو اسی آیت کے لیئے کا جزو ہے. مستقل مضمون نہیں. وہ یہ کہ اوپر دعوت الی اللہ کا امر تھا اور دعوت الی اللہ میں بعض دفعہ کفار یا فجار ایذاء پہنچاتے ہیں. اس کے متعلق ایک دستور العمل تعلیم فرماتے ہیں اور وہ تعلیم تو اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ سے شروع ہوگی مگر اس سے پہلے مقدمہ کے طور پر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں۔

وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔

یعنی یہ قاعدہ یاد رکھو کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوتی. اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ اچھا برتاؤ اور برا برتاؤ برابر نہیں ہوتا پس تم کو دعوت میں عمدہ برتاؤ اختیار کرنا چاہیئے. وہ کیا ہے؟

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ۔

یعنی مخالفت کے برے برتاؤ کو اپنے اچھے برتاؤ سے دفع کرو. بدی کا علاج بھلائی سے کرو. اگر وہ سختی کریں تو تم نرمی کرو ان کے ساتھ خشونت سے پیش نہ آؤ۔

آگے اس کا ایک دنیوی فائدہ بتلاتے ہیں:۔

فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ۔

یعنی پھر دیکھ لینا کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے. کانہ ولی حمیم میں لفظ تشبیہ سے اس طرف لطیف اشارہ ہے. کہ بعض لوگ تو نرمی کرنے سے بالکل ہی دوست ہو جاتے ہیں اور بعض اگر دوست نہیں ہوتے لیکن اُن کی عداوت ضرور گھٹ جاتی ہے اور شر میں تقلیل ہو جاتی ہے اور اس امر میں وہ دوست کے مشابہ ہو جاتا ہے گو دلی دوست نہ ہو مگر اس میں ایک شرط ہے جس کو

میں بھول گیا تھا اپنی تفسیر کو دیکھا تو اس میں اس تمام پر سلامت جس کی قید بڑھائی ہے۔ یعنی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مخاطب کی طبیعت میں سلامتی ہوئی۔ تو اس برتاؤ کا یہ اثر ضرور ظاہر ہوگا اور یہ قید دلیل عقلی سے پائی گئی ہے۔ پس اب یہ اشکال نہ رہا کہ بعض دفعہ ہم دشمن سے کتنی ہی نرمی کرتے ہیں مگر عداوت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ وہ شخص کج طبع ہے۔ اس لیئے اثر نہیں ہوا سلیم الطبع ہوتا تو ضرور جھک جاتا۔

آگے فرماتے ہیں، کہ بدی کا بدلہ بھلائی سے کرنا ہر ایک کو آسان نہیں۔ بلکہ یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا مستقل مزاج اور صاحب نصیب ہے۔ یعنی جو اخلاقی اعتبار سے مستقل اور ثواب آخرت کے اعتبار سے صاحب نصیب ہے۔ اس میں اس کے معاملہ کا طریقہ بتلا دیا۔ کہ اپنے اندر استقلال کا مادہ پیدا کرو اور آخرت کے حصہ کو دل میں جگہ دو۔ پھر یہ سب کچھ آسان ہو جائے گا۔

آگے فرماتے ہیں کہ اگر کسی وقت شیطان کی طرف سے (غصہ کا) وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیئے۔ اس میں غصہ کا علاج تبلایا گیا ہے۔ کہ غصہ کے وقت زبان سے اعوذ باللہ پڑھنا چاہیئے اور دل سے اس کے مضمون پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ جیسے ہم دوسرے پر غصہ کرتے ہیں۔ اور اس وقت بظاہر اس پر زبردست ہیں۔ ایسے ہی ہمارے اوپر بھی ایک زبردست ہے۔ جس کی پناہ کی ہم کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد ایک مراقبہ کی تعلیم ہے۔ جس کے عمل کرنے سے غصہ وغیرہ کا دفع کرنا بہت سہل ہو جائے گا

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو خوب سنتے اور تمہارے اعمال و احوال

کہ خوب جانتے ہیں، اس لیئے جو بات کرو اور جو کام کرو سنبھل کر کرو غصہ میں جلدی سے کچھ کام نہ کرو، مبادا حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہو جائے تو گرفت ہو۔

سبحان اللہ! کیسا کامل و مکمل کلام ہے۔ جس میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہے حاصل بیان کا یہ ہے کہ استقامت کچھ دشوار چیز نہیں ہر مسلمان کو استقامت حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ حاصل ہے اور نفس استقامت پر جن فضائل کو متفرع کیا گیا ہے ہر مسلمان کو یہ فضائل نصیب ہوں گے۔ پھر جس قدر دعوت الی اللہ اور اعمال صالحہ اور انشراح باظہار العبدیت میں ترقی ہو گی۔ اسی قدر ان ثمرات میں ترقی ہو گی پھر ان ثمرات عالیہ کے لیئے ترقی کی طلب کیوں نہ ہو۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ خصوصاً جب کہ ترقی کے ذرائع بھی میسّر ہوں۔ ؎

هنوز آں ابر رحمت در فشاں است
خم و خم خانہ با مهر و نشاں است

اور اگر کسی کو نفس ایمان ہی حاصل ہو۔ وہ بھی مایوس نہ ہو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے جس سے یہ ثمرات اس کو بھی ضرور حاصل ہوں گے گو ادنیٰ ہی درجہ میں سہی پس نا امید تو نہ ہو۔ مگر ادنیٰ درجہ پر قناعت بھی نہ کرے۔ بلکہ ترقی کی کوشش کرے۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو استقامت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔